طالبان علوم نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں
(حصہ اول)
حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
سیّد احمد شہید اکیڈمی
www.abulhasanalinadwi.org
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طالبان علوم نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں

(حصہ اول)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کی گئی تقریروں کا مجموعہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مرتب

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

صفر المظفر ۱۴۳۴ھ - دسمبر ۲۰۱۲ء

کتاب	: طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں (حصہ اول)
مصنف	: حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
ترتیب	: عبدالہادی اعظمی ندوی
صفحات	: ۲۴۸
تعداد	: ایک ہزار (۱۰۰۰)
سیٹنگ	: سید محمد مکی حسنی ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیرآباد، لکھنؤ

☆ مکتبة الشباب العلمية الجديدة، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرس

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی

(۱۵-۱۷)

عزم صادق اور اخلاص ہر کامیابی کی کلید ہے

خود شناسی اور خدا طلبی

تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام

(۴۵-۴۲)

عزم اور اخلاص

عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ

کثرت مطالعہ کی ضرورت

(۷۹-۸۰)

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے........

مدارس کا اصل سرمایہ

ایک بڑی ضرورت

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دوستون

چار باتیں
(۱۲۴-۱۲۵)

زبان وادب خدمت دین کا مؤثر ذریعہ

زبان وادب سے علمائے دین کا رشتہ

علمی طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا کیجیے!
(۱۴۲-۱۴۵)

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ کا پیغام

زبان وادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت

حفاظتِ دین کے مراکز

چراغ سے چراغ جلتے ہیں

فضلائے ندوہ اور ان کی ذمہ داریاں

اپنے کو نیلامی کی منڈی میں نہ پیش کیجیے!

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

وقت کا جہاد

ناظم ندوۃ العلماء کا پیغام فارغین ندوہ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرس

علم کا بھی ایک قانون ہے

(۱۵-۲۲)

مدرسہ کی اصل ضرورت

(۲۳-۳۱)

علوم دینیہ کے طلبہ وفضلاء کی کامیابی کی تین لازوال شرطیں

(۳۲-۴۱)

ہلال سے بدر کامل

(۴۲-۵۲)

اصل مسئلہ ترجیح کا ہے

(۵۳-۶۰)

دور حاضر کے چیلنج کا مقابلہ

(۶۱-۶۴)

اختصاص کی ضرورت

(۶۵-۸۱)

علم دین کا حصول باعث عزت وسرفرازی ہے

(۸۲-۹۱)

علم کی اشاعت ایک دینی ذمہ داری

(۹۲-۹۵)

علوم دینیہ میں اخلاص واختصاص کی اہمیت

(۹۶-۱۰۶)

تصحیح نیت اور رسوخ فی العلم

(۱۰۹-۱۰۷)

آدمی کی اصل قدر و قیمت اس کا کمالِ فن ہے

(۱۱۸-۱۱۰)

چراغ زندگی اور دستور العمل

(۱۳۴-۱۱۹)

طالب علم - دو اہم ذمہ داریاں

(۱۳۵-۱۴۵)

آج آپ سید احمد شہیدؒ کی دعوت کے امین بنائے جا رہے ہیں

(۱۶۰-۱۴۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

تعلیم و تربیت کا جو کام مدارس اسلامیہ نے ہر دور میں کیا ہے، اس سے تاریخ پر نگاہ رکھنے والا ہر انسان واقف ہے۔ ان ہی مدارس نے امت کو وہ افراد فراہم کیے ہیں جنھوں نے مشکل سے مشکل ترین زمانہ میں بھی امت کی رہنمائی کا کام کیا اور کشتی کو بھنور سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان ہی مدارس نے امت کو مجدد دین و مصلحین بھی فراہم کیے، اور علمائے کبار بھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی مدارس سے بڑے بڑے مسلمان فلسفی، سائنس داں اور اطباء پیدا ہوئے، فکر اسلامی کے ماہرین اور معتدل مزاج اور فکر رکھنے والے علماء بھی ان ہی مدارس کے فیض یافتہ نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ کی بنیاد زمانۂ نبوت میں پڑی تھی، اور دربار نبوت سے ملے ہوئے اصولوں کی روشنی میں علم کا یہ سفر جو شروع کیا گیا تھا، ساتویں صدی ہجری میں وہ نقطۂ عروج پر پہنچا اور ساری دنیا میں اس کو روشنی پھیلی، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جس جمعیت خاطر اور فکرمندی و اتحاد کے ساتھ یہ عمل جاری تھا، وہ اس طرح جاری نہ رہ سکا اور مسلمان آہستہ آہستہ پیچھے ہوتے چلے گئے، بالآخر زندگی کا سرا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور مدارس میں جس زندگی اور روح کی ضرورت تھی، اس میں کمی ہوتی چلی گئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اجتماعی انحطاط کے باوجود اس پورے دور میں (جو کئی سو سال پر محیط ہے) ہمیں وہ بڑی بڑی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ کے کچھ افراد بچے کھچے رہ گئے تھے، جن کو اللہ نے بعد کی صدیوں کے لیے رکھا تھا، جنھوں نے علم و دین کے میدان میں زبردست تجدیدی کام انجام دیے، جن میں ہندوستان کے عظیم مجدد و مصلح حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مجاہد کبیر امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن عالمی سطح پر اگر دیکھا جائے تو پوری گہرائی کے ساتھ جو وسعت و کثرت ہمیں ابتدائی آٹھ صدیوں میں نظر آتی ہے وہ بعد

میں نظر نہیں آتی، اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا باہمی انتشار اور علم سے دوری ہے، جس کی بہت واضح مثال اندلس کی دی جاسکتی ہے جو ایک زمانہ میں علم کا مرکز تھا، لیکن آہستہ آہستہ وہاں کے حکمران آپس کے جھگڑوں میں ایسے الجھے کہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے، اور ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو زیر کرنے کے لیے عیسائیوں سے مدد لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کی، اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ ہوا، آج کا اسپین کوئی جاکر دیکھے تو وہ خاص یورپ کا ایک ایسا ملک ہے جہاں کوئی اسلامی شناخت نظر نہیں آتی، علمی مراکز اور بڑے بڑے ادارے اپنی تباہی پر نوحہ خواں نظر آتے ہیں۔

کئی سو سال کے علمی جمود کے بعد بیداری کا دور آیا، جس کو ''نہضۃ إسلامیۃ'' کہتے ہیں، علمی ادارے قائم ہوئے، مدارس دینیہ کی بنیاد ڈالی گئی، پھر خاص طور پر ہندوستان میں جہاں انگریزوں نے مسلمانوں کو نشانہ بنایا تھا، علماء کو جگہ جگہ تختۂ دار پر چڑھایا گیا تھا، مدارس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی، مدارس کا اپنی صحیح فکر کے ساتھ باقی رہنا مشکل ہو گیا تھا، علماء نے بڑی حکمت اور دور اندیشی سے کام کیا، لیکن جب ملک آزاد ہوا تو اس کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی گئی کہ مدارس میں پھر وہی روح اور تازگی اور زندگی پیدا کی جائے جو مدارس کا امتیاز رہا ہے، اور ان کو صرف علوم کے تحفظ کا ذریعہ نہ بنایا جائے، بلکہ ان سے تحفظ ملت کا کام لیا جائے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا بھی یہی بنیادی مقصد تھا: علماء کے اندر اتحاد پیدا کرنا اور ان کے اندر دین کی صحیح روح کے ساتھ زمانہ کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا، اور ایسے افراد تیار کرنا جن کی امت کو ضرورت ہے۔ ندوہ نے ایسے جامع افراد کی کھیپ تیار کر دی جنھوں نے دینی تصلب کے ساتھ حالات کو سمجھا، اور ان سے نبرد آزما ہونا نہ صرف یہ کہ سیکھا بلکہ امت کو سکھایا، ان میں دو نام بہت نمایاں ہوئے، ایک سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اور ایک مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا۔

حضرت مولاناؒ کو ندوہ کی خدمت کا طویل موقع حاصل ہوا، ان کے صرف دور نظامت کو دیکھا جائے تو وہ تقریباً چالیس سال کی مدت پر محیط ہے، یہ ندوہ کی تاریخ کا زریں دور ہے جس میں ندوہ کی شہرت پوری دنیا میں ہوئی، اور آج دنیا کے مختلف ملکوں میں ندوہ کے فضلاء علمی و دینی کام میں مشغول ہیں، اگر دیکھا جائے تو اس میں حضرت مولاناؒ کے دردِ دل اور فکر مندی کو خاص دخل ہے، حضرت مولاناؒ نے ہر لحاظ سے ندوہ کو مکمل دیکھنا چاہا، اور الحمد للہ اس

میں حضرت مولاناؒ کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی، وہ زبانِ ہوش مند، فکرِ ارجمند اور دلِ دردمند کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اس کے لیے جو ذرائع اختیار کیے، ان میں ایک ذریعہ اساتذہ وطلبہ میں مسلسل خطابات کا ہے، اور تقریروں میں حضرت مولاناؒ نے خاص طور پر طلبہ کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی زندگی کا سراغ دیا ہے، اس میں ان کا مقام بھی بتایا ہے، اور ذمہ داریاں بھی بتائی ہیں۔ حضرت مولاناؒ کی ان تقریروں کا پہلا مجموعہ جس میں ندوہ اور دوسرے اداروں کی تقریریں شامل ہیں ''پاجا سراغِ زندگی'' کے نام سے راقم کے والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ نے مرتب کیا تھا، اور اس پر زوردار مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا، اس مجموعہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور عام طور پر طلبہ کے لیے زادِ سفر ثابت ہوا۔

بڑی خوشی اور سعادت کی بات ہے کہ ''پاجا سراغ زندگی'' میں جو تقریریں آنے سے رہ گئی تھیں، یا اس کی اشاعت کے بعد کی گئی تھیں اور مختلف رسالوں میں منتشر تھیں، یا ابھی تک قلمبند بھی نہیں ہوسکی تھیں، وہ سب جمع کی گئیں، اور اب دو حصوں میں ان کو شائع کیا جارہا ہے۔ پہلا حصہ ندوہ میں کی گئی تقریروں پر مشتمل ہے، اور دوسرے حصہ میں وہ تقریریں جمع کی گئی ہیں جو دوسرے مدارس میں حضرت مولاناؒ نے کی ہیں۔ ''طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے یہ مجموعہ ہدیۂ ناظرین ہے، امید ہے کہ اس سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جائے گا جو ''پاجا سراغ زندگی'' سے اٹھایا گیا ہے۔

راقم عزیز گرامی مولوی عبد الہادی اعظمی ندوی سلمہٗ کا مشکور ہے جنھوں نے حضرت مولاناؒ کی تقریروں اور مضامین کو جمع کرنے کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے، اور اس سلسلہ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور متعدد کتابیں تیار ہیں، جو ان شاء اللہ جلد ہی شائع کی جائیں گی۔ عزیز موصوف ہر شائق علم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حضرت مولاناؒ کی ان چیزوں سے استفادہ آسان بنا دیا جہاں تک ہر خاص وعام کے لیے پہنچنا مشکل تھا۔

اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان تمام عزیزوں کو بھی اس اجر میں شریک فرمائے جنھوں نے کتاب کی اشاعت کے لیے محنت کی۔

بلال عبد الحی حسنی ندوی

مرکز الإمام أبي الحسن علي الندوي
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کو ایک دہائی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا، مگر ان کی تحریروں اور تقریروں میں جو زندگی اور روح ہے اس کو ہر پڑھنے والا محسوس کرتا ہے، اور ان کو پڑھ کر اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے، حضرت مولاناؒ نے امت کے ہر طبقہ کے اندر بیداری پیدا کی ہے، اور اس کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

مدارس اسلامیہ خاص طور پر حضرت مولاناؒ کے طائر فکر کا نشیمن رہے ہیں، مولاناؒ نے اپنی زندگی کے ہر دور میں ان کو ایک نیا خون دینے کی کوشش کی ہے، وہاں کے اساتذہ اور ذمہ داروں کو اس کے مقاصد کی طرف متوجہ کیا ہے، اور خود علماء کو ان کا مقام یاد دلایا ہے۔

مدارس کے طلبہ حضرت مولاناؒ کی امیدوں کا مرکز رہے ہیں، مولانا نے ان کو زندگی کا سراغ دیا ہے، اور اپنی حقیقت پہچنوانے کی کوشش کی ہے۔

مولانا نے اپنی تقریروں میں طلبہ کو اخلاص و اختصاص کی جگہ جگہ تلقین کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مخلص کا سفینہ کبھی نہیں ڈوبتا، ڈوبتے ڈوبتے بھی وہ پار لگ جاتا ہے، مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یہ دور خاص طور پر اختصاص (Specialization) کا ہے، اگر کوئی فن میں باکمال ہوتا ہے تو دنیا اس کے قدموں میں آتی ہے، وہ کہیں چھپ کر بھی اگر رہتا ہے تو لوگ اس کو تلاش کرتے، سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، مدارس میں کی گئی تقریروں کے یہ دو جلی عنوان ہیں۔

حضرت مولاناؒ کی ان ہی روح پرور تقریروں کا ایک مجموعہ ''پا جا سراغ زندگی'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، جس سے نہ جانے کتنے اللہ کے بندوں نے زندگی کا سراغ پایا ہے، اور کتنے ڈوبتے ہوؤں کو اس سے سہارا ملا ہے، اور اس کو پڑھ کر انہوں نے زندگی کا نیا

سفر شروع کیا ہے۔ یہ کتاب بھی ''پا جا سراغ زندگی'' کا امتداد ہے، اس میں بھی طلبۂ مدارس کے سامنے کیے گئے وہ خطابات ہیں جو دلوں پر مہمیز لگاتے ہیں، زندگی کا پتا دیتے ہیں اور نئے نئے افق روشن کرتے ہیں، طلبۂ مدارس کے لیے یقیناً یہ بہت بڑا تحفہ ہے، اور ہم عزیز گرامی مولوی عبدالہادی اعظمی ندوی سلمہ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انہوں نے یہ تحفہ تیار کیا، اور اس کے لیے محنت کی، اللہ تعالیٰ ان کے اس سلسلہ کو مبارک اور وسیع فرمائے۔

موجودہ کتاب میں وہ تقریریں ہیں جو حضرت مولاناؒ نے ندوہ کے علاوہ دوسرے مدارس میں کی ہیں، ندوۃ العلماء میں کی گئی تقریریں مستقل ایک جلد میں تیار کی گئی ہیں، یہ دونوں کتابیں ''طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے شائع کی جارہی ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں فائدہ اٹھانے کی توفیق ارزانی فرمائے، اور خدمت کرنے والوں کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مرکز الإمام أبي الحسن علي الندوي
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۴ھ

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

عزیزو! انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے حالات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہیں، آپ کے منصب اور آپ کی حیثیت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ آپ کو بار بار یہاں بلایا جائے، اور آپ سے گفتگو کی جائے، لیکن جس طرح پرندہ ساری دنیا سے اپنے آشیانہ کے لیے تنکے چن چن کے لاتا ہے، اور وہ اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کے نشیمن پر کوئی صیاد ڈاکہ ڈالے، اسی طرح ہم اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے کہ چمنِ دنیا کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے یہ پرندے ضرر رساں صفات اور عادتوں کو اختیار کریں اور اپنی رسوائی کے ساتھ ساتھ ''آشیانہ'' کو بھی نقصان پہنچائیں۔

حالانکہ آپ کے یہاں آنے پر کسی انتخابی توجہ کو دخل نہیں ہے، بلکہ اس پرآشوب زمانہ میں آپ کو علم نبوی حاصل کرنے یہاں آنا خود آپ کے منتخب ہونے کی دلیل ہے، یہ آپ کے والدین کی عظیم قربانی ہے کہ انھوں نے آپ کے مستقبل کی معاشی اعتبار سے پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کو دین سیکھنے کے لیے وقف کردیا، اگر ہمارے پاس ایک جم غفیر ہوتا تو ہم کو کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کتنے بھی ضائع ہوجاتے، لیکن ان حالات میں جب کہ انسانوں کے اس جنگل میں تم جیسے لوگ ملنا ایک بہت تلاش و کاوش کی بات ہو، تم ہمارے لیے گو ہر شب چراغ کی حیثیت رکھتے ہو، ہم اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتے کہ تم میں سے ایک بھی دانہ ضائع ہوجائے، ہم چاہتے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک اس زندگی کے میدان میں ایک مرد کامل کی حیثیت سے نکلے اور کارہائے نمایاں انجام دے، ایسی صورت میں جب تم ہمارے خیالات اور توقعات کے برعکس کوئی کام کرتے ہو تو ہم کو بعینہ ایسی ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے کہ

کوئی شخص نہایت محنت ومشقت اور مشکلات برداشت کرکے ایک محل بنائے اور کوئی ظالم اس کو ڈھانے کا ارادہ کرے یا ڈھادے، اس لیے ہم اس بات کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ تم ہماری امیدوں کے اس شیش محل کو ذرا بھی ضرر پہنچانے کا باعث بنو، نوجوانوں نے تاریخ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اور زمانے کی کس طرح قیادت ورہنمائی کی ہے، اس کا تم کو اچھی طرح علم ہے، تمہارے سامنے رافع بن خدیج، سمرۃ بن جندب، عمیر بن ابی وقاص، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، محمد فاتح وغیرہ کی اولوالعزمانہ زندگی موجود ہے، اور تم صرف ان کے حالات زندگی کے مطالعہ کرنے والے نہیں، بلکہ ان کی اس تاریخ ساز شجاعت، بہادری، مردانگی، حوصلہ مندی، جرأت گفتار وصلابت کردار کے وارث اور امین بھی ہو، یہ تمھارے آباءواجداد ہیں، تمھارا ان سے نسلی اور ملی رشتہ بھی ہے، اب اگر اولاد صالح اور نیک ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ان پرکھوں کے نام کو ان کی صفات حسنہ کو اپنے کردار میں جگہ دے کر بلند وبالا اور قائم ودائم رکھے، ورنہ ہم ان کے صحیح وارث کہلائے جانے کے حقدار نہیں ہو سکتے۔

عزیزو! قوموں کی صلاحیتوں اور ان کی عظمت کا دارومدار ان کی جسمانی وضع، فارغ البالی یا اور کسی مادی تفوق پر موقوف نہیں ہوا کرتا، بلکہ ان کے جذبات وخیالات اور ان کے بلند عزائم پر موقوف ہوا کرتا ہے، کسی بھی قوم کا نوجوان اپنے نئے اور بلند عزائم اور اپنے پاکیزہ جذبات سے قوم میں ایک نیا خون دوڑا دیا کرتا ہے، جب بھی کسی قوم پر کوئی پرآشوب وقت اور ناگہانی مصیبت آجایا کرتی ہے، اس وقت اس قوم کے نوجوان سنجیدہ ہو جایا کرتے ہیں، وہ اپنے عمل اور اپنے کردار سے قوم کی زندگی میں ایک نئی روح دوڑا دیا کرتے ہیں، آج ایسا ہی پرآشوب دور مسلم قوم پر آپڑا ہے، آج ساری قوم میں ایک مردنی اور یاسیت کی کیفیت چھائی ہوئی ہے، قوم اپنے نوجوانوں کی طرف حسرت اور امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے، آج تم کو چاہیے کہ اپنی قوم کی ان توقعات کو پورا کرو، اور اپنے عمل وکردار سے ثابت کردو کہ مسلم قوم کی کوکھ ابھی سوکھی نہیں ہے، اس مٹی میں نمی کی کسر ہے، اگر اس میں کردار کی حرارت اور اخلاق کی گرمی، قربانی وایثار کی نمی پیدا کردی جائے تو آج بھی یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔

نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اور جو صلاحیتیں اور چیزیں تمھارے بزرگوں میں نہیں ہیں، وہ اپنی محنتوں سے اپنے اندر پیدا کر کے اپنی قوم کی باگ دوڑ سنبھالیں، آج مسلم قوم جس نازک دور سے گزر رہی ہے، مسلمان نوجوانوں کو عموماً اور طالبانِ علومِ نبوت کو خصوصاً چاہیے کہ وہ اس کا احساس کریں۔

عزیزو! میں پھر کہتا ہوں کہ تم اپنی ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالو، اور دیکھو اور غور کرو کہ تم کون ہو، تم محمد بن قاسم کے وارث ہو، تم طارق بن زیاد کے وارث ہو، تمھاری رگوں میں دنیا کے فاتحین کا خون دوڑ رہا ہے، تمھارے تقدس کی فرشتے بھی قسم کھاتے تھے، میرے عزیزو! اپنے بزرگوں کی ثقافت اور ان کی شرافت کو دھبہ نہ لگاؤ، ان کی روحوں کو قبر میں شرمندہ نہ کرو، تمھاری اپنی روشن تاریخ ہے، تمھارا اپنا تابناک ماضی ہے، اور اب تم جس ادارہ میں آئے ہو، اس کی بھی کچھ روایات ہیں، تم اپنی خوش قسمتی سے اس کے بھی وارث بنائے گئے ہو، تم شبلیؒ کے خواب کی تعبیر ہو، تم محمد علی مونگیریؒ کی علمی خدمات کے امین ہو، تم سے کسی بھی قسم کی رکیک حرکت کی شکایت کرنا انتہائی شرم کی بات ہے۔

میرے عزیزو! دیکھو کہ زمانہ تم سے کیا چاہتا ہے، وہ کس قسم کی حرکات کا تم سے متوقع ہے، اگر تمھارے اوپر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ آج کل کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اور گتھیوں کو سلجھانے لیے کس قسم کی پاکیزہ انگلیوں کی ضرورت ہے، جن کے ذریعہ مسائل کی پیچیدہ گتھیوں کی گرہ کشائی کی جائے، تم یقیناً لہو ولعب سے ہی اجتناب نہیں کرو، بلکہ بزرگوں کی طرح دن رات فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہو، اور قوم کا غم تمھیں ایک پل بھی چین سے رہنے نہ دے، کاش کہ یہ غم اور بے چینی تمھاری زندگی کا حصہ بن سکے اور تم دنیا کی نجات کا ذریعہ بن سکو۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کچھ مخصوص حالات پیدا ہو جانے کے سبب منعقد ایک ہنگامی جلسہ میں طلبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا اشفاق مشہدی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ہفت روزہ ''ایاز'' بھوپال، (شمارہ ۱۶/ جون ۱۹۷۴ء)۔

"آج اپنے خیالی جزیروں میں پناہ لے کر یا ساحل کے خاموش تماشائی بن کر ہم علم وادب اور سیاست وقوت کی دنیا میں کوئی دیرپا نقش ہرگز قائم نہیں کر سکتے، اس کے لیے بڑی زندگی اور زندہ دلی، بڑے ایمان ویقین، بڑے اخلاق وکردار، بڑے علمی رسوخ اور امتیاز، اور بڑی کاوش اور ریاض کی ضرورت ہے، اور یہ مقدس فرض وہی خوش نصیب وباہمت نوجوان انجام دے سکتے ہیں، جن کے سینوں میں علوم نبوت کا نور، جن کے دلوں میں حالات کو بدلنے کا عزم وحوصلہ، جن کی رگوں میں زندگی کا اُبلتا ہوا نیا خون، جن کے قدموں میں فاتح کا اعتماد وسرخوشی، جن کی آنکھوں میں عزم ویقین کی روشنی، اور جن کی دمکتی ہوئی پیشانیوں پر ستارۂ اقبال وہوشمندی ہویدا ہو۔
آج کے بیمار اور مشکلات سے زارونزار عالم اسلام کو اسی قسم کے نوجوانوں کی ضرورت ہے، اور اگر مدارس کے خوش نصیب طلبہ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں اور خلوص، طلب صادق اور حوصلہ مندی کے ساتھ اپنے علمی سفر کا آغاز کریں، تو آج اس محدود ماحول، ناقص وسائل، کمزر صلاحیتوں اور قلت تعداد کے ساتھ ایسے محیر العقول واقعات، غیر معمولی نصرت اور حیرت انگیز تبدیلیاں وجود میں آسکتی ہیں، اور علم وعمل اور ترقی واقبال کی ایسی شاہراہیں ان پر کشادہ ہوسکتی ہیں، جن کا تصور بھی اُن کے لیے آج آسان نہیں۔"

مولانا محمد الحسنیؒ
(پیش لفظ "..... پا کا سراغ زندگی")

عزم صادق اور اخلاص ہر کامیابی کی کلید ہے

عزیز طلبہ! یہ آپ کا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اور ہر طرح مناسب ہے کہ سال کے شروع میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کی جائیں، اور قیام و تعلیم کے کچھ مشورے دیے جائیں، آپ کو زیادہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ جو اچھی سے اچھی باتیں ہو سکتی ہیں، اور زندگی کے سارے مطالعے اور تجربات کا نچوڑ ہو سکتا ہے، وہ آپ کے سامنے رکھا جائے گا، اس لیے کہ ہر وہ قیمتی سے قیمتی بات جو برسوں کے تجربہ کے بعد حاصل ہوتی ہے اور جو مدتوں سے سینے میں امانت ہے، اگر آپ سے اس وقت نہ کہہ دی جائے تو کس وقت اور کس موقع پر کہی جائے گی؟ میرے نزدیک آپ سے زیادہ اس کا کوئی حقدار نہیں ہے۔

یوں تو باتیں بہت کچھ کہنے کی ہیں، لیکن میں جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ مجھے ان عزیز طلبہ سے خطاب کرنا ہے جو بہت دور سے اپنے سینوں میں بہت سی امیدیں لے کر آئے ہیں، اور جن کے والدین نے بہت سی توقعات وابستہ کر کے ان کو بھیجا ہے، تو مجھے اچھی خاصی کشمکش پیش آتی ہے، کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، پھر بھی ہر چیز کی ایک خوراک ہے، اگر خوراک سے زیادہ دوا دی جائے تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوتا ہے، میرا تجربہ ہے کہ جب باتیں زیادہ ہوتی ہیں تو انسان کا ذہن ان کو برداشت نہیں کر پاتا، اور وہ اس کو بھول جاتا ہے، اس لیے اگرچہ میرے ذہن میں اس وقت بہت سی باتیں ہیں، لیکن میں ان میں سب سے اہم اور ضروری باتیں کہوں گا۔

سارا دارومدار آپ کی محنت اور طلب پر ہے

پہلی بات یہ ہے کہ عام طور سے جب کسی مدرسہ میں طلبہ کا استقبال کیا جاتا ہے تو ان

سے کہا جاتا ہے کہ اس مدرسے میں آپ کے مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کا سامان مہیا ہے، بہترین اساتذہ موجود ہیں، شفیق مربی ہیں، کھانے اور رہنے کا معقول انتظام ہے، اور سب سے بڑھ کر تعلیم کا ماحول ہے، لیکن میں آج آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ اس مدرسہ کی کیا خصوصیات ہیں، یہاں کیسے کیسے فاضل اساتذہ موجود ہیں، تعلیم و تربیت کا کیا سامان مہیا ہے، کتنا وسیع کتب خانہ ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان تمام باتوں کا یہاں معقول ترین انتظام ہے، میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں، لیکن میں جان بوجھ کر آپ سے یہ باتیں نہیں کہوں گا، اس لیے کہ اس سے وہ قوت ارادی ظاہر نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے، اس سے طالب علم کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں جس حالت میں بھی رہوں، ارادہ کروں یا نہ کروں، درس میں محنت کروں یا نہ کروں، منزل مقصود پر بہر حال پہنچ جاؤں گا۔

میں اس وقت اپنے لیے ایک نازک راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں، جو ممکن ہے میرے حق میں مضر ہو، لیکن میں بصراحت کہتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، وہ آپ کی محنت، جذبہ اور عزم سے ہوگا، اگر مجھے یہ اطمینان ہوتا کہ آپ کشمکش اور غلط فہمی میں نہیں پڑ جائیں گے، تو میں کہتا کہ یہاں آپ کو عالم فاضل بنانے کے لیے یا آپ کی امیدوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی سامان نہیں، لیکن اس پر زور دینے سے اندیشہ ہے کہ معلوم نہیں آپ کیا سمجھ بیٹھیں، آپ میں ہر قسم کے لڑکے ہیں، بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی ہیں، ذہنوں میں تفاوت ہے، پھر بھی بالکل صفائی سے کہوں گا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوگا، آپ کی محنت سے ہوگا، آپ کے جذبہ اور عمل سے ہوگا، اگر آپ کے اندر یہ جذبہ ہے کہ آپ یہاں سے عالم فاضل بن کر جائیں، علوم اسلامیہ کی خدمت کریں، دنیا کے گوشے گوشے میں دین کی اشاعت کریں، علوم اسلامیہ کے کسی شعبہ میں مہارت پیدا کرنا چاہیں تو یہ آپ ہی کی محنت سے ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہوسکتی، میرا تاریخی تجربہ ہے اور آپ بھی جب کبھی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوں گے تو آپ کو تاریخ میں کچھ شخصیتیں ابھری ہوئی نظر آئیں گی، تاریخ میں بھی اونچ نیچ ہے، جس طرح آپ کی زمین اونچی نیچی ہے، اسی طرح تاریخ بھی ہے، تاریخ میں

آپ کو کچھ شخصیتیں نظر آتی ہیں جو آپ کے سامنے مجسم بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد و قامت اور عظمت کے پیچھے ہماری پوری تاریخ چھپ گئی ہے، یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے اپنی محنت و طلب سے یہ کمال پیدا کیا اور جو کچھ بھی حاصل کیا اپنے عزم سے حاصل کیا، بے شک تاریخ میں ان کے اساتذہ کا بھی تذکرہ ملے گا، تاریخ یہ بھی بتائے گی کہ ان پر ان کے اساتذہ کا بڑا احسان ہے لیکن اگر آپ ان کی آواز سن سکیں اور ان کا جذبۂ احسان مندی و تشکر اس کی اجازت دے تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ عزیزو! اساتذہ کے فیض کا انکار نہیں ہے، لیکن ہمیں جو کچھ ملا ہے ہماری محنت سے اور ہمارے عزم سے ملا ہے، اور تمہارے لیے کار آمد بات یہی ہے، صحابہ کو چھوڑ کر، اس لیے کہ وہ حضور پر نور (ﷺ) کی کیمیا اثر صحبت کا ثمرہ تھے، تم جس فرد کو بھی دیکھو، تمہیں صاف نظر آئے گا کہ جو کچھ بھی کسی کو ملا ہے وہ اس کو اپنی محنت سے ملا ہے۔

عزیزو! تمہارے لیے لکھ لینے کی بات ہے، اگر اس پورے مجمع میں دو چار دس آدمی ایسے ہوتے جو تمہارے مستقبل کو دیکھ سکتے تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ تم میں جو بھی باکمال نکلیں گے، وہ وہی ہوں گے جنھوں نے آج ہی عزم کر لیا ہے کہ انھیں ساری مشکلات کے باوجود، ساری رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہوتے ہوئے، تمام مصائب و آلام کا سامنا کرتے ہوئے باکمال اور صاحب فیض بن کر نکلنا ہے۔

اللہ کا ایک قانون

اگر تمہارے اساتذہ، تمہارے والدین، تمہارا پورا ماحول، غرض کہ دار العلوم کا ذرہ ذرہ یہ طے کر لے کہ فلاں کو امام غزالی بنانا ہے، اول تو کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، اور نہ کوئی یہاں امام الحرمین جیسا ہے جس نے امام غزالی جیسا حجۃ الاسلام بنا دیا، لیکن اگر دار العلوم ندوۃ العلماء کے سارے ارکان انتظامی بھی یہ طے کر لیں کہ وہ اپنا سارا کاروبار چھوڑ کر، اپنی ساری مصروفیات کو پس پشت ڈال کر زید، عمر، بکر یا کسی بھی طالب علم کو امام غزالی بنا کر دم لیں گے، اور وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں چلے آئیں، اور اللہ کے فضل سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے،

ایسے بہت سے اللہ کے بندے موجود ہیں کہ اگر ان کے کان میں ادنیٰ سی بھنک بھی پڑ جائے کہ ان کے یہاں چلے آنے سے ان کا لڑکا اور ان کا چشم و چراغ صاحب فیض ہو جائے گا، تو وہ اس میں ادنیٰ تامل نہیں کریں گے، اور فوراً ساری مصروفیات کو خیر باد کہہ کر یہاں آ جائیں گے، اگر اس باغ کا پتہ پتہ اور زمین کا ذرہ ذرہ غرض کہ ساری خارجی اور داخلی طاقتیں مل کر ایک آدمی پر محنت کریں اور چاہیں کہ تم ایک صالح مخلص اور باعمل بن کر نکلو تو ایسا نہیں ہو سکتا، یہ اللہ کا قانون ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں کہ جس کو باکمال بننا ہے، اس کے اندر عزم کی صلاحیت بھی ہے، یہ فیض الٰہی ہی نہیں، عدل الٰہی کے عین مطابق ہے، اس نے والدین پر بوجھ نہیں ڈالا، اساتذہ پر ذمہ داری نہیں عائد کی، یہ قانون الٰہی نہیں کہ درخت کوئی لگائے اور پھل کوئی کھائے، جس کو پھل کھانا ہے، اسی کو درخت لگانا ہے اور اس کی آبیاری بھی کرنا ہے، اس لیے میرے عزیزو! یہ تمہاری بڑی ذمہ داری ہے، تمہارے والدین کی دعائیں بے شک مستجاب ہیں، تمہارے اساتذہ کی دعائیں اور دوائیں بے شک کارگر ہیں، کسی مدرسے کا حسن انتظام، کتب خانہ کی وسعت اور خارجی انتظامات ان سب کا اثر پڑتا ہے، لیکن یہ سب مل کر اگر چاہیں کہ کسی کو عالم بنا دیں تو نہیں کر سکتے۔

عزم وارادہ

اگر چہ اس وقت میں اس مدرسہ کی حق تلفی کر رہا ہوں، اور اس کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہوں، لیکن میں تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم یہ سمجھ کر آئے ہو کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ بہت باکمال ہیں، اس کی شہرت بہت زیادہ ہے، یہاں کی سندیں بڑی بڑی جامعات اور یونیورسٹیوں میں مقبول ہیں، یہاں کی تاریخ بہت روشن ہے، اگر تم نے اس میں سے کسی بات پر تکیہ کیا تو تم اسی وقت اس غلط فہمی کو دور کر لو، مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ تم میں سے دو چار دس لڑکے جو اس امید پر آئے تھے واپس چلے جائیں گے، میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ اگر تمہارا خیال ہے محض دروس میں شریک ہونے سے، یہاں رہنے سے، یہاں کی کتابوں کی ورق گردانی سے تم منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے، تو اس غلط فہمی کو اسی وقت دور کر لو۔

ہاں اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ اگر یہ سارا ماحول مل کر میری مخالفت کرے، میرے راستے میں روڑے اٹکائے، لیکن جب تک میری جان میں جان ہے، میں نے عزم کرلیا ہے کہ یہاں سے باکمال اور صاحب فیض بن کر نکلوں گا، میں وہ شخصیت بن کر نکلوں گا جو اس امت کو اس پُرفتن دور میں مطلوب ہے، یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید، اگر تم نے یہ عزم کرلیا ہے تو تمہارے لیے سب کچھ یہیں ہے، تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، شام ومصر کا نام کیا لوں، میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں، اور ہر وادی سے گزر چکا ہوں ؎

مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سرزمین تمہارے لیے متبرک ہے، یہ کنواں جو تم دیکھ رہے ہو، یہ زمزم کا کنواں ہے، یہ مسجد جس کے مینارے نظر آرہے ہیں، نعوذ باللہ بیت اللہ ہے، ایسا تو کوئی کافر ہی کہہ سکتا ہے، بلکہ یہ ایک عام شہر ہے جو معصیتوں اور آلائشوں سے پر ہے، فتنوں اور ظلمتوں سے پر ہے، لیکن میں ایک بار کہوں گا کہ تمہارا مکہ یہیں ہے، تمہارا مدینہ یہیں ہے، تمہیں مکہ تک پہنچانے والا راستہ یہیں سے ہو کر گزرا ہے، بلکہ تمہیں علم نبوی کے خزانے تک پہنچانے والا راستہ یہیں ہے۔

اگر تم نے ندوہ کو شیطان کے محل تک پہنچنے کا ایک پل نہیں سمجھا، اگر تم نے یہ نہیں سوچا ہے کہ محمد (ﷺ) کی زبان سیکھ کر، حضرت عمر وحضرت خالد (رضی اللہ عنہما) کی زبان سیکھ کر — جن کی ایک لغزش مستانہ نے ساری دنیا کو ہلا دیا - دنیا کے ٹھیکروں کے حصول کا ایک ذریعہ بناؤ، اگر تم بت خانہ کے آزر نہیں بننا چاہتے تو میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کو ابراہیم تک پہنچانے والا راستہ یہی ہے، یہاں سے تم سیدھے بیت اللہ تک جاسکتے ہو، تمہاری عظمت کا خزانہ یہیں ہے، اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ تمہیں یہ خزانہ تلاش کرنا ہے، اپنا خون پسینہ بہا کر اپنے سینہ پر تیشہ چلا کر، تو تمہیں اپنی روزی یہیں ملے گی۔

میرے عزیزو! اسی زمین کے اندر تمہاری قسمت کا خزانہ دفن ہے، اگر تم نکالنا چاہتے ہو تو یہیں سے نکال سکتے ہو، اگر تمہیں نہیں نکالنا ہے تو حرم کی متبرک زمین بھی تمہیں نکال کر نہیں

دے گی، اگر تم غزالی ورازی بننا چاہتے ہو، بات تو بہت بڑی ہے، چھوٹا منھ بڑی بات، لیکن اگر تم نے عزم کرلیا ہے کہ تمہیں غزالی ورازی بننا ہے تو تم یہیں بن سکتے ہو۔

افسوس ہے کہ آج ہمارے مدرسوں میں تو بے دین پیدا ہورہے ہیں، تارک الصلاۃ پیدا ہورہے ہیں، اور یونیورسٹیوں میں، لندن وفرانس کے کالجوں میں، یاجوجیت و ماجوجیت کی آغوش میں، بتکدۂ آزری میں ابراہیم پیدا ہورہے ہیں، جس طرح آزر کی گود میں ابراہیم پیدا ہوئے، اسی طرح آج یورپ کے بتکدے میں ابراہیم کی دعوت کے حاملین پیدا ہورہے ہیں۔

میرے عزیزو! تاریخ میں جتنی بھی عظیم شخصیتیں نظر آرہی ہیں، ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کا بھی تذکرہ ہے اور ہونا بھی چاہیے، دنیا اتنی احسان فراموش نہیں ہے اور مستقبل کا مورخ بھی جب تمہاری سوانح لکھے گا تو وہ تمہارے اساتذہ کا تذکرہ ضرور کرے گا، لیکن یہ یاد رکھو کہ بغیر تمہارے عزم کے اور بلا تمہاری محنت کے کچھ بھی نہیں ہوسکتا، میں دس سال تک ندوہ میں درس دے چکا ہوں، اور پندرہ سال سے معتمدی و نظامت کے کاموں سے متعلق رہا ہوں، میری اس پچیس سالہ تدریسی و تنظیمی زندگی کا تجربہ ہے، اساتذہ کو جتنا تجربہ ہوتا ہے وہ کسی بھی بڑے سے بڑے ماہر نفسیات کو نہیں ہوسکتا، مجھے معلوم ہے کہ کتنے ہی بچے آتے ہیں ان کے ساتھ ان کے سرپرست آتے ہیں، اس طرح سفارش کرتے ہیں کہ دل بھر آتا ہے، اور ان کو داخل کرنے کے بعد بھی طرح طرح سے ہدایا بھیج کر خطوط کے ذریعہ توجہ دلاتے رہتے ہیں، لیکن وہ بچے بالکل ناکارہ ہوتے ہیں، اس کے برعکس بہت سے بچے ایسے آتے ہیں جو بالکل گمنام ہوتے ہیں، لاوارث ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ان کا کوئی سرپرست بھی نہیں آتا، ادھر ادھر سے پوچھ کر داخلہ لے لیتے ہیں، لیکن وہ باکمال ہوکر جاتے ہیں، اور جب کوئی امتیاز پیدا کرتے ہیں، تب میں ان سے واقف ہوتا ہوں، اساتذہ چاہیں، والدین چاہیں، لیکن بچہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، اور اگر کوئی نہ چاہے لیکن بچہ چاہے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

میرے عزیزو! اگر کوئی لاکھ چاہے کہ میرا بیٹا ایسا ہوجائے اور بیٹے نے نہیں چاہا تو ایسا

نہیں ہوسکتا، کتنے ہی علم دوست بلکہ عالم بادشاہ گزرے ہیں، کیا انھوں نے نہیں چاہا ہوگا کہ میرا بیٹا بھی عالم ہوجائے؟ دور مت جائیے، اورنگ زیب ہی کو دیکھ لیجیے، اشوک واکبر کے بعد کوئی بھی بادشاہ اتنے بڑے تخت کا مالک نہ رہا ہوگا، اور اتنا بڑا اعلم دوست اور ذی علم بادشاہ کم از کم دہلی کے تخت پر نہ بیٹھا ہوگا، اس نے ملک کے بڑے بڑے علماء کو جمع کرکے فتاوی ہندیہ (جس کو فتاوی عالمگیری بھی کہتے ہیں) مرتب کرادیا، کیا وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا یا نہ کیا ہوگا کہ ان میں چند علماء کو منتخب کرکے اپنے لڑکے اعظم شاہ یا معظم شاہ کی تعلیم پر مقرر کردے، لیکن ان کی اولاد میں کوئی بھی عالم نہ ہوا، کتنے ہی ایسے علماء گزرے ہیں جو عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عالم گر اور عالم ساز تھے، لیکن ان کی اولاد عالم نہ ہوسکی، کیا انھوں نے نہ چاہا ہوگا کہ ان کا بیٹا بھی عالم ہوجائے، اور سب سے آخر میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی مثال لے لیجیے، جس کے بعد اور کوئی مثال نہیں ہوسکتی، وہ اپنے بیٹے کو نہ شریک حیات کرسکے اور نہ شریک آخرت۔

میرے عزیزو! تم یہ بات لکھ لو کہ اگر تم نے ارادہ کرلیا ہے کہ یہاں سے استعداد پیدا کرکے نکلنا ہے تو تم انشاء اللہ کامیاب ہوگے، میں دیکھ رہا ہوں، تم میں کچھ ایسے طلبہ ہیں جو اس پرآشوب اور معصیت افزوں دور میں صاحب کمال بن کر نکلیں گے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت عربی زبان و ادب کا جو نصاب موجود ہے، اس سے بہتر نصاب کبھی ہندوستان میں نہیں تھا، یہ میرے گھر کا موضوع ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں، خود دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان وادب کا اس سے بہتر نصاب نہیں ہوسکا، جیسا کہ اس وقت ہے، نہ عربی زبان وادب کے استعمال کرنے والے ایسے تھے جیسے اس زمانہ میں ہیں، جب میں آج سے بیس پچیس سال پہلے خود ندوہ کا نصاب دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عربی زبان سے واقف کرانے کے لیے اس نصاب کو کیسے رکھا گیا، لیکن اس نصاب کو پڑھ کر سید سلیمان ندوی نکلے جو علم میں اپنے اکثر اساتذہ سے کہیں آگے تھے، اسی نصاب کو پڑھ کر مولانا مسعود عالم ندوی نکلے جن کو خط لکھتے ہوئے ایک بہت بڑے مستشرق نے لکھا کہ میں آپ کو علامہ لکھ رہا ہوں اگرچہ آپ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں، لیکن آپ کا علم مجھے

علامہ لکھنے پر مجبور کررہا ہے، اسی نصاب کو پڑھ کر مولانا محمد ناظم ندوی نکلے جن کا آج پورے پاکستان میں جواب نہیں، یہ وہ علماء ہیں جن کا عالم عربی کے ادباء لوہا مان گئے، حالانکہ اس وقت عربی کا ناقص نصاب تھا، لکھنے پڑھنے کے ایسے وسائل مہیا نہیں تھے، نہ کسی عرب سے ملاقات کی نوبت آتی تھی، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولوی گنج میں ایک عرب آئے تھے تو ہم لوگ شدرحال کر کے ان سے ملاقات کرنے گئے تھے، لیکن آج تم گھر بیٹھے ریڈیو سن سکتے ہو، اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین پڑھ سکتے ہو، وقتاً فوقتاً عرب وفود سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے، پھر کیا بات ہے کہ تم میں کوئی مسعود عالم ندوی جیسا اہل قلم پیدا نہیں ہوتا؟ اس کا صرف ایک جواب ہے، وہ یہ کہ ان کو ایک جنون تھا کہ عربی کے اعلیٰ سے اعلیٰ صحافی بنیں، ان کو عربی لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے، لیکن آج اتنی آسانیاں ہیں اس کے باوجود تمہاری انشاء کی کاپیاں یا مقالے دیکھتا ہوں تو ڈرنے لگتا ہوں کہ میں خدا کو کیا جواب دوں گا؟ وجہ یہی ہے کہ وہاں عزم تھا یہاں عزم نہیں ہے، وہاں ارادہ تھا یہاں ارادہ نہیں ہے۔

صاحب فیض کی صحبت کی ضرورت

میرے عزیزو! دوسری بات یہ ہے کہ علماء اسلام نے بلاشبہ اپنی تصنیفات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، وہ آسمان سے تارے توڑ کر لائے ہیں، اور ان کو کتابوں میں بند کر دیا ہے، اسلام کو یہ فخر ہے کہ اس امت میں ایسے لاتعداد علماء و مصنفین پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے سمندروں کو کوزے میں بند کر دیا ہے، مصنفین اسلام کی یہ ساری تحقیق و جستجو تسلیم، مگر قرآن و حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے میں اعلان کرتا ہوں کہ انسان کے سینے میں جو علوم وفنون موجود ہیں، ان کا ہزارواں حصہ بھی کتابوں میں نہیں آسکا ہے، میری یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ نے انسان کے ذہن، قلب اور دماغ میں جو کمالات ودیعت کیے ہیں، یہ سارے علوم وفنون ان کی ایک فیصدی بھی نمائندگی نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جو کچھ ملا ہے وہ انسانوں سے ملا ہے، ہم نے اپنے سارے تجربات کا نچوڑ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور برابر تمہارے نصاب میں

ضرورت کے مطابق ترمیم کرتے رہتے ہیں، اور ہمیں یہ اعتماد ہے کہ اس زمانہ میں بہتر سے بہتر جو نصاب ہوسکتا ہے وہ موجود ہے، لیکن سمجھ لو کہ تم کو جو کچھ انسان سے مل سکتا ہے وہ کتابوں سے نہیں، ایک صاحب فیض کی صحبت، صرف تھوڑی دیر کی صحبت وہ فیض پیدا کر سکتی ہے جو ان سارے کتب خانوں میں نہیں ہے، یہ تسلیم ہے کہ تم اپنے اپنے دماغوں میں علوم و فنون کا خزانہ جمع کرلو، لیکن یہ خزانہ کبھی الحاد و زندقہ کا سبب بھی بن سکتا ہے، اگر اس کے مصرف کو سمجھنا ہے تو یہ کسی انسان کی صحبت سے حاصل ہوگا، ہر چیز کو فائدہ مند بنانے والا اکسیر ذوق ہے، تم بہتر سے بہتر کتابیں پڑھ سکتے ہو لیکن اس کا کیا علاج کہ تم پڑھتے ہو مگر تم میں کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ تمھارے اندر وہ ذوق نہیں ہے، تم تاریخ میں نشیب و فراز دیکھتے ہو، کوئی امام غزالی ہے اور کسی کا ہم نام بھی نہیں جانتے، کوئی ابن تیمیہ ہے، اور ان کے زمانے میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو علم و فضل میں ان سے بڑے تھے، لیکن ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، فرق معلومات کا نہیں ہے، نگاہ اور ذوق کا فرق ہے، وہی کتاب الٰہی (اور کسی کتاب کا نام کیا لوں) شیخ عبدالقادر جیلانی نے پڑھی اور وہی ان کے معاصروں نے، لیکن ان کی عظمت کا راز معلومات نہیں ہیں، وہ فرق فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کا ہے، اور اثر و تاثر کا ہے جو ان کے اندر کتاب اللہ پڑھنے سے ہوتا ہے۔

میرے عزیزو! میں مانتا ہوں کہ تم نے بہت کچھ پڑھ لیا، تم نے تفسیر میں، فقہ میں یا حدیث میں مہارت حاصل کر لی، تقریر بھی سیکھ لی، تحریر کی بھی صلاحیت آ گئی، لیکن وہ ذوق کہاں سے لاؤ گے جو قلب میں تاثر پیدا کر دے اور تم کو تڑپا دے ؎

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اصل چیز یہ ذوق ہے جس سے تم اچھے برے کو سمجھنے لگو، اور تم میں وہ اخلاص پیدا ہو جائے کہ تم ہر چیز کو اپنے مقصد کے تابع کر لو، اور یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے، تم سمجھتے ہو کہ چند کتابوں کے پڑھنے سے یا درس میں شریک ہونے سے تم باکمال بن جاؤ گے، ایسا

ہرگز نہیں، تم کو ایسے لوگوں کی صحبت کی ضرورت ہے جن کی ایک نظر سے تم بہت سی ایسی چیزوں سے واقف ہو جاؤ جو محض تجربہ کا نتیجہ ہیں، تم اپنے اساتذہ کی صحبت کو غنیمت جانو، اور اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

ناشائستہ کاموں سے اجتناب

تیسری بات یہ ہے کہ اس موقع پر مجھ سے یہ توقع کی جاتی ہے اور بجا بھی ہے کہ میں تم سے کہوں کہ تم ایک دینی درسگاہ کے طالب علم ہو، تم میں فلاں فلاں کمزوریاں نہیں ہونی چاہئیں، تم اس درسگاہ کے طالب علم ہو جس سے سید سلیمان ندوی نکلے، مولانا عبد الباری ندوی نکلے، کیا تم سے ایسی امید کی جاسکتی ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت کروگے جو تمہارے مقصد کے خلاف ہے؟ اگرچہ تجربے نے مجبور کردیا ہے کہ تم کو ان باتوں سے منع کیا جائے، لیکن پھر بھی میں گوارا نہیں کرسکتا کہ تم سے ایسی بات کہوں، اور اگر میں یہ کہوں تو تم کو احتجاج کرنا چاہیے کہ حضرت ہم ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ ہم کو ان باتوں سے منع کیا جائے، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے شہزادہ کو سمجھائے جس کے خاندان میں پشتہا پشت سے سلطنت چلی آرہی ہو، اور اس سے کہے: میاں! دیکھو کہیں سڑک پر گری پڑی چیزیں نہ اٹھا کے کھانا، کبھی گری پڑی ہڈیوں کو نہ چبانا، کسی بھنگی کے دسترخوان پر کھانا نہ کھانا، تو اس کا انجام کیا ہوگا کہ وہ مار کر دربار سے نکال دیا جائے گا، تمہاری شان اس سے بھی بلند ہے، تمہارا تعلق سرچشمۂ نبوت سے ہے، تم نبوت کے دسترخوان کے مہمان ہو، جب اس شخص سے اس قسم کی باتیں نہیں کہی جاسکتیں تو پھر تم لوگوں سے کیسے کہی جائیں؟

میں اپنی گفتگو ختم کررہا ہوں اور آخر میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ کا مکہ یہیں ہے، آپ کا مدینہ یہیں ہے، آپ کو عزم کی ضرورت ہے، میں نے شام ومصر بھی دیکھا ہے، جامعہ ازہر اور جامعہ دمشق کو بھی دیکھا ہے، اور میں بہت سی جگہوں کا مشیر بھی ہوں، بہت سی جگہوں کی عاملہ میں ہوں، میں تم کو مدینہ جانے سے نہیں روکتا، اتنا ضرور کہتا ہوں کہ تم پہلے اپنے اندر مدینہ جانے کی صلاحیت پیدا کرلو، تم وقت سے پہلے نہ پکو، پہلے اپنے اساتذہ کی سند

حاصل کرو، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرو، اور ہم کو مجبور کردو کہ ہم لوگ تم سے خود کہنے لگیں کہ اب تم مدینہ جا سکتے ہو، کسی ایک نحوی نے دوسرے نحوی پر اعتراض کیا تو اس نے جواب دیا: قد زبيت قبل أن تحصرم، تم گدر ہونے سے پہلے پک گئے، کہیں تم بھی ایسے ہی نہ ہو جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں جانے پر یہ صدا آئے۔

به طواف کعبه رفتم بحرم رہم نہ داند
تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

میرے عزیزو! تمہاری عظمتوں کا خزانہ یہیں دفن ہے، تم اس کو یہیں رہ کر برآمد کر سکتے ہو، اور اس کو اپنے لیے، سارے ملک کے لیے، عالم اسلام کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے مفید بنا سکتے ہو۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر افتتاحی جلسہ میں سلیمانیہ ہال میں ٦/ مارچ ۱۹٦۵ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد العلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، اور مولانا معین الدین احمد ندوی مرحوم نے اس کو مرتب کیا، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ مارچ ۱۹٦۵ء)۔

خودشناسی اور خداطلبی

بہت بڑی سعادت

بھائیواورعزیزو! آپ لوگوں نے جن الفاظ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اس کے ہم بہت شکر گزار ہیں، درحقیقت یہ اتنی بڑی دولت ہے جس پر ایک دوست دوسرے دوست کو اور ایک عزیز دوسرے عزیز کو مبارک باد دے سکتا ہے، آپ کے سامنے ہمارے سفر کا تذکرہ کیا گیا، اس موقع پر اگر آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ ہم اپنے سفر کے حالات سنائیں گے تو یہ بالکل حق بجانب اور قدرتی بات ہوگی، جب کوئی شخص کہیں جاتا ہے اور خاص طور پر ایسے مبارک سفر پر تو وہاں سے اپنے بھائیوں عزیزوں کے لیے تبرک اور سوغات لاتا ہے، اور خاص طور پر حج سے آنے والوں کا تو قدیم رواج ہے کہ وہاں سے تبرکات لاتے ہیں، مثلاً زمزم، کھجور، تسبیح یا مصلے وغیرہ، ہم کو افسوس ہے کہ ہم اپنے عزیزوں کو یہ تبرکات پیش نہیں کر سکے، اس لیے کہ یہ ہمارا سفر اس نوعیت کا نہیں تھا۔

اب اگر آپ کو یہ خواہش ہے کہ کوئی سوغات نہ سہی کم از کم وہاں کے حالات وواقعات ہی سنائے جائیں تو آپ اس میں بالکل حق بجانب ہوں گے، لیکن میں اس وقت آپ کے سامنے اپنے یا اپنے ساتھیوں کے حالات سفر نہیں بیان کروں گا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ ہم لوگوں نے وہاں کیا کیا؟ اول تو ہم نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، وہاں لاکھوں اللہ کے بندے حج کو جاتے ہیں اور ان میں کیسے کیسے اولیاء اور کیسے کیسے خدا رسیدہ بزرگ ہوتے ہیں، ان خدا والوں کے سامنے ہماری کیا حیثیت، لیکن اگر ہم نے وہاں کچھ کیا تو یہ ہمارا فرض تھا، اگر ہم نے وہاں کچھ کہا تو ہم نے اسی دن کے لیے عربی پڑھی تھی اور اسی کے لیے ایک عمر عربی سیکھنے

میں صرف کی تھی، انسان کی اس سے بڑھ کر اور کیا معراج ہوسکتی ہے کہ وہ عربی سیکھے اور پھر اسی کے ذریعے دینی علوم وفنون میں مہارت حاصل کرے، اور پھر جو دولت ان سے حاصل کی ہو بڑی نیازمندی سے سر جھکا کر ان کو پیش کرے اور یہ دولت نہایت ہی تشکر وامتنان کے ساتھ ان کے قدموں پر ڈال دے اور یہ کہے: "هَذِهِ بِضَاعَتُكُمْ رُدَّتْ إِلَيْكُمْ"، اگر ہم نے کچھ کیا تو یہ ہماری انسانیت کا تقاضا تھا، ہماری شرافت کا تقاضا تھا اور اس خدا کی رحمت کا تقاضا تھا جس نے ہم کو اس لائق کیا۔ اگر ہم رونگٹے رونگٹے سے، عضو عضو سے وہاں خدا کی حمد بیان کریں، اس کے اور اس کے رسول کے احسانات کا اعتراف کریں، اور ہر ہر رونگٹے میں سوسو زبانیں ہوجائیں اور سب بولنا شروع کردیں، اور وہ زبانیں بھی سحبان وائل کی طرح ہوں، اور دن رات شکر خداوندی کے ترانے گائیں، تب بھی ہم اس بارگاہ کا شکر نہیں ادا کرسکتے، لیکن پھر بھی یہ بہت بڑی سعادت ہے، اور ایک دینی طالب علم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فخر ومباہات کی بات نہیں ہوسکتی۔

آپ کے لیے سب سے بڑی سوغات

ہم نے عرب میں جو کچھ بھی دیکھا اور سنا ہو، اور جو کچھ بھی احساسات ہمارے دل میں پیدا ہوئے ہوں، لیکن آپ کے لیے یہی سب سے بڑی سوغات ہے کہ آپ اپنی عربیت کو ترقی دیں اور آپ نے جو دولت پائی ہے اور "لا إلــــه" کے جو دو لفظ سیکھے ہیں، یہ لفظ کوئی معمولی لفظ نہیں، جس لفظ نے دنیا میں عظیم ترین انقلاب پیدا کیا اور جس سے بڑھ کر باوقار اور جس سے زیادہ انقلاب انگیز لفظ دنیا کی کسی زبان اور کسی لغت میں نہیں، آپ اپنے اندر اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

میرے عزیزو! اگر ان مضمرات پر نظر ڈالی جائے جو تمہارے اندر خوابیدہ ہیں، ان طاقتوں اور عظیم صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جائے جو تمہارے اندر ودیعت ہیں، اور جن کے تم امین ہو، اور اگر کوئی تمہاری ان پوشیدہ صلاحیتوں پر نظر ڈالے تو تمہارے لیے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ تم اپنے کو پہچانو، اس لعل بے بہا کی قدر کرو جو تمہارے سینے میں چمک رہا ہے، تم

اپنے کو دیکھو، تم میں سے ہر ایک مستقبل میں ایک بڑا عالم، محدث، فقیہ اور مفسر بننے والا ہے، تم اس امانت کی قدر کرو اور پہچانو جو تمہارے اندر ودیعت کی گئی ہے۔

ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی ہے کہ اس نے موجود کو دیکھا غیر موجود کو نہیں دیکھا، یافت کو دیکھا نایافت کو نہیں دیکھا، موجودات کو دیکھا ممکنات کو نہیں دیکھا، انبیاء نے انسان کو ہمیشہ یہی سبق دیا کہ وہ اپنے کو پہچانے، انھوں نے ہمیشہ ممکنات کی طرف ہدایت کی، انھوں نے ہمیشہ اس عالم سے ماوراء کی طرف رہنمائی کی، انبیاء کے علاوہ کسی نے یہ سبق نہیں دیا کہ اس کے اندر کون سی طاقتیں خوابیدہ ہیں؟ وہ کہاں کہاں پہنچ سکتا ہے؟ وہ کہاں کہاں اپنی کمندیں ڈال سکتا ہے؟ وہ کیا کیا آفاق ہیں، علم کے آفاق، محبت کے آفاق، تسخیر کے آفاق ہیں جہاں انسان پہنچ سکتا ہے؟ انسان کی بہت بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ ہمیشہ بتانے والوں نے موجودات کا درس دیا، اسے یہ بتایا کہ وہ کیا ہے، یہ نہیں بتایا کہ کیا ہوسکتا ہے اور کن کن آفاق کی تسخیر کرسکتا ہے؟ یہ ان کی سب سے بڑی خیانت اور کوتاہ نظری تھی، بلکہ اس سے بڑھ کر ایک مجرمانہ سازش تھی کہ انھوں نے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کو چھپانے کے لیے ہمیشہ یہ دکھایا کہ انسان نے کیا کیا پایا اور کہاں کہاں پہنچا، اور کبھی یہ نہیں بتایا بلکہ اگر کسی نے بتانے کی کوشش کی تو انھوں نے اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی کہ وہ کیا کیا پاسکتا ہے، انھوں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ انسان موجودات کی طرف دیکھے، اس کے اندر تخیل کا جذبہ نہ پیدا ہونے پائے، انھوں نے ہمیشہ تخیل کا گلا گھوٹنے کی کوشش کی تاکہ ان کی بے بضاعتی کا راز نہ کھلنے پائے۔

تم کیا کیا بن سکتے ہو؟

میرے عزیزو! تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم ہمیشہ یہ دیکھتے ہو کہ لوگ کیا کیا بن گئے اور کہاں کہاں تک پہنچ گئے، تم نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ ہم کیا کیا بن سکتے ہیں اور کہاں کہاں تک پہنچ سکتے ہیں، اور پھر اس میں تمہاری پرواز بھی کوئی بہت اونچی نہیں، کبھی تو تم اپنی برادری اور حلقہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے، اور کبھی وطن اور معاشرے سے باہر نہیں جاسکتے، تمہارے سامنے ایسی بہت مثالیں ہیں، تم دیکھتے ہو کہ جنھوں نے دین سیکھا اور عربی پڑھی انھوں نے یہ یہ پایا، ان

ان بلند مدارج پر پہنچ گئے، لیکن تم یہ نہیں دیکھتے کہ تم کہاں تک پہنچ سکتے ہو، جنھوں نے اپنے تخیل اور تمناؤں کو زمانے کی کامیابیوں اور پروازوں کے تابع نہیں کیا، وہ کہاں کہاں تک پہنچ گئے، میری سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ تم سمجھو کہ تم کیا بن سکتے ہو؟ اگر کوئی تم سے یہ کہے یا صرف کہتا ہوا گزر جائے اور اس کی معمولی سے بھنک تمہارے کان میں پڑ جائے اور اس پر بھی تم کو شبہ ہو کہ واقعی کسی نے کہا ہے یا نہیں، کہ فلاں جگہ فلاں درخت کے نیچے یا فلاں کمرے میں ایک دفینہ ہے، تم اس کو کس کس طرح تلاش کرو گے اور کس کس طرح راتوں کو چپکے چپکے کھودو گے کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے۔

لیکن اگر تم سے کوئی کہتا ہے اور وہ بھی کہنے والا کون؟ خدا کا پیغمبر اور مخبر صادق، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ جس نے خود انسانوں کو پیدا کیا ﴿أَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ﴾ [(۱)] اور وہ کہے جو تمہارے رگ و پے سے واقف ہے کہ تمہارے سینوں میں ایک ایسا دفینہ ہے کہ جیسا کسی نے آج تک دفن نہیں کیا اور نہ نکالا، تو پھر تمہارے اندر ایک جذبہ کیوں نہیں اٹھتا اور ایک شرارہ کیوں نہیں پھڑک اٹھتا کہ تم اس کو نکالنے کی کوشش کرو، تمہارے اندر اللہ نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں اور جس طرح تم انسانوں اور دنیا کے اندر محبت و معرفت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتے ہو، تم ساری دنیا کو اپنا گرویدہ اور عاشق بنا سکتے ہو، اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس دفینہ کو نکالنے کے لیے بیتاب اور بے قرار ہو جاؤ، تمہارے اندر کیسے کیسے معلم ہیں، کیسے کیسے مبلغ ہیں، کیسے کیسے ہادی چھپے ہوئے ہیں، تمہارے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں، تو تمہارے اندر کیوں نہیں ایسا جذبہ پیدا ہوتا کہ تم اس کو بروئے کار لاؤ، تم جب یہاں آئے تو ایک ان گڑھ پتھر تھے، لیکن خدا نے تم پر احسان کیا اور تم عالم ہو گئے، لیکن تم کو یہ نہیں معلوم ہے کہ تم کیا ہو؟ تم یہ نہیں سوچتے کہ تم کیا کیا بن سکتے ہو؟ اور اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے، اس میں بھی خدا کی مصلحت ہے کہ معلوم نہیں ہوتا، اور تم اس سے واقف ہو جاؤ کہ دنیا کو تمہاری کس قدر ضرورت ہے، اور دنیا کس قدر تمہاری منتظر ہے، اور تم کیا کارنامے انجام دے سکتے ہو، تو سچی بات یہ ہے کہ تم اس کو برداشت بھی نہیں کر سکتے۔

---

(۱) سورۃ الملک: ۱٤

وہ تریاق جس سے سارے وسائل تمہارے تابع ہو جائیں

میرے عزیزو! تم ایک مدرسے کے طالب علم ہو، تم میں امیر بھی ہوں گے، غریب بھی ہوں گے، اور متوسط بھی ہوں گے، تمہاری استعداد بھی متوسط ہے، اس حیثیت سے تم کوئی خاص قابل قدر نہیں، یہ دنیا یہی سمجھتی ہے کہ تم پڑھ لکھ کر زیادہ سے زیادہ چند آدمیوں کی ہدایت کر سکتے ہو یا اپنے لیے کوئی بہتر راستہ اختیار کر سکتے ہو، اور اس سے کمتر یہ ہے کہ اپنا معاشی مسئلہ حل کر سکتے ہو، یہ تو ہے تمہاری کل کائنات، لیکن یہ کہ کس طرح ہم پیغمبروں کی نیابت کر سکتے ہیں اور دنیا کے درد کی دوا بن سکتے ہیں، یہ کوئی نہیں سوچتا، یہ سب اس لیے ہے کہ ہماری نظر اس سے ہٹ گئی کہ اس سے کیا پا سکتے ہیں، اب تمہارا نصب العین محض یہ رہ گیا ہے کہ یہاں سے نکل کر کسی کالج میں داخلہ لے لیں گے یا کسی یونیورسٹی کا امتحان دے دیں گے، لیکن وہ تریاق جس سے سارے وسائل تمہارے تابع ہو جائیں گے اور یہ ساری یونیورسٹیاں اور ان کے چلانے والے تمہارے تابع ہو جائیں، اس تریاق کی طرف تمہیں کوئی توجہ نہیں، اسلام کی آمد کے بعد سے اور صحابہ کرام کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایسا دور نہیں آیا کہ جس میں ایسے نمونے نہ ہوں جن کے لیے اللہ نے دنیا کو مسخر کر دیا، اور اگر کوئی ایسا دور ہو سکتا تھا جس سے ناامیدی کی جا سکتی ہے تو وہ یہ دور ہے جہاں صرف مادیت ہی مادیت ہے، وسائل واسباب ہی اصل سمجھے جاتے ہیں، اس زمانے کے بارے میں شبہ کیا جا سکتا تھا کہ ابھی ایسی مثالیں شاید نہ مل سکیں، لیکن ہمارے اور آپ کے سامنے ایسے نمونے ہیں جنھوں نے اللہ کی رضا کے لیے دینی تعلیم حاصل کی، اور ذرا ہمت کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ ان کے سامنے جھک گیا۔

تاریخ میں امام غزالیؒ کے زمانہ سے بلکہ اور آگے حسن بصریؒ کے زمانہ سے لے کر اس زمانے تک کوئی ایسا مقام نہیں آیا کہ جس میں ایسے نمونے نہ پائے جاتے ہوں، تمہیں جو نمونے دکھائے جاتے ہیں ان سے یہ نمونے ہزارہا درجہ بہتر ہیں جن کو تم نے سنا یا پڑھا ہے، یہ سنۃ اللہ ہے، ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا﴾ (۱) اور ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ

(۱) سورۃ الأحزاب: ٦٢

تَحْوِیْلًا ﴾[1]، خدا کتنی طاقت اور تاکید سے فرماتا ہے، ہمارے لیے تو معمولی طور سے بھی کہہ دینا کافی تھا، ہم تو مسلمان ہیں ہمارے لیے تو قرآن کا ادنیٰ اشارہ قابل حجت ہے، لیکن اس کے باوجود اس زور اور تاکید سے فرمایا کہ سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب اتنی صلاحیت پیدا ہوجائے گی، جب استحقاق ثابت کرلیا جائے گا، اور ایسے صفات پیدا کر لیے جائیں گے تو انسان کو خاک سے اٹھا کر افلاک تک پہنچا دیا جائے گا، اور مٹی سے سونا، بلکہ سونا کیا وہ تو پھر بھی ایک معمولی چیز ہے، گوہر شب چراغ بنا دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ بار بار اپنے بندوں کے حالات بیان فرماتا ہے، حتیٰ کہ ایک پوری سورۃ ہی اسی بیان میں ہے، کہ جوہر ذاتی انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اور جوہر ذاتی

آپ نے سورۂ یوسف پڑھی ہوگی اور پڑھا نہیں تو سنا ضرور ہوگا، بہت مشہور قصہ ہے کہ ایک انسان کو گمنام کرنے کے لیے جتنے اسباب و ذرائع ممکن ہو سکتے ہیں، وہ سب کے سب حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے استعمال کر لیے گئے، انسان کو سب سے زیادہ مدد اس کے گھر اور خاندان سے حاصل ہوسکتی ہے، لیکن ان کی کہانی ہی اس سے شروع ہوتی ہے کہ ان کے بھائیوں نے ہی ان سے دشمنی کی، اور ان کو گھر سے نکالنے اور باپ کی نظروں سے اوجھل کرنے کی پوری کوشش کی۔ جب گھر ہی نے کسی انسان کو رکھنے سے انکار کر دیا ہو تو اس کا کہاں ٹھکانا ہوسکتا ہے؟ ان کو گھر سے نکال دیا گیا، کنویں میں ڈال دیا گیا، لیکن کتنی بڑی آزمائش تھی کہ جن لوگوں نے کنویں سے نکالا وہ دور دراز کا ایک قافلہ تھا اور ان کی قدر شناسی کا یہ عالم تھا کہ اونے پونے داموں میں بیچ ڈالا: ﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ﴾[2] اور خریدا کس نے؟ عزیز مصر نے، اور وہ بھی غلام کی حیثیت سے خریدا۔

اور پھر ان پر وہ آزمائش آئی جو ایک نوجوان پر بڑی سے بڑی ہوسکتی ہے، اور ان پر دہ

---

(۱) سورۃ فاطر: ۴۳ (۲) سورۃ یوسف: ۲۰

داغ لگانے کی کوشش کی گئی جس کے بعد انسان شریفوں کی مجلس میں بیٹھ بھی نہیں سکتا اور ان سے باتیں بھی نہیں کر سکتا، سیاسی الزام تو کبھی اور خاص طور سے اس زمانے میں ترقی کا باعث بن جاتے ہیں، بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ انسان سیاسی جرم میں قید ہونے کے بعد مشہور ہو گیا ہے، اور ترقی کے اعلیٰ منازل پر پہنچ گیا ہے، لیکن دنیا کی اور انسانیت کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملے گی کہ کسی پر اخلاقی الزام لگا دیا گیا ہو اور وہ اس طرح چمکا ہو جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام، چنانچہ وہ جیل بھیج دیے گئے، وہاں بھی اخلاقی مجرموں کے ساتھ جن کا کوئی وقار نہیں ہوتا، لیکن اس لعل کی روشنی وہاں بھی پھوٹی اور یہ گوہر وہاں بھی چمکا، انھوں نے اپنی سیرت اور کردار سے ایسا مقام پیدا کر لیا جس سے لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت بیٹھ گئی، انھوں نے وہاں کے اخلاقی قیدیوں کی ہدایت شروع کر دی، اور یہ ثابت کر دیا کہ جو شخص جیل میں آیا ہے اور اس ناخوش گوار اور تاریک فضا میں مقید کر دیا گیا ہے، وہ اس کا مستحق نہیں تھا، بلکہ وہ دنیا کی اعلیٰ ترین منازل کا مستحق تھا، ان کو اسیر زنداں کر دیا گیا، جیل کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا، لیکن جوہر ذاتی چمکا اور اپنا بلند ترین مقام پیدا کر لیا، حتیٰ کہ لوگ اس کے پاس آنے لگے اور اپنے اہم مسائل میں رجوع کرنے لگے۔

جیل کے دو ساتھیوں نے خواب دیکھا اور تعبیر پوچھی، آپ نے پہلے تو ان کو رشد و ہدایت کی دعوت کی تبلیغ دین کے فرائض انجام دیے، پھر تعبیر بتائی اور وہ تعبیر صحیح نکلی، اور کچھ ہی دنوں میں ایسا شہرہ ہوا کہ ملک کو اور ارباب ملک کو اس کا احساس ہو گیا کہ جس کو انھوں نے جیل بھیج دیا اس کی تو ملک کو ضرورت ہے، جس کو انھوں نے زنداں میں بند کیا ہے اس کو تو ملک کے اہم ترین مسائل حل کرنے ہیں، چنانچہ ان سے ملکی مسائل میں رجوع کیا جانے لگا، اور بادشاہ نے گزارش کی کہ وہ جیل سے باہر آئیں اور ملکی انتظامات میں حصہ لیں، لیکن صاف کہہ دیا کہ ﴿ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ﴾ (۱) تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ رعایت اور مراسم کی وجہ سے جیل سے

---

(۱) سورۃ یوسف: ۵۰

نکالے گئے ہیں، وہ درحقیقت مجرم تو تھے لیکن بادشاہ نے کسی وجہ سے ان کی پردہ پوشی کی اور جیل سے نکال دیا۔ اس بنا پر اس بندۂ خدا نے صاف صاف انکار کردیا کہ جب تک میرے معاملے کی تحقیق نہیں ہوجائے گی میں جیل سے باہر نہیں ہوسکتا، چنانچہ تحقیق ہوئی اور وہ بالکل بری نکلے اور کہنے والے نے کہا کہ ﴿اَلْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ﴾(۱) تب وہ جیل سے آئے اور نہایت ہی اہم ذمہ داری لی، کہا کہ ﴿اِجْعَلْنِيْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ إِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾(۲) کہ خدا نے مجھے حفاظت اور علم کی دو ایسی صلاحیتیں عطا کی ہیں جس کی بنا پر میں اس ذمہ داری کو ادا کرسکتا ہوں، چنانچہ ان کو وزارت خوراک جیسی نازک اور اہم وزارت سپرد کی گئی۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ تمام ممالک میں خوراک کا مسئلہ کتنا نازک ہوتا ہے اور خاص کر ہمارے ملک میں تو نہایت ہی اہم مسئلہ ہے، پھر ان کے بھائی ان کے پاس دست بستہ حاضر ہوئے، غلہ لے گئے اور پھر جب انھیں شبہ ہوا تو کہا: ﴿أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوْسُفُ، قَالَ أَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا أَخِيْ﴾(۳)

زمانہ جوہر ذاتی کے سامنے جھکتا ہے

اس کے بعد یوسف علیہ السلام نے جو دو لفظ فرمائے، میں چاہتا ہوں کہ آپ خوب غور سے سن لیں، یہ ہماری کم ہمتی اور ہماری بزدلی کی سب سے بڑی علامت ہے کہ ہم زمانے کو دیکھتے ہیں، جو نہ کبھی سازگار رہا ہے نہ کبھی سازگار رہے گا، زمانے نے خود بڑھ کر کسی کا استقبال نہیں کیا ہے، جو ہر ذاتی کے سامنے زمانہ جھکتا ہے، اخلاق اور کمال اخلاق زمانے کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لے، انھوں نے جو کچھ کہا وہ قیامت تک باقی رہے گا اور اسی طرح پائندہ وتابندہ رہے گا جیسے اب تک رہا ہے، وہ ہمیشہ ڈوبنے والوں کے لیے سہارا ہے، ہم جو کہتے ہیں کہ زمانے میں ہماری کوئی جگہ نہیں، ہم کو عربی کیوں پڑھائی جاتی ہے؟ ہم یہ بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ اللہ ہمارے والدین کی مغفرت فرمائے، انھوں عربی لائن میں لگا کر ایک بہت بڑی غلطی کی ہے، اور اگر وہ زندہ ہیں تو اللہ ان کو ہدایت نصیب

---

(۱) سورۃ یوسف: ۵۱ (۲) سورۃ یوسف: ۵۵ (۳) سورۃ یوسف: ۹۰

فرمائے، انھوں نے عربی پڑھا کر ہماری زندگی برباد کی ہے، غرض ہماری شکایات کا ایک دریا ابلتا ہے کہ ہم کو یہاں کیوں بھیجا گیا۔

میرے عزیزو! اگر تم کو دودھ میں رکھا جاتا، اور اشرفیوں سے تولا جاتا، اور ہوا میں اڑایا جاتا لیکن تمہارے اندر جوہر ذاتی نہیں، اخلاق وصفات نہیں، حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں، خدا پر اعتقاد اور اس کی اس بے بہا نعمت پر ناز نہیں، ایمان ویقین کی دولت نہیں، تو یہ کیا دنیا کی بڑی سے بڑی دانش گاہ، بڑی سے بڑی یونیورسٹی تم کو کسی کام کا نہیں بنا سکتی، دیکھو کتنے بڑے بڑے علماء، کتنے بڑے بڑے فضلاء اور کیسے کیسے عظیم الشان بادشاہ گزرے ہیں لیکن ان کی اولاد کسی کام کی نہیں ہوئی، کیا ان کو کسی چیز کی کمی تھی؟ اورنگ زیب عالمگیرؒ کو دیکھو کیسے کیسے اساطین علم اور کیسے کیسے ماہرین فن اس کے زمانے میں موجود تھے، اورنگ زیب کو اپنی اولاد کے لیے اچھے سے اچھے اساتذہ کے انتخاب میں کوئی دشواری نہیں تھی، اس کو بڑی سے بڑی دانش گاہ کے قائم کرنے میں کوئی دقت نہیں تھی، لیکن وہ ناکام رہا، اور اس کے شاہزادے معظم شاہ اور اعظم شاہ کسی کام کے نہ ہوئے، لیکن اس کے برعکس ایک غریب ابوحامد الغزالی جس کے باپ نے وفات کے وقت ان کو دوست کے سپرد کردیا تھا، دوست نے ان کی تربیت کی اور تعلیم دی، لیکن باپ کی دولت ختم ہوچکی تو انھوں نے کہہ دیا: 'اب باپ کی کمائی ہوئی دولت ختم ہوچکی، اب تم جو چاہو کرو، اور جس طرح چاہو تعلیم حاصل کرسکتے ہو' لیکن دنیا نے دیکھا کہ وہ احمد و محمد کیا بنے، اور اعظم شاہ اور معظم شاہ کیا بنے۔

صبر اور تقوی

حضرت یوسف علیہ السلام کا اعلان تمہارے لیے زندگی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، ان کو کنویں میں ڈالا گیا، زنداں میں ڈالا گیا اور ان پر سنگین ترین الزام لگایا گیا، غرض کہ دنیا کی ساری طاقتیں ان کی مخالفت کے لیے ابھر آئیں لیکن ان کا جوہر ذاتی چمکا، ان کا جلال، جمال، صداقت اور برتری واضح ہوکر آئی، ان کی عصمت، ان کا استحقاق، ان کی امانت، ان کی وفا آفتاب کی طرح چمکتی ہوئی سامنے آئی، اور انھوں نے کہا: "قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا" اور پھر

وہ عظیم سبب بیان کیا جو دنیا کے سارے درد کا درماں ہے، اور ہر انسان کی زندگی کے لیے مشعل راہ ہے، کیا کہا؟ ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (۱)
یہ ایک ایسا عظیم جملہ ہے اور ایک ایسا بامعنی اور پر تاثیر محرک ہے جو ہر انسان کو ترقی کے اعلیٰ منازل پر پہنچا سکتا ہے، اگر میری رائے مان لی جائے تو میں کہتا ہوں کہ تمام مدرسوں اور اداروں کے دروازے پر یہ لکھ کر آویزاں کر دینا چاہیے، انھوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ تقویٰ اور صبر ایسی طاقت ہے جو نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی یوسف علیہ السلام کے درجے تک پہنچا سکتی ہے۔

تم سو بار عرب ہو آؤ، دنیا بھر کی سیر کرلو، اور ڈاکٹریٹ کرلو، کیمبرج اور آکسفورڈ کے طالب علم ہو جاؤ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، قارون اپنے خزانے کے باوجود، فرعون اپنی سلطنت کے ساتھ، اور نمرود اپنے ان تمام وسائل کے ساتھ اور ذرائع کے ساتھ جو اس کے لیے مہیا تھے، ہمیشہ ناکام رہے، لیکن جن لوگوں نے اخلاص وصبر سے کام لیا وہ کامیاب رہے، دنیا کا بڑے سے بڑا عالم، محقق ناکام، لیکن صاحبِ اخلاص وتقوی وصبر کامیاب، اگر وقت اجازت دیتا تو میں نام لے لے کر کہتا کہ فلاں ادیب ناکام، فلاں مفکر ناکام، فلاں مصنف ناکام، اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو تم بہت کامیاب سمجھتے ہو، لیکن اللہ کی نظروں میں ان سے بڑا ناکام کوئی نہیں، تاریخ بتاتی ہے اور دوست ودشمن سب اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ عمرؓ کامیاب اور عمر ابن عبدالعزیزؒ کامیاب، اور دنیا کے سارے ملکوں کے صدر و نائب صدر اور وزیر اعظم ناکام، اصل معیار یہی ہے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (۲) ایک غریب جس کے اندر صبر وتقویٰ کا جوہر ہے وہ کامیاب ہے، اور اگر یہ نہیں ہے تو چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، ناکام ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ اعلان صرف ان کے بھائیوں کے لیے نہیں تھا، یہ قیامت تک کے لیے ہے اور خاص طور سے تمہارے لیے ہے، یہ انسان کی ترقی ومحبوبیت اور کامیابی واستغناء کا مقام ہے کہ حکومتیں اس کے سامنے جھکتی ہیں اور درخواست پیش کرتی ہیں،

(۱) -(۲) سورۃ یوسف: ۹۰

لیکن ان حضرات کی استغناء کا یہ عالم ہے یہ باتیں سننا گوارا نہیں کرتے اور ان کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ خواب میں بھی اس کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، اگر ان حضرات کو خواب میں بھی یہ نظر آ جائے کہ وہ کسی ملک کے اقتدار پر قابض ہیں، وہ کسی کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں تو وہ گھبرا جاتے ہیں، مغفرت طلب کرتے ہیں، خدا سے دعائیں مانگتے ہیں، توبہ واستغفار کرتے ہیں کہ اے اللہ! مجھ سے کون سی غلطی ہوگئی ہے جس کے جرم میں مجھے یہ سزا دی گئی ہے؟

تمہاری قیمت

میرے عزیزو! تم دھوکے میں ہو، تم کو تمہارے ساتھیوں نے دھوکہ دیا ہے، تمہارے دماغوں نے دھوکہ دیا ہے، تمہارے ماحول نے تم کو دھوکہ میں مبتلا کر رکھا ہے، تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ناکام ہو، اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تم ناکام ہو تو تم سے بڑا ناکام کوئی نہیں، وہ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے تم سے زیادہ کامیاب ہیں جن کی نظریں محض دنیا کی طرف ہیں، بھلا وہ اپنے پاس ایک پرزہ تو رکھتے ہیں، وہ اپنے ذہن میں دوسری زبان کے چند الفاظ تو رکھتے ہیں، لیکن اگر تمہارے پاس وہ جوہر ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس تھا تو تم سے بڑا کامیاب کوئی نہیں، اس کے سامنے یہ حکومت اور دنیا کے ٹھیکرے اور قارون کے خزانے کیا چیز ہیں؟ اگر کوئی تم سے کہے کہ تم ناکام ہو تو اس کے ایمان میں شبہ ہے، اس کو اپنے ایمان کی خبر لینی چاہیے، اس لیے کہ قرآن تمہاری کامیابی کی ضمانت دے رہا ہے۔

ایک بزرگ تھے، جو لاہور میں ایک مرتبہ ایک خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے، جاڑوں کا زمانہ تھا، اور سب دھوپ کھا رہے تھے اور جوئیں مار رہے تھے، اتنے میں ایک شور ہوا، معلوم ہوا کہ اورنگ زیب کی سواری آ رہی ہے، انھوں نے کہا: لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ، میں سمجھا کوئی جوں پکڑی گئی ہے اور اسی کو مارا ہے، اورنگ زیبؒ سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، ان کی نگاہوں میں ہماری اتنی ہی وقعت ہے۔

تاریخ ان واقعات سے بھری ہوئی ہے، ایک بادشاہ آتا ہے خواجہ میر دردؔ کے پاس جو سالک کی حیثیت سے تو کم شاعری کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، پاؤں میں کچھ درد تھا،

بادشاہ نے پیر پھیلا دیا، انھوں نے فوراً ٹوکا کہ آداب مجلس کے خلاف ہے، بادشاہ نے عرض کیا کہ پاؤں میں تکلیف ہے، تو جواب ملا کہ پھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ غرض کہ اس طرح کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں اور ایسے ایسے اللہ والے گزرے ہیں جن کے وہم وگمان میں بھی یہ باتیں آجائیں تو اس کو بہت بڑی بدقسمتی سمجھتے تھے اور ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔

عزیزو! تم نے سمجھا کیا ہے؟ تمہارے اندر میں کیسے کیسے گردوں ہیں، کیسے آفاق و افلاک ہیں، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سوچ رہے ہو کہ یہاں سے نکل کر کس یونیورسٹی میں امتحان دوگے، کس کالج میں داخلہ لوگے، تم نے اپنی بہت کم قیمت لگائی ہے، تم نے اپنے آپ کو نیلام کی منڈی میں پیش کیا ہے اور یقیناً جو شخص نیلام کی منڈی میں قیمت مانگے گا اس کو بہت کم قیمت ملے گی، لیکن اگر کوئی اپنے گھر پر بیٹھ کر کہے اور یہ اعلان کردے کہ کوئی ہے جو میری قیمت لگائے؟ تو دنیا تمہارے قدموں میں آجائے گی، دنیا ہر ایک کو سمجھتی ہے، اگر تم کہو گے لاؤ تو کوئی نہیں دے گا، اور اگر تم کہو کہ نہیں لوں گا تو سب تم کو دیں گے، اور خوشامد کر کے دیں گے، تم انگریزی کے نہیں عربی کے طالب علم ہو، اگر کوئی ان دونوں علوم کو متوازی سمجھے اور ایک صفحہ پر متوازی خطوط کھینچے، تو یقین مانو کہ مستقبل کے لحاظ سے انگریزی کا خط زیادہ روشن ہے، لیکن اگر تم نے اس کو برابر ماننے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ اس کے لیے یہ صفحہ کافی نہیں، ایک پورے عالم کا اور کائنات کا صفحہ بھی اس کے لیے ناکافی ہے، تو تم قابل قدر ہو، اگر تم نے کہا کہ عربی کی یہ قیمت ہے تو دنیا کہے گی پھر تو ہم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر تم کہو کہ ہم قیمت کے طالب نہیں، تو دنیا آئے گی اور کہے گی کہ یہ میرا سب کچھ لے کر میری جھولی میں صدقہ ڈال دو، سچ ہے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۱)۔

تسخیر کا نسخہ

اب تمہارے لیے دو راستے ہیں، تم اپنے اندر تقویٰ اور صبر کے صفات پیدا کرو، ربانیت اور اخلاص کے حامل بنو، اور اللہ کی ہدایت اور تعلیم کو جذب کرنے کی کوشش کرو، اور یہ

(۱) سورۃ یوسف: ۹۰

ارادہ کرو کہ تم پڑھ لکھ کر دین اور صرف دین کی خدمت کروگے، اگر ایسا کروگے تو وہی ملے گا جو حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تھا۔ یہ جملہ کسی کے لیے خاص نہیں، بالکل مطلق ہے، ہر عربی جاننے والا اور عربی سے دلچسپی لینے والا اس کے اطلاق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، میدان کھلا ہے جس کا جی چاہے تجربہ کرے، یہ ایک نسخۂ تسخیر ہے جس نے اس کو استعمال کیا وہ کامیاب رہا، ہم میں سے ہر شخص نے اس کا تجربہ کیا ہے، تم بھی اس کا تجربہ کرلو، اخلاص پیدا کرو، اور تقویٰ و صبر کی صفات پیدا کرو، پھر کوئی زمانہ ہو، کوئی ملک ہو اللہ تم کو کامیاب کرے گا، پھر تم کو کوئی شکایت نہیں ہوگی اور تمہاری زبان پر یہ الفاظ ہوں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِيْ أَنْجَزَ وَعْدَہُ، وَ نَصَرَ عَبْدَہُ، وَھَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَہُ۔

بس میں ان الفاظ پر تقریر ختم کرتا ہوں، اور بجائے اس کے کہ میں اپنا سفر نامہ بیان کرتا، میں دعوت دیتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ تم اس لائق ہو جاؤ کہ خلق خدا تم سے وابستہ ہو، کہ تم خود اس سفر کے لائق بنو، راستہ کھلا ہے تم میں سے ہر ایک اس کو آزما سکتا ہے، بس صرف تقویٰ وصبر، محنت و ہمت کی شرط ہے، کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے اور یہی سنۃ اللہ ہے، ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً وَّلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلاً﴾۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۶۵ء میں سفر حج سے واپسی کے بعد طلبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء کے دیے ہوئے ایک عصرانہ میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد العلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر جون و ۱۰ر جولائی ۱۹۶۵ء)۔

تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام

عزیز بچو! تم اس ملت کے نونہال ہو جس کے قیام میں بڑی قربانیاں پیش کرنی پڑی ہیں، تم اس باغ کے پھول ہو جس کو اللہ والوں نے اپنے خون سے سینچا ہے، تم اس دین کے علم وعمل کے طالب ہو جس کے لیے انبیاء (علیہم السلام) نے تکلیفیں اٹھائیں اور صحابہ کرام نے قربانیاں پیش کی ہیں، تم کو اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہے، اور اپنے مقام کی لاج رکھنی ہے، بڑے بزدل ہیں وہ لوگ جو مورچہ پر جانے والے سپاہیوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ افسوس تم ایسی جگہ جا رہے ہو جہاں گولیاں چلیں گی، توپیں دغیں گی، بم برسیں گے، اور تمھاری جان کو خطرہ ہی خطرہ ہوگا، ایسے موقع پر بہادری اور صحیح ہمدردی یہ ہے کہ اپنے زور بیان سے سپاہیوں کو قربانی کے لیے بے قرار کر دیا جائے، اسی طرح تم خود فیصلہ کرو گے کہ بڑا بدخواہ ہے وہ شخص جو تم سے یہ کہے کہ بڑا ظلم ہے تم پر کہ صرف ونحو بھی لاد دیا اور انشاء وادب پہ بھی مجبور کیا، انگریزی اور فارسی بھی لازم کی، ریاضی اور تجوید کو بھی ضروری کیا۔

اسی طرح میں تم کو بتاتا ہوں کہ ہرگز وہ تمھارا ہمدرد نہیں جو تم سے زمانہ طالب علمی کی پابندیوں پر اظہار افسوس کرتا ہے۔

عزیزو! میں یا تمھارے ماسٹر عرشی صاحب تم میں سے کسی کو کسی خاص کام کے لیے منتخب کریں تو منتخب کیا جانے والا خوش ہوگا کہ مجھے اہل جانا گیا، اسی طرح تمھیں فخر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس پر آشوب دور میں، اس فتنہ کے زمانہ میں اپنے دین کے علم کا طالب بنایا، عزیزو! غور کرو برگد کا درخت کتنا بڑا ہوتا ہے اور اس کا بیج کتنا چھوٹا، اب اگر کوئی کہے کہ برگد کے اس ذرا سے بیج میں برگد کا بہت بڑا درخت ہے تو تعجب معلوم ہوگا، لیکن اگر کوئی قسم

کھا جائے کہ اس ننھے سے بیج میں آسمان سے باتیں کرنے والا، ہزاروں کو اپنے نیچے بٹھا لینے والا، کروڑوں پتیوں، اربوں بیج اور سیکڑوں شاخوں والا درخت موجود ہے تو قسم جھوٹی نہ ہوگی، اور اگر ایسی کوئی خوردبین ایجاد ہوتی تو تم کو اس ننھے سے بیج میں بڑے برگد کا سب کچھ دکھایا جا سکتا تھا، لیکن وہ چھوٹا سے بیج برگد کب بنے گا؟ جب اپنے کو دنیا کے باغ و بہار سے ایک عرصہ کے لیے محروم کر کے مٹی میں دفن کر لے گا، پھر وہی بیج زمین کے سخت پردہ کو چیز کر باہر آئے گا، اب ابھی اس کو قدرتی ترقی کے راستوں سے گزرنا ہے، اور برسوں کے محنت و مجاہدہ اور دیکھ ریکھ کے بعد وہ بڑا ابر گد بن جائے گا، جس کے نیچے سیکڑوں مخلوق خدا سایہ و پناہ حاصل کرے گی، بالکل اسی طرح تمھارے اندر فقیہ و محدث پوشیدہ ہیں، عالم ربانی اور اولیاء اللہ چھپے ہیں، لیکن کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں جس سے دیکھ کر بتایا جا سکے کہ کون تم میں محدث ہے، کون مفسر، کون محقق ہے اور کون ولی اللہ؟ تم میں سے ہر ایک میں اس کی صلاحیت موجود ہے، لیکن اسی برگد کے بیج کی طرح یہاں بھی ایک قدرتی راستہ ہے، اپنی چاہتوں کو قربان کرو، اپنے دلوں کو دباؤ، جی چاہے تفریح کا مگر تم دل کو دبا کر پڑھنے میں لگ جاؤ، جی چاہے سونے کا لیکن تم پڑھنے کے لیے جاگو، جی چاہے نہ پڑھنے کا مگر پڑھو، تو انشاء اللہ تمھیں میں سے بڑے بڑے علماء و فضلاء نکل کر دنیا و عقبیٰ کی ناموری حاصل کریں گے۔

عزیزو! اگر غیبت نہ ہوتی تو میں نام لے لیتا کہ میں نے طالب علمی کے زمانہ میں کئی ایسوں کو دیکھا ہے جن کے کپڑوں کو شکن نہیں آتی تھی، سر پر ٹوپی ٹیڑھی ہوتی جس کے نیچے سے انگریزی بال جھانکتے ہوتے، بڑے تیز طرار، ان کی زبانوں پر روس و امریکہ کے مصنفین اور لیڈروں کے تذکرے، شہر کے ہر ہوٹل سے واقف، ہر مشاعرہ میں شریک، ہر لیڈر کے استقبال میں مستعد، شہر کے ہر واقعہ اور حادثہ کے مقام پر ان کا پہنچنا ضروری، مگر تدریسی محنت سے ان کو کوئی سروکار نہیں، یا اس سب کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں بھی تیز مگر دینی اعمال سے دور، اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ یہ بہت بڑے مصنف ادیب ہوں گے، دنیا ان کی رہنمائی میں چلے گی، لیکن آج جب ان کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں تو وہ کسی بھی دینی خدمت پر نہیں

پائے گئے، زیادہ سے زیادہ کسی دیہات کے معمولی مدرسہ کے معلم اردو یا سکنڈ مولوی نظر آئے، لیکن جو لوگ اس وقت اپنے دل کو مارتے تھے، کہ رلا رلا دیتے تھے، لیکن ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ آئی، وہ محنت میں لگے رہے، وہی چمکے، آج ان میں سے کوئی حدیث کی خدمت کر رہا ہے، تو کوئی فقہ کی، کوئی تفسیر کی خدمت انجام دے رہا ہے، تو کوئی افتاء کی، کوئی کسی بڑے ادارہ کا مہتمم ہے، تو کوئی منتظم اور بیسیوں ایسی کتابوں کے مصنف جن کی عالم میں قدر ہے۔

بس تھوڑی سے محنت کرلو، جس طرح مسجد میں جاتے ہو تو تا انتظار نماز باادب بیٹھے رہتے ہو، پھر مسجد سے نکلنے کے بعد اسی طرح باادب رہنے کے لیے کوئی نہیں کہتا، ایسے ہی زمانہ طالب علمی کو باادب گزاردو، پھر آزاد ہو کر مزے اڑاؤ گے، جس طرح روزہ میں دن بھر کچھ نہیں کھاتے، مگر افطار کے بعد کھانے سے کوئی نہیں روکتا، اسی طرح یہ زمانہ طالب علمی ایک بڑا روزہ ہے، اُس روزہ میں سحری ایک، افطار ایک، اور اس میں سحریاں ہزاروں، افطار ہزاروں، میں یہ نہیں کہتا کہ تم کھیلو نہیں، دوڑو نہیں، ہنسو نہیں، یہ تو تمھاری فطرت ہے، اور صحت کے لیے ضروری، مجھے مردہ سا مرجھایا ہوا لڑکا بالکل پسند نہیں، مگر وہی کھیل کے وقت خوب کھیلو، پڑھنے کے وقت خوب پڑھو، اگر تم نے اس طرح محنت کر لی تو انشاءاللہ پھر وہ ہو گے جو تمھارے والدین کے تصور میں نہیں، اور ہمارے وہم و گمان میں نہیں، پھر ملک ملک سے تمھارے لیے دعوت نامے آئیں گے، تمھارے سامنے سپاسنامے پیش ہوں گے، حاکمان وقت تمھارا استقبال کریں گے، اور سب سے بڑی بات اللہ کی رضا حاصل ہوگی، جس کے بارے میں وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ أَکْبَرُ آیا ہے، تمھارے نام سے تمھارے خاندان اور تمھاری بستی کا نام روشن ہو جائے گا، تمھاری بستی کا ذکر تاریخوں میں محفوظ ہو جائے گا، یاد رکھو، شہروں اور بستیوں سے اشخاص نہیں چمکے بلکہ شخصیتوں سے شہر اور بستیاں اجاگر ہوئیں، آج ملا نظام الدین سہالوی سے سہالی کا نام زندہ ہے، مولانا غلام آزاد بلگرامی اور مولانا عبدالجلیل بلگرامی سے بلگرام کا نام چمک رہا ہے، اسی طرح علامہ شاشی سے شاش، امام رازی سے رے اور امام بخاری سے بخارا کا نام باقی ہے۔

میں تمھارے ماسٹر صاحب سے سفارش کروں گا کہ وہ تمھارے لیے کتاب ''علمائے سلف'' مہیا کریں، جس میں تم دیکھو گے کہ جس نے جس قدر مجاہدہ کیا، اتنا ہی خیر اس کے حصہ میں آیا۔

بس تمھارے کام کے لیے اتنی باتیں بہت کافی ہیں، خلاصہ یہ کہ تھوڑے دنوں اپنے دل کی چاہتوں کو مار کر محنت کرلو، پھر انشاء اللہ ہمیشہ باعزت رہو گے، اور آرام اٹھاؤ گے، لیکن اگر یہ زمانہ تم نے غفلت میں گزارا تو ندامت وحسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا، نہ صحیح اردو بول سکو گے، نہ صحیح عربی پڑھ سکو گے، نہ صحیح خطبہ دے سکو گے، نہ کام کی تقریر کرسکو گے، نہ مسئلہ بتا سکو گے، نہ تاریخ پر گفتگو کرسکو گے، نہ ادب میں کوئی مقام حاصل کرسکو گے۔

اب تمھیں فیصلہ کرلو، تھوڑے دن جھوٹی تفریح اور ہمیشہ کی رسوائی پسند کرتے ہو یا تھوڑے دن کی تکلیف اور ہمیشہ کا آرام؟

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ (۱)

(۱) ۸/ جمادی الاخری ۱۳۹۰ھ کو سلیمانیہ ہال، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلبۂ ندوہ کے سامنے کی گئی تقریر، اس کو (ڈاکٹر) ہارون رشید صدیقی نے قلمبند کیا، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/ اگست ۱۹۷۰ء)۔

عزم اور اخلاص

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم
﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا، اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّأَكْبَرُ تَفْضِيْلًا﴾ (۱)

مطالعۂ تاریخ کے دو ردِّ عمل

عزیزو اور بھائیو! ہم آپ تاریخ کی کتابیں پڑھتے ہیں، علم وفن کی تاریخ ہو، مذہب و اخلاق کی تاریخ ہو، یا سلطنتوں کی تاریخ ہو، سیاست وحکمرانی کی یا انسانی ذہانت اور اس کی صلاحیتوں کی، تاریخ پڑھنے کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ ہم میں ان گذشتہ باکمالوں کی تقلید کا جذبہ پیدا ہو، ہمارے اندر بھی حوصلہ پیدا ہو کہ ہم بھی ان کا راستہ اختیار کریں اور ان کے جیسے بنیں، اور اس کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب ان کے کارنامے پڑھتا ہے جو بعض اوقات اس کے دماغ اور اس کے ذہن کی سطح سے بلند ہوتے ہیں، تو اس کے اندر مایوسی پیدا ہوتی ہے کہ اب ایسے کمالات کہاں پیدا کیے جا سکتے ہیں!

زہد و ورع، روحانیت اور روحانی پیشواؤں کی تاریخ پڑھیے، بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں پڑھیے، اور تصوف وسلوک کی تاریخ پڑھیے تو اس سے دل پر یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں، وہ معلوم نہیں کس دل گردے کے انسان تھے اور خدا نے ان کو کیسا بنایا تھا، کس مٹی کے وہ انسان تھے جو فرشتوں سے بازی لے گئے اور انھوں نے کس طرح

---

(۱) سورة الإسراء: ۲۰-۲۱

نفس کشی کی، کس طرح اپنی اصلاح کی اور کس طرح اس مادیت کی بلکہ حیوانیت کی سطح سے بلند ہو کر وہ ملکوتی صفات ان کے اندر پیدا ہو گئیں اور وہ فرشتوں سے بازی لے گئے۔

اسی طریقہ سے علماء کے تراجم پڑھیے تراجم کی کتابوں، تذکرہ کی کتابوں میں، تو بہت سے لوگوں پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بس اب یہ دور ختم ہو گیا اور یہ ورق الٹ گیا، اب نہ ایسے باکمال پیدا ہوں گے نہ ایسے کمالات کوئی پیدا کرسکتا ہے، اخلاقیات کے میدان میں آیئے تو اُن حضرات کی بے نفسی، خلوص، للّٰہیت، بے غرضی، استغناء، زہد، بڑے بڑے سلاطین کو خاطر میں نہ لانا اور دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اور وجاہت کو ٹھکرا دینا اور آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھنا، اس کے واقعات کثرت سے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، کوئی کتاب آپ اٹھا لیجیے تذکرہ اور تاریخ کی، تو آپ کو زیادہ ورق گردانی اور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ کا کتب خانہ ایسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابوں سے بھرا ہوا ہوگا، بلکہ آپ کا کتب خانہ ''اصلاح'' بھی اس سے خالی نہیں ہے، یہ ایک نتیجہ ہے جو انسان ہر دور میں نکالتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ یہ مادیت کا دور ہے، قویٰ کمزور ہو گئے ہیں، ہمتیں پست ہیں، زندگی کے تقاضے بہت ہیں، اس کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے، زندگی کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے تب جا کر کہیں پیٹ بھرنے کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

اور آپ دیکھیں گے اور میں نے ایک مرتبہ ''الاصلاح'' کی تقریر میں بھی یہ کہا تھا کہ ہر زمانہ کے شعراء نے اپنے دور کا ماتم کیا ہے، اور اپنے دور کی زبوں حالی اور اہل کمال کی گمنامی اور ان کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے، خواجہ حافظ ہوں یا شیخ سعدی ہوں یا عمر خیام ہوں، کہ ان کے زمانہ سے بدتر کوئی زمانہ نہیں تھا اور ان کے زمانے میں گویا خاک اڑ گئی تھی، کچھ رہا ہی نہیں تھا، نہ کوئی اہل کمال کا قدر دان تھا، نہ کوئی علم کی قدر و قیمت باقی رہی تھی، سب ایک کسمپرسی کی حالت میں پڑے تھے، لیکن اسی دور کے اہل کمال کے تذکرے آپ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں کوئی انقلاب نہیں آیا تھا، اور کوئی چیز بھی ان کے راستہ میں مزاحم نہیں ہوئی تھی، اور نہ ان کو اپنے زمانہ کا شکوہ ہے اور نہ اہل زمانہ کو ان سے کوئی شکایت۔

کوئی دور اہل کمال سے خالی نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دور بھی ایسے شعراء سے اور ایسے شکوہ سنج لوگوں سے خالی نہ رہا کہ انھوں نے اپنے زمانہ کا ماتم نہ کیا ہو، مگر کوئی دور بھی اہل کمال سے خالی نہیں رہا، ایک طرف یہ ہوتا رہا اور دوسری طرف اہل کمال بھی پیدا ہوتے رہے، اب ہمارا یہ زمانہ آیا، اس زمانہ میں سب سے زیادہ دباؤ ہے زندگی کے تقاضوں کا، اور ایک ہی حقیقت رہ گئی ہے لوگوں کے نزدیک، وہ سمجھتے ہیں کہ اس زمانہ میں کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا، اور کسی چیز میں کمال نہیں پیدا کیا جا سکتا، ایک ہی میدان رہ گیا ہے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا، اور وہ میدان ہے معاشی میدان یا سیاسی میدان۔

اب آپ یہاں دار العلوم میں آئے ہیں، بہت سے لوگ تو بغیر کسی شعور کے آئے ہیں، جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، اور اس دار العلوم کی کیا تاریخ ہے؟ اور کیا مقاصد ہیں؟ یہاں کس طرح کے آدمی پیدا کرنا مقصود ہے؟ اور بہت سے بھائی ایسے ہیں جو کچھ سمجھ کر آئے ہیں اور ان کے اندر کچھ امنگیں ہیں، لیکن سب کے دماغ پر یہ اثر ہے کہ اس زمانہ میں کیا ہو سکتا ہے؟

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے

میں نے جو آیت پڑھی ہے، وہ آیت اسی مقصد کے لیے پڑھی ہے کہ اس میں ہمیں زندگی کا بہت بڑا ایک پیغام ملتا ہے، بہت بڑی طاقت، ایک نئی قوت انسان کے اندر یہ آیت پیدا کرتی ہے، اور بہت بڑے مغالطہ کو دور کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو سنتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں طے فرمائی ہیں کہ ایسا ہونا ہے، اس کا جو معاملہ ہے اس دنیا کے ساتھ، اپنے بندوں کے ساتھ، وہ معاملہ بالکل اٹل ہے، ازلی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں، ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً﴾ [1] اتنی تاکید کے ساتھ، اتنے زور کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان کیا

---

(۱) سورة الأحزاب: ٦٢

ہے، بار بار قرآن مجید میں یہ مضمون آیا ہے: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا﴾ (۱) اللہ تعالیٰ اگر فرما دیتا کہ سنت الٰہی میں کوئی تغیر نہیں ہے تو بھی کافی تھا، لیکن اتنا زور دے کر فرمایا ہے، یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ وہ جب تبدیلی دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ اب سنۃ اللہ بدل گئی ہے، اپنے اندر تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے محلّہ میں تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے محدود خاندان میں تبدیلی دیکھتا ہے، اپنے ارادوں میں تبدیلی دیکھتا ہے، ہمت میں تبدیلی دیکھتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ سنۃ اللہ بھی بدل گئی ہے، یہ انسان کی پرانی کمزوری ہے، اس کا ظہور مختلف شکلوں میں، ادب میں، شاعری میں، جد وجہد کے میدان میں، دینیات میں، سب میں ہوا ہے، تو یہ انسان کی پرانی بیماری ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس پر زور دیا ہے، اس کو زور کی ضرورت نہیں ہم کو زور کی ضرورت ہے، وہ اس خیال کو بالکل دور کرنا چاہتا ہے کہ سنن الٰہیہ میں، قوانین ازلی میں، اور فطرۃ اللہ جسے کہا گیا ہے، اس میں کوئی تغیر و تبدل ہوسکتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی کوشش میں، انسان کے ارادے میں بڑی طاقت رکھی ہے، اللہ تعالیٰ غنی ہے، سب جانتے ہیں ہمارا آپ کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے، اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن اس نے کچھ چیزیں طے فرما دی ہیں کہ ایسا ہونا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، اس میں سے ایک طے شدہ قانون یہ ہے کہ انسان کی کوشش کو بے نتیجہ نہیں رکھتا، یعنی انسان کوشش کرے اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، ایسا کبھی نہیں ہوتا: ﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفٰى﴾ (۲) اور یہ ﴿ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفٰى﴾ کو میں سمجھتا ہوں، میری ناقص فہم میں یوں آتا ہے کہ اَلْجَزَاءَ الْأَوْفٰی میں دنیا اور آخرت دونوں ہی شامل ہے، دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی، اور آخرت کے لیے بھی، آخرت کا تو کہنا ہی کیا، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے کہ انسان کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی اور اس کو اس کی کوشش کا پھل ضرور ملتا ہے۔

---

(۱) سورۃ فاطر: ۴۳ (۲) سورۃ النجم: ۳۹-۴۱

یہ وہ حوصلہ بڑھانے والی طاقت ہے جس نے زندگی کے بڑھانے والے پہیے کو ہمیشہ گردش میں رکھا، اور اس نے انسانی صلاحیتوں کو ہمیشہ تازیانہ کا، مہمیز کا کام دیا، اور ہمیشہ اس کے لیے جیسے انرجی (Energy) ہوتی ہے، اس طرح اس نے ہمیشہ انسانی نسلوں میں، انسانی صلاحیتوں میں، اور ہر زمانہ کے انسانوں میں، ایک نئی امنگ، ایک نئی طاقت، ایک نیا حوصلہ، ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا انعام دیا ہے انسانوں کو، اتنا بڑا اعزاز بخشا ہے، اتنا بڑا تاج ان کے سر پر رکھا، خلافت الٰہی کے تاج کے بعد اس سے بڑھ کر میں کوئی تاج نہیں سمجھتا، خلافت اور نبوت کے تاج کے بعد اس سے بڑا کوئی تاج نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت کو اس سے زیادہ کسی چیز نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا کہ انسانی کوشش کا ضرور نتیجہ نکلے گا۔

آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی پوری تاریخ، تہذیب وتمدن کی تاریخ، صنعت وحرفت کی تاریخ، علم وفن کی تاریخ، اخلاق کی تاریخ، اصلاح اور تجدید کی تاریخ، حق و باطل کی کشمکش کی تاریخ، دنیا کو تباہی سے بچانے کی جو وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہیں، نسل انسانی کو تباہی سے بچانے کی جو مبارک کوششیں ہوتی رہیں، آپ دیکھیں گے ان کے اندر جو سب سے بڑھ کر قوت کارفرما تھی، ایمان کی قوت کے بعد یہی اعتماد اور یہی بھروسہ تھا اور خدا کی اس بات پر یقین کہ کوشش کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کو اور آپ کو ایک مٹھی بھر جَو، ایک دانہ غلہ نہ ملتا، ایک بیج ہم کو آپ کو نہ ملتا، اور یہ روٹی کا ٹکڑا جو ہم کو نصیب ہو جاتا ہے، ہم اس سے بھی محروم رہتے اگر کسان کے اندر یہ یقین نہ ہوتا، خواہ تجربہ کی بنا پر ہو، خواہ عقیدہ کی بنا پر ہو، خواہ مشاہدہ کی بنا پر ہو، خواہ لوگوں کی بات پر یقین کرنے کی بنا پر ہو، بہر حال کسان کے دل میں یہ یقین ہے کہ وہ مٹھی بھر جو بیج ڈالتا ہے زمین میں، وہ زمین جس کو بیج سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا، بظاہر وہ تو بیج کو کھا جانے والی ہے، وہ تو محض خشکی سراپا خشکی اور بیج زندگی سے بھرپور، اس زندہ چیز کو اس مردہ چیز کے سپرد کیا جاتا ہے، زندگی کی امانت موت کے سپرد کی جاتی ہے، سرسبزی اور شادابی اور نمو کی صلاحیت کو خشکی اور خشک کر دینے والی چیز کے سپرد کیا جاتا ہے، کوئی جوڑ ان

دونوں میں سمجھ میں نہیں آتا، لیکن قدرت خداوندی بتاتی ہے، اس کا اعلان ہے، حکمت خداوندی کا اعلان ہے کہ ہم نے یہ راستہ متعین کیا ہے کہ جو زندگی کی طاقت سے بھر پور ہے، جو نمو اور شادابی سے بھر پور ہے، اس کو خدا کے بھروسہ پر اور اس اصول پر بھروسہ کرتے ہوئے، اس اصول پر یقین کرتے ہوئے کہ انسان کی کوشش کا پھل ضرور ظاہر ہوتا ہے، تم اس زمین کے حوالے کر دو اور تھوڑی سی اس پر کوشش کرلو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ زمین اپنے خزانے اگلتی ہے، کہ زمین نے ہر دور میں اپنے خزانے اگلے ہیں، اور تاریخ میں کسی ایک سنہ کا بھی نشان نہیں ملتا کہ جس میں ساری دنیا میں زمین نے انکار کر دیا ہو کہ وہ انسان کی کوشش کا یہ پھل نہیں دے گی۔

مختلف میدانوں میں انسانی کوششوں کے نتائج

اسی طریقہ سے جس میدان میں آپ دیکھیں گے، انسانی کوشش کے کامیابی کے نقش آپ کو صاف نظر آئیں گے، یہ وہ طاقت ہے جو دنیا کے اس پہیہ کو چلا رہی ہے، یہ آپ کو جو زندگی نظر آرہی ہے، جو رواں دواں کہلاتی ہے، یہ رواں دواں زندگی، اس کی یہ حرکت اور اس کا نمو، اس کی تیزی اور اس کی یہ حرارت اور یہ جوش، سب اسی بات، اصول اور اسی یقین کا رہین منت ہے کہ انسان کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا عطیہ ہے، اس کی اتنی بڑی نعمت ہے جو انسان کو ملی ہے، انسان کو اس نے یقین دلایا کہ تیری کوشش ضائع نہ ہوگی، خواہ کسی میدان میں ہو، لیکن کوشش شرط ہے، اور پھر کوشش کی ایک خاص مقدار اور کوشش کا خاص معیار اور اس کے لیے ایک جذبۂ مسابقت، اب جس میدان کو تم انتخاب کرو گے اس میں تم اپنی کوشش کا نتیجہ دیکھو گے، چنانچہ پوری تاریخ ہمیں بتاتی ہے جس میدان کو جس انسانی گروہ نے انتخاب کرلیا، جس انسانی نسل نے انتخاب کرلیا، جس انسانی طبقہ نے انتخاب کرلیا، اس میں کوشش اور مسابقت کا جذبہ اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ وہ رنگ لایا، وہ اس نے کرشمہ دکھائے، وہ شگوفے کھلائے کہ عقل انسانی حیران ہے، آج تک

اس کی تاویل نہیں ہوسکی کہ انسان وہاں تک پہنچ سکتا ہے، انسان آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا ہے، انسان آسمانی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے، اور انسان قدرت کے رازوں کا انکشاف کرسکتا ہے، انسان اُن طبعی طاقتوں کی تسخیر کرسکتا ہے، ہوا کے دوش پر اڑ سکتا ہے۔

یہ تو میں نے طبعیات کے میدان کو لیا ہے، اخلاقیات میں آپ دیکھیے، تو آپ کو ان حضرات کے جنھوں نے اخلاقیات کو اپنا میدان بنایا، اپنے نفس کی اصلاح کو اپنا میدان بنایا، تہذیب نفس کو اور تزکیۂ نفس کو انھوں نے اپنا میدان بنایا، اپنے نفس کے ناجائز تقاضوں کو اور بہیمی تقاضوں کو مغلوب کر کے اور اللہ کے بندوں پر یقین کرتے ہوئے اپنے اندر ایمان، اخلاق حسنہ فاضلہ اجاگر کرنے اور نکھارنے کے میدان میں جن لوگوں نے کوشش کی، ان کے اخلاق کی لطافت کو، ان کے اخلاق کی بلندی کو، ان کے اخلاق کی نزاکتوں کو، ان کے اخلاق کے اس نوک پلک کو، ان کے اخلاق کی اس نزاکت کو سمجھنا بڑے بڑے شعراء کی نظموں سے ان کو سمجھنے، ان سے بڑے نکتہ آفریں مضامین سمجھنے سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے، اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہی انسان جس کے ساتھ معدہ لگا ہوا ہے، اور جس کے ساتھ نفسانی خواہشات لگی ہوئی ہیں، اور جو اکثر شیطان کا بالکل مُرکب بن جاتا ہے، اس سے شیطان وہ وہ کام کراتا ہے کہ جس کے سامنے جانور بھی اپنے کان پکڑیں اور وہ بھی شرمندہ ہو جائیں، یہ انسان ان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے، عبادت کے میدان میں دیکھیے تو آپ کو صرف اسلام کی تاریخ میں — اور مذاہب کی تاریخ نہ تو اتنی محفوظ ہے اور نہ اتنی دور جانے کی ضرورت ہے — اگر آپ صرف اسلام کے عابدوں کی، شب زندہ داروں کی اور زاہدوں کی تاریخ پڑیں تو حیرت ہوتی ہے کہ انسان عبادت کے میدان میں اتنی ترقی کرسکتا ہے، اتنا اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے، اتنی اس کو لذت وحلاوت حاصل ہوسکتی ہے، اس کے اندر اتنا خشوع وخضوع پیدا ہوسکتا ہے، اس کے اندر اتنی یکسوئی پیدا ہوسکتی ہے، وہ اس عالم میں ہونے کے ساتھ اس عالم سے اتنا غیر متأثر ہوسکتا ہے، اس کے اندر گویا اقبالؔ کے الفاظ ’اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز‘ یہاں تک پہنچ سکتا ہے، رقت قلب کے واقعات پڑھیے، خشوع وخضوع کے واقعات پڑھیے، ان کے

استغراق کے واقعات کو پڑھیے تو انسان کی عقل اس کو آسانی سے قبول نہیں کرتی۔

اب علم کے میدان میں آیئے، آپ دیکھیں گے کہ انسان نے علم کو اپنا میدان بنایا، اس میں مسابقت شروع ہوئی، اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش پیدا ہوئی، اور اس میں اپنی صلاحیت کو صرف کرنے کا انسان کے اندر شوق پیدا ہوا تو پھر انسان نے علم کے میدان میں وہ ترقی کی کہ انسان کی عقل میں وہ باتیں آسانی سے نہیں آتیں کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی ہو سکتا ہے، انسان کا سینہ اتنا فراخ ہو سکتا ہے، انسان کا یہ دماغ، یہ کاسۂ دماغ ایک بالشت بھر بھی اس کا رقبہ نہیں ہے، اور ایک مٹھی میں وہ آسکتا ہے اس کے اندر اتنی قوت برداشت پیدا ہو سکتی ہے، اس کے اندر اتنا تنوع پیدا ہو سکتا ہے کہ کتب خانوں کو اپنے اندر وہ اتار لے، ایک علم نہیں، دو علم نہیں، پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ، ستر ستر علوم میں اتنا کمال پیدا کر سکتا ہے انسان۔

شاعری کے میدان میں آیئے، فی البدیہہ شاعری کو آپ دیکھیے، حاضر جوابی، حاضر دماغی کو آپ دیکھیے، دماغی شادابی کے واقعات کو آپ دیکھیے تو ایک ایک فن میں انسان نے وہ ترقی کی ہے مثلاً برجستہ شعر کہنے کو یا مثلاً تاریخ نکالنے ہی کو لیجیے، بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ الہام ہے، اسی طریقہ سے ساری تاریخ ہم کو یہ بتاتی ہیکہ انسان نے جس میدان کی طرف رخ کیا، اور جس میدان کو سر کرنے کا عزم پیدا ہوا، اور طلب صادق پیدا ہو گئی، عزم راسخ پیدا ہو گیا، اور اس نے سمجھا میری کامیابی کا راز اسی میں ہے، اور اس نے سمجھا میری سعادت ہے کہ میں اس میدان میں ترقی کروں، تو خدا کی مدد اس طرح سے آئی کہ آدمی حیران رہ گیا۔

﴿نُمِدُّ﴾ کے معنی

اور یہ ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ﴾[1] آپ لوگ تو عربی کے طالب علم ہیں، آپ سے کہتا ہوں: ﴿نُمِدُّ هَؤُلَاءِ﴾ کے معنی یہ نہیں کہ ہم سب کی امداد کرتے ہیں، عربی

(۱) سورۃ الإسراء: ۲۰

میں امداد کرنے کے لیے اور الفاظ ہیں، اعانت کا لفظ ہے، بہت سے لفظ ہیں، قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں، نُمِدُّ کے معنی یہ نہیں ہے، اردو میں مدد کا لفظ آتا ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ باب افعال سے أَمَدَّ یُمِدُّ کے معنی مدد کرنا ہیں، اس کے لیے دوسرے لفظ ہیں، عربی میں امداد کے معنی مدد کرنے کے نہیں ہیں، امداد کے معنی ہیں: بھر بھر کر دینا، ریل پیل کر دینا، جس طریقہ سے رسد لگادی جاتی ہے، برابر ایک سلسلہ ایک کے پیچھے ایک، ایک کے پیچھے ایک، اس طرح ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَؤُلَآءِ﴾ ہم بھر بھر کر دیتے ہیں، ہم جھولی بھر بھر دیتے ہیں، ہم پاٹ دیتے ہیں، ہم لاد دیتے ہیں، ہم اس آدمی کو اس کے بوجھ کے نیچے دبا دیتے ہیں، ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَؤُلَآءِ﴾ کے معنی، قرآن مجید کے اس لفظ کی طاقت کو سمجھئے اور آپ چونکہ عربی کے طالب علم ہیں، آپ کو بلاغت پڑھنی ہے، اور چونکہ آپ کو ادب کا، الفاظ کی اداشناسی اور الفاظ کی مزاج دانی، ایک تو الفاظ کے معنی سمجھنا ہے، اور آپ کو تو الفاظ کا مزاج داں بننا ہے، اور خاص طور سے ہمارے دارالعلوم کی یہ روایت ہے، اس لیے آپ سے کہتا ہوں: ﴿وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ [(۱)] اس کے معنی یہ نہیں ہیں، اگر چہ ہمارے بہت سے مترجمین جنھوں نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، وہ اردو عربی کا مشترک لفظ ہے، وہ غالب آگیا، انھوں نے مدد سے ترجمہ کر دیا، ﴿وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ کے معنی ہیں: ہم نے بھر بھر کر دیا، ہم نے ریل پیل کر دیا، تو ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَؤُلَآءِ وَهَؤُلَآءِ﴾ ہم ریل پیل کر دیتے ہیں، ہم بھر دیتے ہیں، ہم اتنا دیتے ہیں کہ جیسے آدمی کچل جائے کسی بوجھ کے نیچے۔

تمہارے رب کے یہاں راشننگ نہیں

پوری انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے خزانۂ غیب میں کوئی کمی نہیں، اسی لیے فرمادیا آخر میں ﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ [(۲)]، تمہارے رب کے یہاں راشننگ نہیں ہے، یعنی اس آیت کا ترجمہ میں یہ کروں کہ تمہارے رب کے یہاں راشننگ نہیں ہے، اس کے یہاں اس کا کوئی کوٹہ مقرر نہیں ہے کہ بس اتنا دے دیا، کہ اتنی شکر

(۱) سورة الإسراء:٦ ، (۲) سورة الإسراء: ٢٠

ملا کرے گی فی کس اور اتنا غلہ ملا کرے گا، جیسے آج کل راشن کا دور ہے، اور جیسے راشن سے چیز بٹنے لگتی ہے تو یہ نہیں ہے کہ مثلاً اگر ہم کسی ایک کو ایک کتاب کا علم دے دیں، تھوڑا عربی کا علم دے دیں، یا تھوڑا سا کسی فن کا علم دے دیں، تو بس اب گویا راشن اس کو مل گیا، گویا راتب اس کو مل گیا، اب اس سے زیادہ کا وہ حوصلہ نہ کرے، نہیں! ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ﴾ اندر طلب صادق ہے، اور تم حوصلے رکھتے ہو، هَلْ مِنْ مَزِيدٍ، هَلْ مِنْ مَزِيدٍ کہتے ہو، تم اور جلدی سیر نہیں ہوتے، جلدی بس نہیں کرتے، تو ہماری طرف سے ہمارے خزانے میں کوئی کمی نہیں، ہم نے حجۃ الاسلام امام غزالی کو جو علم دیا، امام رازی کو جو علم دیا، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو جو علم دیا، اور امام بخاری کو جو حافظہ دیا، اور امام شافعی کو جو ذہانت دی، اور ابو علی قاری کو جو نحو کا علم دیا، اور فلاں کو جو تفسیر کا علم دیا، اور امام ابو حنیفہ اور ائمۂ اربعہ کو جو اجتہاد کا ملکہ عطا فرمایا، استنباط اور مسائل کا ملکہ عطا فرمایا، تو اب تمہاری ہمتوں کا معاملہ ہے، تمہاری محنتوں کا معاملہ ہے، جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ان لوگوں کو حافظہ دے کر، علم دے کر، ذہانت دے کر، مقام اجتہاد دے کر ہمارا خزانہ خالی نہیں ہوتا، ہمارا خزانہ اسی طرح سے بھرا ہوا ہے، اور جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ساری مخلوق اگر جمع ہو جائے میدان قیامت کی طرح اور وہاں ہر شخص اپنی منہ مانگی مانگے جو بڑے سے بڑا اس کا شوق، ارمان جسے کہتے ہیں، ارمان نکالے دل کا، اور ایک کہے: مجھے بادشاہی چاہیے، اور ایک کہے کہ مجھے تو شہنشاہی چاہیے، اور ایک کہے: مجھے ولایت چاہیے، اور ایک کہے: مجھے فلاں چیز چاہیے، تو ساری دنیا کی ساری مخلوق، آدم کی ساری اولاد ایک میدان میں کھڑی ہو کر ایک میدان میں ایک وقت میں مانگے اور خدا سب کو دے دے تو اللہ کے خزانے میں اتنی بھی کمی نہیں ہوتی کہ سمندر میں کوئی چڑیا چونچ ڈالے اور اس کی چونچ میں جو ذرا سا پانی، پانی نہیں بلکہ جو تری آجاتی ہے اس کی چونچ میں، اس سے اس سمندر کی روانی، اس کے پانی کی فراوانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ بھی شاید کچھ پڑتا ہو، لیکن اللہ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

یہ آیت اسی طرح ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہے، اور نوع انسانی کے لیے اتنی بڑی قوت محرکہ ہے کہ ہماری صلاحیتوں کے لیے، ہمارے رجحانات کے لیے، ہمارے انتخاب کے لیے،

ہمارے شوق و جذبہ کے لیے، اس سے بڑھ کر حرکت میں لانے والی کوئی دوسری چیز نہیں:
﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ﴾ ہم بھر بھر کر دیتے ہیں ان کو بھی اور اُن کو بھی ﴿مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ تمہارے رب کی دین میں، اس کی صفت جود وسخا میں، اس کے دینے کی قدرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کسی کے جام میں یا کسی کے کاسہ میں کوئی چیز ہے اور آپ اسے الٹ دیں تو وہ کاسہ خالی ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات اس کے صفات کی طرح ازلی ہیں، یہ علم کلام کا مشہور مسئلہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ ازلی ابدی ہے، قدیم ہے، اس کی صفات بھی ازلی ابدی ہیں، لیکن ہمارے دل میں یہ چور ہے کہ رہ رہ کر ہمیں یہ خیال ستاتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہو سکتا ہے؟ جہاں تک اسلاف کرام کے ادب کا تعلق ہے، میں شاید آپ سے بھی آگے ہوں، میرے دل میں ان کا جو مقام ہے، چاہے ائمۂ اربعہ ہوں، چاہے محدثین عظام ہوں، چاہے صوفیائے کرام ہوں، اس تک شاید آپ میں سے کسی کی رسائی نہ ہو، جہاں تک ان کی عظمت کا تعلق ہے، تم سے میں بہت آگے ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ کیا معاملہ ہے، لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کی جود وسخا کا تعلق ہے، جہاں تک انسانی کوششوں کے نتائج کا تعلق ہے، اس میں کوئی حرج، گناہ اور بے ادبی نہیں سمجھتا کہ میں تم سے یہ کہوں کہ اللہ تعالیٰ کا خزانہ اسی طرح بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے (هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ) ہے کوئی سائل کہ اسے عطا کیا جائے!' ایک حقیقت ہے، حدیث میں آتا ہے کہ آخر شب اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی ہوتی ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ اسے عطا کیا جائے، اس نداء میں رزق کا محدود مفہوم نہیں، بلکہ ہر طرح کا سوال جس میں کسی قسم کی تحدید نہیں، ہمارے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا ہو سکتا ہے؟ وہ علم والے اور اہل کمال سب لوٹ لے گئے، کیا کسی انسان کا باغ تھا جو لوٹ لے گئے؟ کوئی غلہ کا ذخیرہ تھا جو لٹ گیا؟ اللہ تعالیٰ خود ہی لٹاتا ہے، کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا۔

حوصلہ تازہ ہونا چاہیے

اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر جس طرح ہمیں یقین ہے، اسی طرح اس کی ذات پر بھی یقین

ہونا چاہیے، ان کتابوں کو پڑھ کر ہمارا یقین، ہمارا ایمان، ہمارا حوصلہ تازہ ہونا چاہیے کہ جو مالک ماضی میں ہمارے اسلاف کو دیتا تھا، وہ اس زمانہ میں ایسے بڑے عالم پیدا کرسکتا تھا، وہ اب بھی پیدا کرسکتا ہے۔

آج بھی اللہ تعالیٰ اپنی ان ہی صفات کے ساتھ ہے، ہم اور آپ بدل گئے، میں تو زمانہ کے بھی بدلنے کا قائل نہیں، ہم اور آپ بدل گئے، ہم اور آپ لینا نہیں چاہتے، ہمتیں پست ہوگئی ہیں، ہم نے اپنی ترقی اور محنت کا میدان بہت محدود اختیار کیا ہے، جس میدان کو منتخب کرو گے اللہ تعالیٰ اس میں مدد فرمائے گا، اگر ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ دھکے کھا کر اور اس زمانہ کے دستور کے غلام بن کر کچھ حاصل کرنا ہے تو ہم کو وہی لمبا راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو دوسروں کی محتاجی کی طرف لے جاتا ہے، جس طرح قوم سبا کا حال تھا، قوم سبا کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کیا تھا کہ وہ یمن سے چلتے تھے اور شام پہنچ جاتے تھے، اور راستہ بھر باغ ہی باغ، چمن ہی چمن، ان کو جنگل وصحرا کی گرم ہوا اور کانٹوں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا تھا، شیطان نے ان پر حملہ کیا اور انھوں نے کہا: ﴿رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا﴾ [(۱)] 'اے پروردگار! ہمارے سفروں کو ویسا ہی بنا دیجیے' تو خدا نے سارے چمن کو ختم کردیا، اور پھر انہیں خارزار اور صحراؤں سے واسطہ پڑا۔

آپ سیاست کے میدان میں، الیکشن کے میدان میں دیکھیے، اس کا موسم عنقریب یہاں آنے والا ہے، لوگ اس میں کس طرح کھانا پینا بھول جاتے ہیں، اپنی نیند حرام کرلیتے ہیں، کس طرح ان میں طاقت برداشت پیدا ہوجاتی ہے، جو ہمیں بڑے بڑے زاہدوں کے یہاں نظر نہیں آتی، ایک ایک آدمی الیکشن سے دلچسپی رکھنے والا اپنے مقصد میں فنا ہوجاتا ہے، دیوانہ ہوجاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، کھانے پینے اور آرام کی فکر سے بے نیاز مارا مارا پھرنا، گالیاں سننا، کئی پشتوں تک تبرا ہوتا ہے اور چار چار آٹھ آٹھ پشتوں کو معاف نہیں کیا جاتا، مگر الیکشن کے امیدوار صاحب ہنسی خوشی اس کو سنتے ہیں کہ قوت برداشت، بے نفسی کی ایک مثال قائم ہوجاتی ہے، مگر جب مقصد کا غلبہ ہوجاتا ہے تو یہ سب چیزیں آسان بن جاتی ہیں، عہدہ

---

(۱) سورۃ سبا: ۱۹

اور کرسی نے وہ وہ کمالات دکھائے جو اولیائے بےنفس کا شعار رہتے ہیں، مقاصد کا فرق ہے، مگر بات وہی ہے کہ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس میں ڈوب جانا اور ہر قسم کی مشقتوں کو برداشت کرنا۔

علم کے کمالات بھی لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں، جو لوگ کسی سائنسی ایجادات میں، کسی لیبورٹری میں، تجربہ گاہ میں کام کرتے ہیں، تو ان کے واقعات کا آپ کو یقین نہ آئے کہ آدمی کھانا پینا بھول سکتا ہے، ان کو یہ پتہ نہیں رہتا کہ سورج کہاں سے نکلا اور کہاں ڈوبا؟ صبح کب ہوئی اور شام کب آئی؟ گھر میں بچے کی لاش پڑی ہوتی ہے اور سائنس کا تحقیق کرنے والا اپنے کام میں منہمک ہے۔

یہی انہماک شطرنج کھیلنے والوں تک میں آپ پائیں گے، گھر سے بار بار اطلاع آتی ہے کہ بچہ بیمار ہے، کسی حکیم یا ڈاکٹر کو بلوایئے، مگر جواب ملتا ہے کہ ذرا ایک بازی اور ہو جائے، پھر خبر آئی کہ بچے کا انتقال ہو گیا اور یہ شطرنج کی چالوں میں بدستور غرق رہے۔

انسان کا استغراق اور انہماک

جہاں تک انسان کے استغراق کا اور انہماک کا تعلق ہے، جہاں تک انسان کے اپنے مقصد کے پیچھے مجنوں بننے کا تعلق ہے، آپ کو ہر طبقہ میں اس کے واقعات ملیں گے۔

یورپ اور امریکہ کے لوگ جنہوں نے بجلی، ریڈیو، ریل گاڑی، ٹیلیفون اور دنیا بھر کی نئی چیزیں ایجاد کیں، نظریۂ اضافیت اور ایٹمک انرجی کو دریافت کیا، آئن اسٹائن وغیرہ ان کے اگر آپ دماغی استغراق اور جسمانی انہماک اور مجاہدے کے واقعات اپنے میدان میں پڑھیں یا سنیں، آپ کو یقین کرنا مشکل ہو جائے، آپ ان واقعات کو انسانوں کے نہیں بلکہ جناتوں کے قصے کہیں، اسی طریقہ سے جس میدان کو انسان انتخاب کرے، اور اس کو اپنی محنت کا مرکز بنائے، اور اپنی توجہ مرکوز کرے، اور پھر کوشش شروع کرے، تو محیر العقول نتائج ظاہر ہوں گے، یہ سنت اللہ ہے۔

اولیائے کرام کے آپ حالات پڑھیں تو ان کے اپنے نفس پر قابو پانے کے واقعات ہمارے ناقص فہم میں آنا مشکل ہوجاتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے متعلق آتا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے رہے، آدمی کی آنکھ نہ جھپکے اور اتنی بھی نیند نہ آئے کہ اس کا وضو جاتا رہے، یہی ایک واقعہ ایسا ہے کہ جوز بردست مجاہدہ کا طالب ہے، متعدد اہل اللہ کے ایسے واقعات ہیں، اوران میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، ہمیں اس پر پورا یقین ہونا چاہیے، مادی میدانوں میں کوشش کرنے والوں کا استغراق و انہماک نا قابل فہم اور نا قابل یقین حد تک ہوتا ہے، تو یہ تو اولیاء اللہ تھے۔

اب میں آپ سے کہتا ہوں، ببانگ دہل کہتا ہوں، اور ہر جگہ اعلان کرنے کے لیے تیار ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ اب بھی مدد کرنے کے لیے تیار ہے، مدد نہیں امداد عربی معنوں میں، اللہ تعالیٰ اب بھی جھولی بھر دینے کے لیے، مالا مال کر دینے کے لیے تیار ہے، اس کا اعلان ہے اور اب بھی اس کی یہ سنت جاری ہے، صرف ہمارے اور آپ کی طرف سے یہ کمی ہے۔

مغرب کی ترقی کا راز

آج مادیت کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اعلیٰ صلاحیت اور ذہانت کے مالک انسان پورے انہماک اور لگن کے ساتھ اس میدان میں لگے ہوئے ہیں، آج مغربی علوم، سائنس، ٹیکنالوجی کی ترقی اور یورپ کی سیادت کا راز کیا ہے؟ آج مغربی زبانوں کی ترقی کا راز کیا ہے؟ کیا اس کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ التفات اپنے پیغمبروں اوران اولیاء اللہ کی اولاد سے پھر گئی جنھوں نے فاقہ کرکر کے علم کی خدمت کی، لوگوں کو جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے پر ڈالا، دوسروں کے لیے اپنی رات کی نیند حرام کی، پیٹ پر پتھر باندھے، دنیا کی کسی نعمت کا مزہ نہیں چکھا؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں اور پشتوں پر اتنا ناراض ہوا؟ کیا ان اولیاء اللہ کو ان کی محنتوں کا یہ صلہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پشتوں کو محروم کر دیا اور یورپ پر اللہ تعالیٰ کی ایسی نظر عنایت ہوئی، حالانکہ کون سا کام یورپ نے اچھا کیا؟ کیا یورپ کے اعمال ان ہی نعمتوں

کے مستحق ہیں؟ یورپ کے لوگ جو آج تمام دنیا پر چھائے ہوئے ہیں، کیا ان کے بزرگ بڑے عابد و زاہد تھے؟ ولی اللہ تھے؟ ذرا ''تاریخ اخلاق یورپ'' پڑھیے، ڈریپر کی کتاب ''معرکۂ مذہب و سائنس'' پڑھیے، دوسروں کا تو کیا ذکر ہے جو خدا کا نام تک نہیں جانتے تھے، جو مذہب کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے تھے ان کے اعمال کو دیکھیے، کلیسا کے نمائندوں کے مظالم کو آپ پڑھیے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا یہ اعمال اللہ تعالیٰ کو اتنے پسند تھے کہ علم و سیادت، حکومت و شوکت سب ان ہی کو دے دیا؟ اور ہمارے اعمال اتنے خراب تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو غلام بنا دیا، ہم میں انحطاط ہے، ہمارے سماجی، تعلیمی، سیاسی نظام میں زوال ہے، اور کوئی جرجانی، غزالی، رازی نہیں پیدا ہوتا، وہاں نہ معلوم کتنے اڈیسن (Addison) اور آئن اسٹائن (Einstein) اور نیوٹن (Newton)، بیکن (Bacon) اور ہر فن کے مجتہد اور صاحب کمال پیدا ہو رہے ہیں۔

بتاؤ؟ یہ پہیلی بوجھو، وہ قوم جو عیسائی ہے بلکہ حقیقی عیسائی بھی نہیں، جو دو دو عالمی لڑائیاں لڑ چکے ہیں اور ساری دنیا کو ختم کرنے کے درپے ہیں، دنیا کے ہر گناہ اور غلط فعل میں یہ مبتلا ہیں، قوموں کو لوٹنے والے، ملکوں کو غلام بنانے والے، عرب اسرائیل کا واقعہ دیکھو، اس سے بڑھ کر کوئی آنکھوں میں خاک جھونکنے اور زبردستی کرنے کی کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟ اور یہ قومیں سینکڑوں برس سے یہی کرتی آئی ہیں، پھر کیا بات ہے کہ وہ ترقی کر رہے ہیں؟ کیا بات ہے کہ ان کی زبان سے جو نکلتا ہے، ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہے؟ کیا بات ہے کہ ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے؟ کیا بات ہے کہ سائنسداں اور اہل کمال کے پیدا ہونے کا سلسلہ وہاں ختم نہیں ہوتا؟ نہ امریکہ میں ایجادوں کا سلسلہ بند، نہ روس میں ایجادوں کا سلسلہ ختم، روز افزوں ترقی ہے، اس سے ہمارے بعض نادان دوستوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے مقبول بندے ہیں، اس پر ایک صاحب نے کتاب بھی لکھی، ہمیں تو نہ ان کے بزرگوں کے اعمال اچھے معلوم ہوتے ہیں، نہ ان کے اعمال پسندیدہ ہیں، ہم نے یورپ جا کر انہیں دیکھا کہ کتنا شراب پیتے ہیں، بدمست رہتے ہیں، ظلم کرتے ہیں، اور کتنے خدا سے غافل ہیں، پھر

بھی ان کی ہر چیز ترقی کر رہی ہے اور ہماری ہر چیز مرجھا رہی ہے، سوکھ رہی ہے، ہماری اخلاقیات، سیاسیات، تعلیمات، سب روبہ زوال ہیں، ہمارے تمدن وتہذیب انحطاط پذیر، ہمارے کس شعبہ میں ترقی ہے؟ مصروشام اور سعودی عرب کہیں بھی ترقی کا نام ونشان نہیں، کس چیز نے کس میدان میں ترقی کی؟

پہیلی بوجھو، اگر وقت ہوتا، ہم کہتے چار دن کی مہلت، مگر ہمیں تو خود ہی فرصت نہیں، ہم پہیلی بھی آپ کے سامنے رکھتے ہیں اور بوجھ کر بھی دیتے ہیں۔

محنت کا پھل ضرور ملے گا

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ازلی ہے جو محنت کرے گا، جو کوشش کرے گا، جو بھی کسی چیز پر توجہ مرکوز کردے گا، ہم اسے اس کا پھل ضرور دیں گے، اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ وہ اچھی یا بری، کوشش ہوگی، ہم اس کا پھل دیں گے، ببول کا درخت پھلے پھولے گا، کانٹے پیدا ہوں گے، سیب کا درخت سیب کے پھل دے گا، اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم سیب لگاتے ہو کہ ببول لگاتے ہو، ہمارا قانون یہ ہے کہ جس چیز کا درخت لگاؤ گے، زمین مدد کرے گی، بادلوں کو حکم ہے، پانی کو حکم ہے کہ وہ اس کی نشو ونما میں مدد کرے۔

یورپ آج کوشش کررہا ہے، سائنس میں، علوم وفنون میں، سیاسی اور اقتصادی فلسفوں کو بنانے میں، پھیلانے میں، اور ان کا پرچار کرنے میں یورپ کوشش کررہا ہے، لسانیات میں، ادبیات میں، اقتصادیات میں، آج نہیں سینکڑوں برس پہلے ہماری جب کوشش تھی تو اس نے تاریخ عالم پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مجدد الف ثانیؒ اور مشائخ چشت کے حالات پڑھو تو معارف وحقائق کے جو موتی ہیں، ان سے آدمی سکتے میں رہ جائے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے کتاب کھولی اور کہا کہ اب ہضم نہیں ہوتا، دماغ جواب دے دیتا ہے، انسان ایسے باریک نکتوں تک پہنچ سکتا ہے، ایسے نفس انسانی کی معرفت، ایسے معارف وحقائق، ایسے کمزوریوں کی پہچان، اللہ تعالیٰ کی یاد کی ایسی لذت، ایسا استغراق!!

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ ان حضرات نے اس پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی، اور اس کے لیے جو صلاحیتیں انھیں دی تھیں، وہ استعمال کیں، ہمارے جیسے انسان تھے مگر ان بلندیوں تک پہنچے، بزرگان دین کے اخلاقی واقعات کو پڑھیے، ذہن کام نہیں کرتا۔

اخلاقی بلندی کا ایک واقعہ سن لیجیے، ایک مسافر ایک مسجد میں آیا، وہ اپنے ساتھ ایک تھیلی بھی لایا جیسے مسافروں کے پاس اس زمانہ میں ہوا کرتی تھی، نماز پڑھنے لگا، کسی نے اس کی تھیلی اڑا دی، اس مسجد میں یہ مسافر تھا اور ایک بزرگ تھے، تیسرا کوئی شخص نہیں تھا، اس کو یہ شبہ ہوا کہ یہاں بجز ان صاحب کے اور کوئی نہیں، میری تھیلی انھوں نے ہی چرائی ہے، بس آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور انھیں بے تحاشا مارنے لگا، بہت ہی زدوکوب کیا، اتنے میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ بزرگ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جارہا ہے، وہ بڑے پائے کے بزرگ تھے، لوگ دوڑے، بیچ بچاؤ کیا اور اس مسافر پر ناراض ہوئے، اب اس مسافر کو محسوس ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی اور وہ ان بزرگ کے قدموں پر گر گیا اور کہا کہ حضرت! مجھ سے بڑا قصور ہوا، میں شبہ میں آپ سے گستاخی کر گیا، تو ان بزرگ نے جواب میں کہا کہ بھئی! معافی مانگنے کا کیا سوال، جتنی مرتبہ تم مجھے مارتے تھے میرے دل سے یہ دعا نکلتی تھی کہ خدایا! میں جنت میں اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک یہ بندہ جنت میں نہ جائے، تم مار رہے تھے اور میں تمہارے لیے دعا میں مشغول تھا، ایسے صدہا واقعات تم کو ملیں گے۔

کانٹوں کے ساتھ کانٹوں کا اضافہ دنیا بھر میں کانٹے بھر دے گا، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ ''سیدھوں کے ساتھ سیدھے اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھے''۔

جس صنف میں تلاش کیجیے ہمارے بزرگوں کی بلندی کے نشانات ملیں گے، ان کی اخلاقی بلندی، عالی ظرفی، مکارم اخلاق، ان کے اخلاق کی باریکیاں اپنی مثال آپ ہیں۔

اب علم کے میدان میں دیکھیے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا علم، ان کے واقعات پڑھ کر آدمی انہیں افسانہ سمجھتا ہے، امام بخاریؒ کے حافظہ کی روایات دیکھو جن کے حافظہ کی مثال نہیں ملتی، ان کے حافظہ کا مشہور واقعہ وہ ہے جو بغداد میں پیش آیا، اور جن کو تم نے کتابوں میں پڑھا

ہوگا، کتنے ہی آدمیوں نے حدیث کے متن وسند میں گڈ مڈ کر کے حدیثیں پڑھیں اور امام بخاریؒ نے ان سب کی تصحیح صرف اپنے حافظہ کی مدد سے کی۔ ''علمائے سلف'' یہ کتاب آپ پڑھیں تو ہمارے اسلاف کے علمی ذوق، ذہانت وقوت حافظہ کے سینکڑوں واقعات آپ کو ملیں گے، ابن جوزیؒ کی مجلس وعظ میں مختلف قسم کے سینکڑوں سوالات آتے، اور وہ ایک ایک پرچہ کے جواب شافی دیتے، یہ سب اس آیت کی تفسیر ہے کہ ﴿كُلًّا نُمِدُّ هَـٰؤُلَاءِ وَهَـٰؤُلَاءِ﴾ [1] جو جو کچھ بھی اللہ سے مانگے گا، اللہ تعالیٰ اسے دے گا، بس مانگنے کی ہمت اور حوصلہ کا معاملہ ہے۔

اس امت نے جس میدان کو اختیار کیا، اس میں کمال حاصل کیا، میدان جہاد ہو یا گوشۂ علم وتحقیق، ہر جگہ انھوں نے امتیاز پیدا کیا، جہاد کی ہوا چلی تو ایسے واقعات ان سے رونما ہوئے کہ زندگی کا اتنا شوق نہیں رہا جتنا موت کا شوق غلبہ پا گیا۔

زہد وعبادت کا معاملہ لیجئے، بادشاہوں سے استغناء کا معاملہ لیجیے، ایک سے ایک بڑھ کر واقعہ آپ کو تاریخ میں ملے گا، علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاء سے ملاقات کرنی چاہی، حضرت نے جواباً فرمایا کہ میرے دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔ ابھی قریب کے زمانہ میں بھی ایسے مستغنی لوگ گزرے ہیں۔

علم وفن کے میدان میں اگر انھوں نے حدیث، تفسیر، فقہ کو اپنی محنت وجد جہد کا مرکز وموضوع بنایا، تو ان علوم کو آسمان تک پہنچا دیا، دیکھ لو اپنے ندوہ کا کتب خانہ، دیکھو تفسیر میں کتنی کتابیں ہیں ہمارے علماء کی، حدیث میں تو اتنے تنوع وتفنن سے کام لیا ہے کہ جس کا اعتراف مستشرقین کو بھی ہے۔

پھر سیرت کو لیجیے، اس امت نے ان میدانوں کی طرف رخ کیا تو وہاں تک پہنچ گئے جہاں تک انسان کا ذہن نہیں پہنچتا، اور یورپ جب مادیات کے میدان میں کوشاں ہوا تو

---

(۱) سورة الإسراء: ۲۰

وہاں تک پہنچا کہ ہمارے آپ کے سمجھ میں آنے والی بات نہیں رہی۔

یہ مقبولیت اور نامقبولیت کا معاملہ نہیں، بلکہ محنت وجدوجہد اور توجہ ویکسوئی کا مسئلہ ہے، آج ہمارے مدارس سے امام غزالی اور امام رازی کیوں نہیں پیدا ہور ہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ اب بھی قادر ہے کہ اس سطح کے اہل کمال پیدا کرے۔

سات کروڑ کی ملت، بلکہ ایک صاحب کی تحقیق تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ۱۷ کروڑ ہیں، اتنی بڑی ملت اور یہاں کی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے! ہمارے بزرگ مقناطیس کی طرح مسلم اور غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچتے تھے، ابھی ترانے میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا نام لیا گیا، جن کے خلفاء اور متسبین ہی کا قائم کردہ یہ دار العلوم ندوۃ العلماء ہے، ان کی خدمت میں لفٹنٹ گورنر اور سر آسمان جاہ چلے آرہے ہیں جو حیدرآباد کے امیر الامراء تھے، ان کی آمد کے موقع پر کانپور سے اناؤ تک ایک تہلکہ مچا تھا، مگر حضرت کی خانقاہ میں اس کا کوئی ذکر اور آمد کی اہمیت نہیں تھی، یہ نمونے ابھی ہم نے دیکھے، ان لوگوں نے آخرت کو، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور کبریائی کو اپنے سامنے رکھا، اور اس میدان میں محنت ومجاہدہ کیا، تو اس مقام تک پہنچے۔

اب کیوں ایسے ممتاز افراد علم، روحانیت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہیں پیدا ہورہے ہیں، جب کہ یہ دین ابدی اور یہ آخری امت ہے؟

صرف یہ وجہ ہے کہ ہم کو آپ کو شوق نہیں رہا، ہماری ہمتیں اور کوششیں چھوٹی چھوٹی حقیر چیزوں میں صرف ہورہی ہیں، ہمارے تعلیمی نظام میں بڑا انحطاط ہوگیا، آج ہندوستان میں لاکھوں علم دین کے طالب علم ہیں، مگر کوئی ماہر فن اور عبقری پیدا نہیں ہورہا ہے، اس میں قصور صرف ہمارا ہے کہ ہماری ہمتیں بلند نہیں، ہم اللہ سے مانگتے نہیں، ہم کوشش نہیں کرتے، اگر تم کوشش وجدوجہد کروگے تو تمہارے اندر بھی مقابلے اور مسابقت کا وہی جذبہ پیدا ہوگا جیسا کہ یورپ میں آج ہے۔

یورپ میں ہزاروں افراد، علمی ادارے، یونیورسٹیاں جدوجہد میں لگی ہیں، جرمن قوم کا

یہ حال کہ اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے کو کتنا سنبھالا اور بنالیا۔

اخلاص واختصاص

اخلاص اور اختصاص یہ دو کنجیاں ہیں، اللہ کے ساتھ اخلاص کا معاملہ اور علم کے ساتھ اختصاص کا معاملہ، اللہ کی رضا کے لیے ہم پڑھیں اور علم میں ہم امتیاز پیدا کریں۔

اب بھی علم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، فضل وکمالات کے دروازے کھلے ہیں، انسانی کوششوں کے نتائج اب بھی تیار کھڑے ہیں، جیسے گھنگھور گھٹا برسنے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتیں برسنے کے لیے تیار کھڑی ہیں، لیکن جب آپ ہی کے اندر پیاس نہ ہو تو بارش برسے اور ختم ہو، بادل آئیں اور چلے جائیں، ایک قطرہ بھی آپ کو نصیب نہ ہو، جو کچھ تغیر ہوا ہے وہ عالم میں نہیں ہمارے اندر ہوا ہے، دنیا نہیں بدلی، سنت اللہ نہیں بدلی، ہم بدل گئے، آج شوق پیدا ہو جائے تو ہر فن کا عالم اور ہر فن کا امام پیدا ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری ہمتوں کو بلند کرے، تمہارے اندر لعل و گہر ہیں، تمہارے اندر بڑے بڑے ذکی اور متبحر عالم تمہارے ان سادہ کپڑوں کے اندر مستور ہیں، مگر تم کو خبر نہیں، ہمت بلند کرو تو تمہارے اندر سے ایک نئی شخصیت برآمد ہوگی جو زمانہ کے لیے حیران کن ہوگی ؎

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
درسینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند[1]

---

(۱) رواق سلیمانی، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں طلبہ کے سامنے ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء میں نئے تعلیمی سال کے آغاز پر کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا محمد معاذ اندوری ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ، (شمارہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۷۳ء)۔

عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ

میرے عزیز بھائیو!

میں اس مرتبہ ایک طویل وقفہ کے بعد آپ کے سامنے کچھ کہنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں، یہ طویل وقفہ اپنے حساب، ماہ و سال کے حساب اور ساعت و گھڑیوں کے حساب سے اتنا طویل نہیں ہے، لیکن واقعات وحوادث کے لحاظ سے اور تغیرات وانقلابات کے پیمانے سے بہت طویل ہے، اس وقفہ میں ہمارے ملک میں اور ہمارے ملک سے باہر، ہمارے وسیع تر وطن میں یعنی دنیائے اسلام میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، جو اہم واقعات پیش آئے، ان تبدیلیوں کا اور حوادث و واقعات کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے دنیائے اسلام کے متعلق کچھ کہوں۔

اور اتفاق سے اس وقفے کے اندر مجھے دو سفر پیش آئے، گذشتہ گرمیوں میں جون کے مہینے میں میں نے ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے جو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے تیار کیا گیا تھا، افغانستان، ایران اور چار عرب ملکوں کی سیاحت کی، پھر اس کے بعد ابھی ماضی قریب میں، میں ایک دوسرے طویل سفر سے واپس آیا ہوں، مجھے رابطہ عالم اسلامی کے جلسے میں شرکت کے لیے اس کے مستقر مکہ معظّمہ جانے کا موقع ملا، اور یہ زمانہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ اسی زمانے میں یا میری حاضری سے کچھ پہلے مشرق وسطیٰ میں بہت بڑی جنگ پیش آئی تھی، جو عربوں کے حالات اور عربوں کے موجودہ نقشے کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی تھی، اور اس جنگ نے کہا جا سکتا ہے کہ ایک نئے دور کا آغاز کیا اور بہت سی ایسی چیزیں ابھر کر سامنے آئیں جو اس سے پہلے بہت دبی ہوئی تھیں، عربوں میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوا اور

انھوں نے اپنے یہاں تجربہ کیا اپنی صلاحیتوں کو دیانت داری اور سنجیدگی کے ساتھ استعمال کرنے اور ان کے نتائج کو دیکھنے کا، ایک مسلمان کی حیثیت سے اور تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جو اپنی قسمت کو عالم اسلام اور پھر عالم عربی سے وابستہ سمجھتا ہے، اور جس کے انجام پر اور جس کی عزت پر اور ذلت پر، اس کے اعتماد اور بے اعتمادی پر واقعات کا گہرا اثر پڑتا ہے، میرے لیے اس سفر میں بہت بڑے مطالعہ وغور وفکر کا سامان تھا، اوواس سے بہت اہم نتائج نکالے جاسکتے تھے، پھر حج کا متبرک زمانہ بھی اسی قیام کے زمانے میں آ گیا اور اس کی برکت سے عالم اسلام کی بڑی اہم شخصیتوں اور خاص طور پر مشرق وسطی اور پڑوسی ممالک مصر وشام کے بہت سے اہم اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا، معلومات میں اضافہ ہوا، نئے نقطۂ نظر سامنے آئے، بعض نئے حقائق بھی سامنے آئے، اور سب کا تقاضا ہے کہ میں ان میں سے کسی پہلو کے متعلق اظہار خیال کروں، اور آپ کو جو آپ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے ہیں اور آپ کے لیے دیکھنا بھی آپ کی اس مصروف زندگی میں مشکل ہے، میں ان حقیقتوں کو آپ کے سامنے لاؤں، آپ کا مجھ پر حق بھی ہے اور آپ سے بڑھ کر اس سے زیادہ کوئی موزوں اور مناسب مجمع نہیں ہوسکتا۔

اندرونی درد باہر کی دنیا میں

لیکن میں ان ساری چیزوں سے جس کو کہتے ہیں کہ آدمی چوٹ کھایا ہوا ہوتا ہے، یا کسی حقیقت کا غلبہ ہوتا ہے، تو اس کو ہر واقعے میں ہر منظر میں اپنی کام کی چیز نظر آتی ہے، اور وہ اپنے اندرونی درد کو باہر کی دنیا میں دیکھتا ہے، ایک عرب شاعر کو جو اپنے بھائی کے فراق کا داغ اٹھا چکا تھا، اور اس پر اس کا قلق اور اس کا طبعی صدمہ پورے طور پر غالب تھا، لوگوں نے اس پر ملامت کی کہ وہ ہر قبر کے پاس ٹھہرتا ہے اور وہاں اپنے آنسو بہاتا ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ سلسلہ تو بڑا دراز ہے، اور ہر قبر کا یہ حق کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ غمزدہ آدمی اس کے پاس ٹھہرے اور اپنے پرانے زخموں کو یاد کرے، اور اپنا غم تازہ کرے، تو اس نے کہا:

لَقَدْ لَامَنِيْ عِنْدَ الْقُبُوْرِ عَلَى الْبُكَا ۔۔۔ رَفِيْقِيْ لِتَذْرَافِ الدُّمُوْعِ السَّوَافِكِ

فَقَالَ أَتَبْكِيْ كُلَّ قَبْرٍ رَأَيْتَهُ ۔۔۔ لِقَبْرٍ ثَوَى بَيْنَ اللِّوَى فَالدَّكَادِكِ

فَقُلْتُ لَهُ إِنَّ الشَّجَا يَبْعَثُ الشَّجَا ۔۔۔ فَدَعْنِيْ فَهٰذَا كُلُّهُ قَبْرُ مَالِكِ

(میرے دوست نے مجھے ہر قبر کے پاس مسلسل آنسو بہانے اور رونے پر ملامت کی، تو اس نے کہا کہ کیا تو اس قبر کی وجہ سے جو مقام لوی اور دکادک کے درمیان ہے، ہر اس قبر پر روئے گا جس کو کہ دیکھے؟ میں نے اس سے کہا کہ غم غم کو ابھارتا ہے، بس تو مجھے چھوڑ دے، یہ سب مالک کی قبریں ہیں۔)

یہ متمم بن نویرہ کے اشعار ہیں، جو اس نے مالک بن نویرہ کے مرثیہ میں کہے، اور اس میں ایک بڑی حقیقت کی ترجمانی کی ہے، ایک عالمی حقیقت، ایک ابدی حقیقت، ایک عالمگیر حقیقت، بعض مرتبہ شعراء اپنے محدود دائرے کے اندر اور محدود تر واقعات کے اثر سے بعض عالمگیر حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جب چوٹ ابھر آتی ہے، ہر وہ چیز کہ جو اس داغ کو تازہ کرے اور زخم کو ذرا سا بھی چھیڑ دے، اس سے اس زخم کی کسک پیدا ہو جاتی ہے۔

عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ

ایک ادارے کے خادم ہونے کی حیثیت سے اور عالم اسلام میں اس وقت جو زوال رونما ہے، انسانی زوال، انسانی صفات کا زوال، انسانی طاقتوں کا زوال، فکر صحیح، ایمان قوی، اور انسانی بلندی کا زوال، یہ زوال ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے جو تمام حقیقتوں پر غالب ہے، اور وہ شخص جس نے زوال کا تجربہ کیا ہے اور وہ جو اس زوال سے پورے طور پر آشنا ہے، ہر چیز کی توجیہ اسی سے کرے گا، ہم اور آپ دن رات تجربہ کرتے ہیں، اگر کوئی شخص جس پر کوئی حقیقت مستولی ہو جائے اور اس کا جزو ایمان بن جائے، اور وہ سمجھے کہ حقیقی مرض یہ ہے، اس کو ہر جگہ وہی مرض نظر آئے گا، آپ نے سنا ہوگا کہ کسی بھوکے سے پوچھا گیا کہ دو دو کتنے ہوتے ہیں؟ تو اس نے کہا: چار روٹی، اس کے نزدیک معدہ کی حقیقت ہی یہی تھی، اس کے نزدیک سب

سے بڑی حقیقت روٹی تھی، تو عدد کا مصداق اس کے نزدیک اس حقیقت سے زیادہ کوئی نہیں تھا کہ جو اس کے ذہن و دماغ پر مستولی اور اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست تھی، تو مجھے ان سارے واقعات میں خواہ سیاسی ہوں، تمدنی ہوں، خواہ علمی و فکری ہوں، سب میں اس زوال کی پرچھائیاں نہیں بلکہ اس زوال کا چہرہ نظر آیا، تابناک چہرہ، بالکل درخشاں چہرہ نظر آیا، اور ہر واقعہ سے مجھے یہ پیام ملا کہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ان انسانوں کا فقدان ہے جو طاقتور ایمان رکھتے ہوں، علم صحیح کی دولت سے مالا مال ہوں، اور جن کے اندر دینی استقامت ہو، اور جن کی نگاہ بلند ہو، سخن دلنواز ہو اور جاں پر سوز ہو۔

جاں باز ملاح مفقود

یہ عالم اسلام کی اس وقت سب سے بڑی حقیقت ہے، اور یہ حقیقت جو شخص اگر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لے پھر وہ اپنے دماغ اور آنکھوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا، اس سے آپ کچھ بھی کہلوائیے، کوئی بھی موضوع ہو، کہیں سے واپس آیا ہو، بیت اللہ کے طواف سے واپس آیا ہو، یا مسجد نبویؐ کی زیارت سے واپس آیا ہو، علماء کی کسی مجلس سے واپس آیا ہو، یا کسی سیاسی مؤتمر سے واپس آیا ہو، اس نے اخبار پڑھا ہو، یا تاریخ کی کوئی کتاب پڑھی ہو، یا کوئی داستان پڑھی ہو، یا کوئی ادبی شاہکار پڑھا ہو، اس پر یہ حقیقت پورے طور پر غالب رہے گی، جب بولے گا تو اسی کی زبان سے، اور جب دیکھے گا تو اسی کی آنکھ سے، اس وقت پورے عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ قیادت تو بڑی چیز ہے، موجودہ حالات سے آنکھیں ملانے والے، موجودہ حالات کے چیلنج کو قبول کرنے والے، اور اس دھارے کے خلاف چلنے والے، یا کشتی چلانے والے تو بڑی چیز ہے، ہاتھ پیر مارنے والے بھی ناپید ہیں، ایسے جانباز ملاح آج عالم اسلام میں مفقود ہیں، جیسے کسی زمانے میں لوگ عنقا کی مثال دیا کرتے تھے، پتہ نہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس کا کہیں وجود ہے یا نہیں؟ لغت میں لکھا ہے: معروف الاسم مجہول الجسم، اس سے بہتر اس کی تعریف نہیں ہو سکتی، لیکن آج کا سب سے بڑا عنقا جو ہے وہ وہ مسلمان ہیں جو ان حالات سے شکست نہ کھائیں، شکست ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، اور وہ "آہنگ

میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن‘‘ جس کو اقبالؒ نے کہا ہے، جیسے سورہ رحمٰن میں ہر چیز میں تنوع ہے، اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں گناتا ہے، لیکن اس کے بعد کہتا ہے: ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ (۱)، شواہد میں کتنا تنوع ہو، دلائل میں کتنا تنوع ہو، لیکن نتیجہ ایک ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ (تم اللہ تعالیٰ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟) تو وہ جو اپنے آہنگ میں یکتا ہو، اپنے رنگ میں بھی یکتا ہو، اس مسلمان کی نایابی، اس مسلمان کا فقدان، اس مسلمان کا عنقا صفت ہو جانا یہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اسلام کا قلعہ عیسائیت اور یہودیت نے فتح کرلیا

میرے عزیزو! میں آپ کے سامنے بہت سے وہ حالات سنا سکتا تھا، آپ کے دلچسپی کے بھی اور اپنی تسلی کے بھی، میں آپ کو مصر و شام کی داستان سنا سکتا تھا، میں آپ کو عالم تصور میں حجاز کی گلیوں، مکہ و مدینے کی گلیوں میں لے جا سکتا تھا، میں آپ کو عالم تصور میں بیت اللہ کا طواف بھی کرا سکتا تھا، میں آپ کو حرم نبویؐ سے بلند ہونے والی اذان جس پر ہزاروں بلبلوں کی صدائیں اور ہزاروں نقاروں کی بلند آہنگیاں قربان، وہ تک میں آپ کے کانوں تک پہنچا سکتا تھا، بار بار دیکھا، بار بار سنا، جسم و جان میں سب چیزیں پیوست ہوگئیں، اور ایمان کا بھی، عقیدے کا بھی، جذبات کا بھی جزو بن گئی، یہ سب میرے لیے آسان تھا، میں آپ کو سفرنامہ سنا سکتا تھا، اور اقبالؒ نے تو کہا ہے ؎

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیلؑ
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

واقعہ یہ ہے، سب کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ اسلام کا قلعہ عیسائیت نے اور یہودیت

---

(۱) سورۃ الرحمٰن

نے فتح کر لیا، اور اس لیے فتح کیا کہ اس قلعے میں قطعاً کوئی کمزوری نہیں، اس قلعے کی دیواریں آہنی، اس قلعے میں وہی میگزین موجود جو پہلے تھے بلکہ اس سے زیادہ، لیکن صرف یہ کہ وہ غیور مسلمان نہیں رہا، وہ اس کا پاسباں نہیں رہا، وہ صفات واخلاق اور وہ علم صحیح اور سیرت میں پختگی و کردار کی مضبوطی اور استقامت نہیں رہی، تو مجھے سب جگہ، میں زیادہ واضح الفاظ میں کہوں، مجھے سب جگہ ندوہ نظر آیا، مجھے سب جگہ ہندوستان نظر آیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ آدمی نہیں

کوئی مسئلہ نہیں عالم اسلام میں، نہ پاکستان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ مصر کا کوئی مسئلہ ہے، نہ شام کا کوئی مسئلہ ہے، نہ سعودی عرب کا کوئی مسئلہ ہے، نہ سوڈان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ ہندوستان کا کوئی مسئلہ ہے، نہ کوئی مشکل (Problem) ہے، نہ کوئی ایسا معمہ ہے، نہ کوئی ایسی گتھی ہے، نہ کوئی چیستاں ہے، نہ کوئی ایسا ذہانت کا امتحان ہے، کچھ نہیں، سارا مسئلہ یہ ہے کہ آدمی نہیں، آدمی کیوں نہیں کہ آدمیت کی جو کارگاہیں ہیں، جو انسانیت کے کارخانے ہیں، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں ہونا چاہیے، وہ کارگاہیں اس وقت معطل پڑی ہیں، یا وہ کارگاہیں چل رہی ہیں، مگر آدمی تیار نہیں ہو رہا ہے، مجھے تو اپنے پہلے اور دوسرے سفر میں بھی ندوہ اور دیوبند ہی نظر آئے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں اور کوئی خوشامد اور خود فریبی بھی نہیں ہے، میں نہ اپنے نفس کو خوش کرنا چاہتا ہوں بلکہ بالکل جیسے متمم بن نویرہ نے کہا تھا:

فَـدَعْـنِـيْ فَهٰـذَا كُـلُّـهُ قَبْـرُ مَـالِكِ

زندہ انسانوں کے مقبرے

مجھے زندہ انسانوں کے مقبرے نظر آئے، وہ تو مردہ بھائی پر روتا تھا، میں زندہ انسانوں پر روتا ہوں، کون زیادہ بدقسمت اور قابل رحم ہے، میں نہیں کہہ سکتا، شاعر ایک ایسی ہستی کو روتا تھا جس کے لیے موت مقدر تھی، اور اس کو اس دنیا سے جانا تھا اور اس کا وقت موعود آچکا تھا،

لیکن میں تو ان زندہ انسانوں پر روتا ہوں جن کو زندہ رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جو دوسروں کو زندہ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جس کے حصہ میں مسیحائی آئی تھی، جن کے حصہ میں دنیا کو حیات وموت کا پیغام دینا تھا، جن کو ساری دنیا کی ظلمت سے مقابلہ کرنا تھا، میں تو ان کے لیے روتا ہوں۔

میں اس فانی انسان کا مرثیہ خواں نہیں، میں تو ملت کا مرثیہ خواں ہوں، میں ان کارگاہوں کا مرثیہ خواں ہوں جن کا کام ہی یہ تھا، اگر ان کا کوئی جواز تھا، اگر ان کی کوئی افادیت تھی، اگر کوئی ان کی قدر وقیمت تھی، تو یہ کہ وہ ایسے آدمیوں کو پیدا کرے اور عالم اسلام کو زوال سے بچائے، مصر کا کیا مسئلہ ہے؟ مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ قائد نہیں، مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک حسن البنا کے بعد دوسرا حسن البنا نہیں پیدا کر سکا، مصر کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے ایک ایسا آدمی (جمال عبدالناصر) پیدا کیا جس نے سارے عربوں بلکہ سارے مسلمانوں کے دلوں پر سیاہی پھیر دی اور سب کو ذلیل کر کے رکھ دیا، سارا کھیل آدمی کا ہے۔

آدمی ہے تو سب کچھ ہے

جہاں آپ جائیے گا، آپ تاریخ کے جس دور کا مطالعہ کیجیے گا، آپ کو معلوم ہوگا تاریخ کتنی پھیلی ہوئی ہے، وہ اتنی حد تک سمٹی ہوئی ہے، تاریخ کا رقبہ کتنا ہی وسیع ہو، وہ ایک ضخیم جلد ایک دور کی تاریخ کو لیجیے، پوری تاریخ تو بڑی چیز ہے، کہنے کو تو ذرا سی باتیں ہیں، لیکن پھیلا یئے تو داستاں، لیکن سمیٹیے تو ایک نکتہ، پھیلا یئے تو ملت کی تاریخ، پھیلا یئے تو حوادث و تغیرات کی تاریخ اور اس کی تفسیر، اور سمیٹیے تو ایک انسان کے کام کی کہانی، صرف یہ ہے کہ وہ انسان ہے یا نہیں، اگر وہ انسان ہے تو ملت ہے، قسمت ہے، عزت ہے، اگر انسان ہے تو بالکل تاریخ کی شکل ہی دوسری، اگر انسان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ وہی عالم اسلام تھا جو صلیبیوں سے شکست کھاتا چلا جا رہا تھا، اور ہٹتے ہٹتے اندیشہ تھا کہ حرمین کے حدود تک نہ پہنچ جائے، لیکن ایک شخص نور الدین زنگی نام کا پیدا ہوتا ہے، اور فوراً اس کے پیدا ہوتے ہی حالات میں

تغیر ہونا شروع ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد ایک دوسرا شخص پیدا ہوتا ہے صلاح الدین ایوبی، جو واقعات کے دھارے کو بدل دیتا ہے، تاریخ کے رخ کو بدل دیتا ہے، زمانے کی کلائی موڑ نہیں بلکہ توڑ دیتا ہے، زمانہ کی کلائی، تاریخ کی کلائی، ان صلیبی فاتحوں کی کلائی اس نے موڑی نہیں بلکہ توڑ دی، سب آدمی کا کرشمہ ہے، آدمی ہے تو سب کچھ ہے۔

عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری

آج اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ نوجوان نہیں پیدا ہو رہے ہیں کہ جن کے اندر ایمان ہو، جن کے اندر کیرکٹر ہو، جن کے اندر یقین ہو، جن کے اندر درد ہو، جن کے دل کی کلی کھلی ہوئی ہو، جیسے کہ یہاں میں نے بعض تقریروں میں کہا، دل کی کلی کھلی ہوئی ہو، دل پر چوٹ لگی نہیں، کوئی درد کی چوٹ لگی نہیں، پورے قلب وجگر کو دیکھ لیجیے، کوئی ایکسرے کے ذریعے جو خاص قسم کا معنوی ایکسرے ہو، آپ اس سے پورے جسم کے اندر اتر کر دیکھ لیجیے، کوئی درد و زخم کا نام ونشان نہیں، زبان قینچی کی طرح چلنے والی، ایسے ایسے خطیب، ایسے ایسے آرٹسٹ، ایسے ایسے صاحب فن، ایسے ایسے سیاست داں، ایسے ایسے ذہین لوگ موجود ہیں جن کے سامنے پرانی نسل کے لوگ آتے ہوئے شرمائیں، لیکن ایک مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے، برابر مسئلہ الجھتا ہی چلا جا رہا ہے، پاکستان کا کیا مسئلہ ہے؟ پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ ملک ہے اور قائد نہیں، قوم ہے اور لیڈر نہیں، ریوڑ ہے اور ان کا کوئی چرواہا نہیں، اسی طریقے سے آپ سارے ملکوں کا حال دیکھ لیجیے، خود ہمارے ملک ہندوستان کا مسئلہ کیا ہے؟ کہ وہ لوگ نہیں، کیوں نہیں؟ جہاں لوگ پیدا ہونے چاہئیں، جو کارگاہیں ہیں، وہاں آدمی نہیں بن رہے ہیں، کیوں آدمی نہیں بن رہے ہیں؟ کس چیز کی کمی ہے؟ ایک ایک چیز کو آپ سامنے لیجیے، میں کوئی پہیلی بجھانا نہیں چاہتا، کون سی چیز ہے جو دنیا سے اٹھ گئی ہے؟ کیا قرآن شریف میں -نعوذ باللہ- کوئی تحریف ہو گئی؟ کیا حدیث شریف کے درس کا سلسلہ رک گیا؟ کیا فقہ کی کتابیں -نعوذ باللہ- ناپید ہو گئیں؟ اصول فقہ کے کتابی ذخیرے کو آگ لگ گئی؟ کوئی نیا تاتاری حملہ ہوا یا کوئی سیلاب آیا؟ کوئی چیز نہیں، وہی کتب خانے ہیں، وہی کتابیں ہیں، وہی

پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہے، وہی خاندان ہیں، ان کے چشم و چراغ ہیں، اور وہی قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ پتہ مارنے والے، جان کی بازی لگانے والے، یہ فیصلہ کرنے والے کہ ہم دنیا ہیں، ہم ہیں اسلام، ہم ملت اسلامیہ ہیں، ہم اسلام کی قسمت ہیں، ہم اچھے ہیں تو عالم اسلام اچھا ہے، ہم اگر مضبوط ہیں تو عالم اسلام مضبوط، عزم ایسا عزم راسخ، پھر آدمی کو اس کے بعد اس کی جگہ سے کوئی چیز ہٹا نہ سکے، ہزاروں طوفان اٹھیں، ہزاروں آندھیاں چلیں، ہزاروں سیلاب آئیں، نوجوانی کی آزمائشیں بھی، ماحول کی خرابیاں بھی، بدترین دعوتیں اور تحریکیں بھی، مختلف ترغیبات، اندرونی و بیرونی ہر طرح کی ترغیبات، انتخابات بھی، حکومتوں کی تشکیل بھی اور تخت و تاج بھی، تخت و تاج کا زمانہ تو نہیں رہا، لیکن جاہ و منصب بھی، لیکن کچھ نوجوان یہ طے کرلیں کہ ہم اپنے کو بنائیں گے، ہم ہیں سب کچھ! میں بار بار کہتا ہوں، لیکن مجھے اس سے بڑھ کر بہتر شعر نہیں ملا کہ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

کوئی من میں ڈوبنے والا، کوئی اپنے کو پکڑ کر بیٹھ جانے والا، کوئی یہ سمجھنے والا کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں ہے، میں اگر تیار ہوگیا، اپنے کو بنالیا تو یہ کشتی جو جھکولے کھارہی ہے، اور معلوم ہورہا ہے کہ اب ڈوبی اب ڈوبی، یہ کشتی کنارے لگ جائے، یہ فرق ہے آج کے زمانے اور پہلے کے زمانے میں کہ کسی نہ کسی تعداد میں، تعداد کا فرق تو برابر رہتا رہا، لیکن پہلے تھوڑی تعداد میں، اس کے بعد بڑی تعداد میں، بہرحال ہر دور میں کچھ ایسے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے سر سے کفن باندھ لیا، کسی نہ کسی تعداد میں ایسے لوگ ملتے رہے جنھوں نے طے کرلیا کہ ہم اپنے کو بنائیں گے، اور ہم کسی چیز کا اثر نہیں قبول کریں گے، ہم ایک چٹان ہیں، ایک پتھر کی چٹان جو جنبش نہیں کرسکتی، سیلاب آئے ٹکرا کر چلا جائے اور ہار کر کے چلا جائے، لیکن ہمارے اندر جنبش نہیں ہوگی، ساری تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت آدمی کی نمود ہے، آدمی اگر پیدا ہورہے ہیں، اگر ایسے صاحب عزم لوگ جو اپنے متعلق طے کرلیں کہ ہمیں کسی چیز سے متاثر نہیں ہونا ہے، ہم تو اپنے دھن کے پکے ہیں، بس جان چلی جائے اس راستہ میں یا

ہم کچھ کر کے اٹھیں گے، کچھ بن کر کے نکلیں گے، اور ہم کچھ ہو جائیں گے، صاحب دعوت ہو جائیں گے، صاحب ایمان ہو جائیں گے، یہ عزم تھا جو ہمیشہ مسلمانوں کی دستگیری کرتا رہا، حوادث سے کوئی زمانہ خالی نہیں، کبھی نہ سوچیے کہ یہ زمانہ بہت پر آشوب ہے، جس زمانے کا حال دیکھیے، تاریخ میں دیکھیے، دیوان دیکھیے شعراء کے، شعراء نے اپنے زمانہ کا کیسا شکوہ کیا ہے، گویا اس سے بڑھ کر کوئی برا زمانہ تھا ہی نہیں، یہ صحیح ہے کہ کوئی زمانہ فتنوں سے خالی نہیں رہا، کوئی زمانہ آزمائشوں سے خالی نہیں رہا، لیکن ہر زمانے اور ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے جنھوں نے سر سے کفن باندھ لیا اور انھوں نے کہا، ہمیں تو کسی چیز سے مطلب نہیں، ہم تو اپنے آپ کو بنائیں گے، اپنی سیرت کی تعمیر کریں گے، ہم تو خدا کے رسول ﷺ کا بنایا ہوا راستہ اختیار کریں گے، نہ دائیں طرف دیکھیں گے اور نہ بائیں طرف دیکھیں گے، انہیں میں کوئی غزالیؒ پیدا ہوا، کوئی ابن تیمیہؒ پیدا ہوا، کوئی مجدد الف ثانیؒ پیدا ہوا، کوئی صلاح الدین ایوبیؒ پیدا ہوا، کوئی شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوا، کوئی ابوالحسن اشعریؒ پیدا ہوا، کوئی طارقؒ پیدا ہوا، یہ سب وہی لوگ تھے جنھوں نے طے کر لیا کہ ہمیں راستہ اختیار کرنا ہے، ہمارے لیے تقدیر الٰہی نے یہ راستہ اختیار کر دیا ہے، ہم نے یہ راستہ اختیار کیا ہے، یا اللہ نے ہمیں اس کی توفیق دی، ہمیں اس راستے پر چلنا ہے مضبوطی کے ساتھ، اور ہر طرح کی قربانی، ہر طرح کا مجاہدہ، ہر طرح کی آزمائش ہمیں منظور ہے، اس کو قبول کریں گے، لیکن ہم اس راستہ کو نہیں چھوڑیں گے، جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، وقتاً فوقتاً کچھ کرنیں نظر آتی ہیں، کچھ چراغ جلتے ہیں، اور ان چراغ سے دوسرے چراغ جلتے ہیں، اور عالم اسلام میں ایک نئی توانائی اور ایک نئی درخشانی پیدا ہو جاتی ہے، وہ سب اسی عزم و حوصلہ کا نتیجہ ہے۔

عزم و حوصلہ اور استقامت

ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اپنے کو بنائیں، اپنی سیرت کی تعمیر کریں، پھر اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں صلاحیت عطا فرمائی، ان صلاحیتوں کے ساتھ اس دین کی خدمت کریں اور سب کی خدمت کریں، آخرت کی نجات کا سامان پیدا کریں، مسلمانوں کی خدمت کی کوشش کریں،

اس وقت کا جو سانحہ، جو المیہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس عزم کی کمی پیدا ہوتی چلی جارہی ہے، اور ہمارے نوجوانوں کے اندر کسی قسم کا عزم، کسی قسم کا فیصلہ، کسی قسم کی کوئی مضبوطی، کسی قسم کی بلند نگاہی، کسی قسم کی کوئی استقامت، کسی طرح کی کوئی صلابت نظر نہیں آتی، جدید تعلیم کے مراکز سے لے کر ہمارے قدیم تعلیم کے اداروں سب کا حال یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں ایک تذبذب ہے، اپنے مستقبل کے بارے میں شک ہے، اپنے راستے کا انھوں نے ابھی انتخاب نہیں کیا ہے، ہوا کا کوئی معمولی جھونکا انہیں متزلزل کر دیتا ہے۔

تقویٰ اور صبر

میرے عزیزو! میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے ہر جگہ ندوہ اور دیوبند نظر آیا، ہر جگہ مجھے نئے علماء کا مسئلہ نظر آیا، کان میں یہ آواز آتی رہی اور آنکھیں یہی دیکھتی رہیں کہ دنیا آپ کے لیے بالکل تیار ہے، حالات کو بدلنے کے لیے ذرا بھی دشواری نہیں، لوگ ماننے کے لیے تیار ہیں، حالات بدلنے کے لیے تیار ہیں، بلکہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ کوئی آئے اور ہمیں بدلے، ہم تو فرمانبردار ہیں، میرا سب سے بڑا پسندیدہ موضوع طبقات اور تراجم کی کتابیں ہیں، جو لوگ مجھ سے واقف ہیں، میرے مشاغل سے واقف ہیں، میری تصنیفات کا جنھوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ مجھ پر سب سے زیادہ جو ذوق غالب ہے، اور میرے لیے سب سے زیادہ جس موضوع میں کشش ہے، اور جو مطالعہ میرے لیے آسان ہے، وہ تذکرے کی کتابیں ہیں، میں نے ان تذکروں میں جو چیز پائی کہ انسانی سیرت کی تعمیر میں جس کا سب سے زیادہ بنیادی حصہ ہے، اور سب سے زیادہ مؤثر عامل یا جو عنصر ہے، وہ تقویٰ اور صبر ہے، اس لیے سورہ یوسف کی آیت جب میں پڑھتا ہوں تو ساری دنیا کی تاریخ میرے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے، تمام علماء، رجال، تمام قائدین اور وہ تمام لوگ جو قوموں کے نجات دہندہ ثابت ہوئے، یا جو سلطنتوں کے بانی ہوئے، اور یہ مقام تو کچھ زیادہ بلند نہیں، جنھوں نے امتوں کو، ملتوں کو راہ راست پر لگایا، اور جنھوں نے معرفت کے اور ولایت کے بڑے بڑے مراحل طے کیے، ان سب میں جو چیز نمایاں نظر آتی ہے، وہ صبر و تقویٰ ہے، اس

لیے جب میں سورۂ یوسف کی یہ آیت پڑھتا ہوں: ﴿قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾، جب حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے بہت ہی سراپا تصویر حیرت بن کر ان سے پوچھا یہ کیا ہوا؟ ہم تو آپ کو کنویں میں ڈال کر آئے تھے، ہم آپ کی قسمت ہر گویا مہر لگا کر آئے تھے، ہم نے آپ سے چھٹی کر لی تھی، ہم کو گمان بھی نہیں تھا کہ آپ زندہ بھی رہیں گے، زندہ تابندہ و درخشاں ہونا تو الگ رہا، آپ کی زندگی کا امکان بھی نہیں تھا، انہوں نے جو جواب دیا، بہت ہی مختصر لفظوں میں جو الہامی ہیں، قرآن مجید ان کو ادا کرتا ہے: ''بیشک اللہ نے ہم پر احسان کیا''، پھر وہ اس کی اصل طاقت کا تذکرہ کرتے ہیں جو رحمتِ الٰہی کو کھینچنے والی ہے، اور اس کی عمومیت بیان کرتے ہیں کہ ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ یہ میں ہی نہیں، میرا ہی معاملہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے، سنت اللہ ہے کہ ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ﴾ 'جو تقویٰ اور صبر سے کام لے گا، اللہ تعالیٰ اس کا اجر ضائع نہیں کرتا' یہ انھوں نے پورا ادبی اور عالمی اصول بیان کیا کہ تقوی اور صبر سے زندگیاں بدلتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، اور انسان قعر مذلت سے اٹھ کر بام ثریا تک پہنچ جاتا ہے، بام عروج تک پہنچ جاتا ہے، لوگ تخت سے اٹھ کر تخت سلطنت تک پہنچ گئے۔

تقویٰ اور صبر یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو اس کو تختی پر خوشخط لکھ کر ہر مدرسے وہر اقامت گاہ اور ہر حجرے کی دیوار پر لگا دوں، جس وقت کسی نوجوان طالب علم کی آنکھ کھلے، صبح کی اذان سے پہلے یا اذان کے بعد، تو پہلی نگاہ اس آیت پر پڑے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾۔

میرے عزیزو! سب سے زیادہ ہم کو اور تم کو تقویٰ اور صبر کی ضرورت ہے، یہ زمانہ آزمائشوں اور دلفریبیوں اور ترغیبات سے بھرا ہوا ہے، آپ جس راستے سے گزریں گے، آپ کے دامن کو الجھانے کے لیے، آپ کے دامن کو تار تار کرنے کے لیے اتنے کانٹے، کانٹے نہیں، آج پھول بھی یہ کام کر رہے ہیں جو کسی زمانے میں کانٹے کیا کرتے تھے، اور ان پھولوں کا معاملہ ان کانٹوں سے بھی زیادہ خطرناک اور نازک ہے، یہ پھول آپ کے دامن میں آنے کے لیے، اور آپ کو فریب دینے کے لیے، آپ کو لبھانے کے لیے تیار ہیں، کوئی

راستہ، کسی گلی سے بھی آپ گزریں، چاروں طرف امتحانات کا بازار لگا ہوا ہے، فلمی گانے ہوتے ہیں، ریڈیو کی آوازیں آپ سنتے ہیں، آپ یہاں سے امین آباد جائیں تو اشتہارات دیکھیں گے، بڑے بڑے پوسٹر دیکھیں گے، غرض جیسے کہ ایک بازار ہے امتحانات کا، اس میں اگر کوئی چیز حفاظت کرنے والی ہے، اس میں اگر آپ کو اس درجہ تک پہنچانے والی ہے کہ جس درجہ پر پہنچ کر آپ اپنی بھی حفاظت کر سکتے ہیں اور ملت کی بھی حفاظت کر سکتے ہیں، اور ملک کی بھی حفاظت کر سکتے ہیں، اور پوری دنیا کی خدمت کر سکتے ہیں، وہ تقوی اور صبر سے کام لینا ہے، ہم کو اور آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ تقوی اور صبر ہے۔ (۱)

(۱) ۱۹۷۴ء میں سفر حجاز سے واپسی کے بعد طلبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی انجمن جمعیۃ الاصلاح میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا محمد دانیال بھٹکلی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ، (شمارہ ۱۰/ اپریل ۱۹۷۴ء)۔

کثرت مطالعہ کی ضرورت

ایک بار اکبر الہ آبادی مرحوم کے پاس علی گڑھ کالج کے طلبہ کا ایک وفد آیا، اور ان سے پیغام کی فرمائش کی، انھوں نے برجستہ ایک شعر کہا، وہ شعر اس وقت ہمارے حسب حال ہے، انھوں نے کہا:

خود ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے
مری جانب سے کالج کے لڑکوں کو دعا کہنا

آپ کے تمام مقالات قابل قدر تھے، محنت سے لکھے گئے تھے، اور ان سے اندازہ ہورہا تھا کہ مقالہ نگاروں نے مطالعہ کیا ہے، مقالہ لکھنا اگرچہ کوئی اہم بات نہیں لیکن خوشی تو اس بات کی ہے کہ ہمارے عزیز طلبہ میں پڑھنے کا شوق ہے، اور مختلف لٹریچر ان کی نظر سے گزرتے ہیں، ہم سب کے استاد علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے تھے کہ ایک صفحہ لکھنے کے لیے جب تک سو صفحے نہ پڑھے جائیں وہ مقالہ پڑھنے کے قابل نہیں ہوتا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک صفحہ لکھنے کے لیے سو صفحہ پڑھنا چاہیے، جب جا کر اس مضمون میں کوئی حقیقت پیدا ہوتی ہے، اور کوئی اس سے استفادہ کرسکتا ہے، مجھے اس دار العلوم سے قریبی تعلق کی بنا پر اس کے ایک خدمت گزار و کارکن ہونے کی حیثیت سے یہاں کے علم و ذہن کی ارتقائی منزلوں سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہا ہے، ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ ہمارے طلبہ پڑھیں زیادہ اور لکھیں کم، جب کہ ایک صاحب نے کہا کہ ''آج لکھے زیادہ اور پڑھے کم ہیں''، اردو کی ایک تعبیر ہے ''پڑھا لکھا''، یعنی لوگ تو بڑے بڑے مضامین لکھتے ہیں مگر ان کا مطالعہ کچھ نہیں ہوتا، حالانکہ وہی مقالہ کی اصل بنیاد ہے، اور اگر اس کے بعد کوئی تحقیق ہوتی ہے تو نُورٌ عَلَی

نُوْر، مگر اصل چیز مطالعہ ہے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے عزیز طلبہ نے جو کچھ یہاں پڑھا، ان میں ان کے مطالعہ کی خوب جھلک نظر آتی ہے، کہنے کی ایک بات یہ ہے کہ آپ جس قدر پڑھیں گے اسی قدر آپ کا ذہن ترقی کرے گا۔

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جنھیں علم لدنی حاصل ہوتا ہے، ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنے علم و مطالعہ کے راستے سے کوئی انقلاب لاتے ہیں اور کوئی انقلابی کام کرتے ہیں۔ (۱)

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء میں جمعیۃ الاصلاح کے ایک پروگرام میں کی گئی مختصر تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ستمبر-۱۰-۲۵/اکتوبر ۱۹۷۴ء)۔

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

میرے عزیزو! تم سے کہتا ہوں کہ سارا دارو مدار اپنی محنت اور لیاقت پر ہے، کوئی اضافی چیز، کوئی خارجی چیز آدمی کو نہ عالم بنا سکتی ہے نہ ادیب بنا سکتی ہے، اور نہ زندگی میں کامیاب بنا سکتی ہے، یہ سب اس عہد کے دھوکے ہیں، ہمیشہ سے حقیقت ایک رہی ہے، اور اس کو سیدنا علی مرتضیٰؓ نے اپنے بے مثال خطبہ میں بلیغ انداز میں پیش کیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اور کوئی کلام ہو نہ ہو، اس کی نسبت صحیح ہو نہ ہو، لیکن اس کے کچھ ایسے جملے ضرور ہیں جو یقیناً حضرت علیؓ کی زبان سے نکلے، ان میں سے ایک جملہ 'قِیْمَةُ کُلِّ امْرِیٍٔ مَا یُحْسِنُهُ' اگر میرا بس چلے تو یہاں پر لکھ کر میں لگا دوں، مگر اس کی شرح چاہیے۔

انسان کا اصل جوہر

ہر شخص کی قیمت وہ ہے جو کام وہ دوسروں کے مقابلہ میں اور اپنے دوسرے کمالات کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے، انسان کا جوہر وہ ہے جس میں وہ دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہے، اور اپنی دوسری چیزوں میں اس کو مشارکت حاصل ہے، ایک آدمی دس دس چیزیں جانتا ہے، خوش نویس بھی ہے، قاری بھی ہے، خوش آواز بھی ہے، ادیب بھی ہے، کچھ حدیث و تفسیر سے بھی مناسبت ہے، لیکن اصل جوہر مرکزی وہ ہے جس میں اس کو امتیاز حاصل ہے، اپنی ذات میں بھی اور دوسروں کے مقابلہ میں بھی، تو اس کو کسی سفارشی کی، کسی خارجی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں۔

ہم دونوں آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، اب میں ذرا صفائی کے ساتھ بالکل جیسے کوئی بات ہجے کر کے کہی جاتی ہے کہتا ہوں، ہم دونوں نے ممالک عربیہ کی سرزمین پر اس

وقت قدم رکھا ہے جو کچھ ہم کو بننا تھا، بن چکے تھے، ہمارا سانچہ پختہ ہو چکا تھا، مولانا کا معاملہ بھی یہی ہے، مولانا ۵۶ء میں گئے ہیں اور میں ۴۷ء میں گیا ہوں، لیکن ۴۷ء میں اس حال میں گیا کہ عربوں کے سامنے تقریر کرتا تھا اور تھوڑے دنوں کے بعد میری کتابیں چھپ کر مصر سے آگئیں، ماذا خسر العالم ۵۰ء میں چھپی ہے، ہم کو جو کچھ بننا تھا اور جو کچھ حاصل کرنا تھا سب یہیں حاصل کیا، اور سوائے اس کے کہ بیشک ہلالی صاحب یہاں آئے اور وہ بہت بڑے زبان کے مزاج داں، نباض تھے، اور میری خوش قسمتی اس میں زیادہ ہے کہ مجھے شروع ہی میں عرب استاد ملے، لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا، ان کے تو صدہا شاگرد ہیں، ہمارے استاد خلیل عرب صاحب کے صدہا شاگرد ہوں گے، وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں برسوں سے پڑھا رہے تھے، اور ہر سال ان کو بی.اے.، ایم.اے. کی کلاسیں ملتی تھیں، اور خود ان کے گھر کا جو مدرسہ تھا، اس میں بھی درجنوں آدمی آئے اور پڑھ کر گئے، لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔

باقی اصل یہ ہے کہ جو آدمی شروع میں محنت کرے، اور کسی چیز میں پختگی پیدا کرے، اور اس پر وہ تھوڑی سی قربانی دے دے، یعنی کچھ تکلیف اٹھا کر اور اپنی صحت کو خطرے میں ڈال کر اور دنیا سے آنکھیں بند کر کے، ہر انعام، ہر تعریف، ہر اعتراف سے بالکل مستغنی ہو کر اپنے ذوق سے اندرونی جذبہ سے اگر کام میں لگ جائے تو اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں، تو مولانا محمد ناظم صاحب یہاں سے پاکستان گئے تو بہت بڑے دینی و علمی مرکز جامعہ عباسیہ میں وائس چانسلر بن گئے اور کسی نے نہیں پوچھا کہ آپ مصر میں کتنے دن رہے؟ آپ نے ازہر میں پڑھا ہے یا نہیں؟ آپ نے کسی عرب جامعہ سے سند حاصل کی؟ آپ نے وہاں کتنے دن ٹریننگ حاصل کی؟ کسی نے نہیں پوچھا، اصل چیز یہ ہے کہ آدمی سبق کیسا پڑھاتا ہے؟ کتاب کیسی سمجھتا ہے؟ اپنے مطلب کو تحریری، تقریری طریقہ پر کتنی قدرت کے ساتھ، کتنی کامیابی کے ساتھ ادا کرتا ہے؟ اور طلبہ کو اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اسی کو سرمایہ، پونجی سمجھ لو، ہم تین [1] تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، میں بے شک گیا اور اپنے ان ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ گیا، لیکن الحمد للہ گیا تو وہاں داعی کی حیثیت سے گیا، وہاں ایک مصنف کی حیثیت سے گیا، ہر موضوع پر گفتگو کرنے کی

(۱) یعنی خود حضرت مولاناؒ، مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ اور مولانا عمران خان صاحب ندویؒ

پوزیشن میں، اور ڈاکٹر احمد امین سے میری جو باتیں ہوئیں وہ آپ مذكرات سائح في الشرق العربي میں پڑھیں، تو ایک اتنا جونیر آدمی جن کی ساری عمر گویا عجمی نژاد ہے، ہندوستان میں اس نے پڑھا ہے، وہ نابغۂ شرق عربی سے ملا ہے، آپ دیکھیں کہ ان کا جو مقام تھا وہ تھا، لیکن اگر میں ان سے دو سوال کرتا تھا تو ایک سوال وہ مجھ سے بھی کرتے تھے، کچھ چیزیں ایسی تھیں جو وہ مجھ سے پوچھتے تھے، اور بہت زیادہ چیزیں ایسی تھیں جن میں مَیں ان سے استفادہ کرتا تھا، لیکن ایسا نہیں تھا جیسے کوئی شاگرد رشید یا کوئی کوہ قزم کسی عملاق کے پاس چلا جائے، یہ صورت نہیں تھی۔

اپنی درسگاہ پر فخر

یہ کس بات کا نتیجہ تھا؟ یہ یہاں کی تعلیم کا نتیجہ تھا جو خود اعتمادی پیدا کرتی تھی، ہمارے دار العلوم میں اور کچھ ہو نہ ہو لیکن اس زمانہ میں الحمد للہ دار العلوم میں ایک بہت بڑی چیز تھی، جو ذرا کم ہو رہی ہے اور اس کی حفاظت کی ضرورت ہے، وہ ہے اپنی درس گاہ پر فخر، اپنے اساتذہ پر، اپنے اسلاف پر فخر، وہ فخر نہیں جس میں دوسروں کی حق تلفی ہو، عصبیت ہو، بلکہ یہ کہ ان کا ایک مقام تھا، انھوں نے جو فکر دیا ہے، وہ فکر بہت آگے کا ہے، اب بھی بہت سے ممالک وہاں تک نہیں پہنچتے، یا جس کو انگریزی میں سنس آف پرائڈ (Sense of Pride) کہتے ہیں، یعنی اپنی درسگاہ پر ناز، یہ بات تھی اور میں الحمد للہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے علاوہ بھی گھر کی صحبت نصیب فرمائی، اور خاص طور پر میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم ان کی صحبت میں بیٹھ کر ایسا ذہن بن گیا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے آنکھ جھکتی نہیں تھی، اس لیے کہ وہ جدید تعلیم کے بھی اعلیٰ نمونہ تھے، اور قدیم تعلیم میں بھی بہت راسخ، یعنی یہ سمجھئے کہ میں نے ان سے عربی بھی پڑھی ہے، میں نے ان سے مجموعة النظم و النثر کا بھی کچھ حصہ پڑھا ہے، میں نے دیکھا کہ ان کی صرف ونحو کی استعداد اتنی پختہ تھی اور عربیت ان کی اتنی اچھی تھی کہ میں نے کم آدمیوں کی دیکھی ہے، اور اطمینان سے وہ مجھے ادب کی چیزیں پڑھاتے تھے، اور اخبار دیکھنا تو میں نے انھیں سے سیکھا، میں اس وقت خلیل عرب صاحب سے نهج البلاغة اور مقامات حریری وغیرہ پڑھ چکا تھا، اور میں نے جو عربی

اخبارات دیکھنا شروع کیے تو معلوم ہوئے کسی دوسری زبان میں ہیں، اس لیے کہ اس میں جو تعبیرات تھیں، وہ بالکل میرے لیے نامانوس تھیں، تو بھائی صاحب سے میں سمجھتا تھا کہ اس کا کیا مطلب، تو میں نے اخبار بھی پڑھنا انھیں سے سیکھا، پھر میں نے انگریزی بھی ان سے پڑھی، تو ہر چیز میں ان کی استعداد تھی، ان کا مزاج ہی یہی تھا کہ جو چیز تھی پختہ تھی، اور اس پر اتنا اطمینان تھا خاص طور پر اسلام پر، اسلام تو ایک بہت وسیع چیز ہے، شریعت اسلامی اور اسلامی تہذیب اور اسلاف پر اتنا اعتماد تھا کہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے اسلاف کو، امت کے اسلاف کو جو چیز عطا فرمائی، جو گہرائی اور جو پختگی اور جو بصیرت ہے، وہ دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے، اور پھر جس طرح وہ مغربی افکار پر تبصرہ کرتے تھے اور مغربی تہذیب پر متوازن اور گہری رائے دیتے تھے، اس کی وجہ سے میرے اندر وہ مرعوبیت ختم ہوگئی اور بڑے سے بڑے آدمی کے پاس جا کر میں مرعوب نہیں ہوا، یعنی مصر کے چوٹی کے لوگوں سے ملا ہوں کہ جن کی تحریریں یہاں پڑھتا تھا اور جھومتا تھا، ان سے ملا ہوں۔

نہ کوئی جامعہ کسی کو ادیب بناتا ہے اور نہ کوئی ماحول

جہاں تک عربی زبان وادب کا تعلق ہے، اسی تعلق سے کہتا ہوں کہ سب دھوکہ ہے، نہ کوئی جامعہ کسی کو ادیب بناتا ہے اور نہ کوئی ماحول بناتا ہے، اور نہ کہیں کسی عرب ملک میں جانے سے عربی، یا کسی یورپین ملک میں جانے سے انگریزی آتی ہے، میں نے قاہرہ میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو بارہ بارہ، چودہ چودہ، سولہ سولہ برس سے تھے اور ان کی اس وقت تک عربی صحیح نہیں تھی، پتہ لکھتے تھے تو اس میں نحوی غلطی کرتے تھے، بعض فضلاء گئے اور وہاں پڑھنا شروع کیا اور وہ وہاں سے جب پتہ لکھتے تو اس میں مَیں دو تین غلطیاں پکڑ لیتا تھا، مضاف مضاف الیہ اور صفت موصوف کی غلطیاں ہوتی تھیں اور باقی جو لوگ وہاں تھے وہ عامی جیسی بولتے ہوں لیکن ان کو عربی نہیں آتی، تو وہ جو پرانا شعر ہے ذرا سا بے ادبی کہ

خر عیسی اگر بمکہ رود
چوں بہ آید ہنوز خر باشد

سب اپنی محنت اپنی کمائی سے ہوتا ہے

تو یہ کہیں بھی جانے سے کچھ نہیں ہوتا، سب اپنی کمائی، سب اپنی محنت سے ہوتا ہے، ہم دو تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ جتنی دیر تک میں بولا ہوں اس کو کسی نتیجہ پر ختم کروں، اور یہی قیمت ہے اصل میں اس تقریب کی، اگر تم نے یہ بات سیکھ لی، اس وقت مولانا ناظم صاحب کی آمد اس کے لیے اور یہ تقریب اس کے لیے ایک اچھا محرک بن گئی ہے، اگر یہ بات تم نے سمجھ لی کہ سب اپنی کمائی ہے، اپنی محنت ہے، نہ عرب جانے سے کچھ ہوتا ہے نہ عجم جانے سے کچھ ہوتا ہے، اگر تمہارے اندر ذوق پیدا ہو گیا تو پھر تم وہاں جاؤ تو فائدہ ہوگا، میں اس فائدہ کا انکار نہیں کرتا، لیکن یہ ذوق پیدا ہو جانے کے بعد، یہ تنقیدی نگاہ پیدا ہو جانے کے بعد اگر جاؤ گے تو پچاس گنا زیادہ فائدہ ہوگا، مگر عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ اس دور میں جاتے ہیں جب وہ لوگوں کو تول نہیں سکتے، جانتے نہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے، کس میں کیا کمزوریاں ہیں، میں جب مصر گیا تو میں طہ حسین کو خوب جانتا تھا، طہ حسین کی کمزوریوں کو بھی جانتا تھا، احمد امین کو پڑھ چکا تھا، ہم لوگ سب بیٹھتے تھے مولانا مسعود عالم صاحب، مولانا ناظم صاحب ہم لوگ بے تکلف گفتگو کرتے تھے، تبصرے کرتے تھے، کتابیں آتی تھیں ان پر تبصرہ لکھتے تھے، اور وہ ہماری مجلسوں کا موضوع بنتی تھیں، جب میں یہاں سے گیا تو مجھے کوئی نئی چیز معلوم ہی نہیں ہوئی، میں اگر یہ کہوں کہ مصر میں جا کر مجھے نئی چیز نہیں ملی، صورتیں نئی تھیں، لیکن سب جانی پہچانی اور سب کے متعلق ہمارے ذہن میں

لِكُلِّ امْرِیءٍ شِعْبٌ مِّنَ الْقَلْبِ فَارِغٌ
وَ مَوْضِعُ نَجْوَى لَا يُرَامُ اطِّلَاعُهَا

وہ صورت تھی کہ ایک مقام تھا ہر ایک کا، یہ نہیں کہ کسی کو یہ سمجھ لیا کہ امام وقت ہے۔

’بود حکایت دراز تر گفتم‘، یہ بات یاد رکھو میرے عزیزو کہ سب یہیں تم بن سکتے ہو، اور یہاں رہنا بالکل کافی ہے، حافظہ پر زور ڈال کر کہو، بتاؤ کہ باہر جانے والوں میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی کتابیں عالم عربی میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، جن کو عالم

عربی نے مانا ہو؟ اور میں بتادوں دس نام کہ جنھوں نے جو کچھ سیکھا پڑھا یہیں اور خدا کے فضل سے علمائے عرب، ادبائے عرب بھی ان کی کتابیں پڑھتے ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں، بس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سب اپنی محنت اپنا کرنا اپنا بھرنا ہے، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔ (۱)

(۱) ۱۹۸۱ء میں مولانا محمد ناظم ندوی صاحب سابق وائس چانسلر جامعہ عباسیہ (بہاولپور) کی ندوہ آمد پر ان کے استقبال میں منعقد ایک جلسہ میں ان کے تعارف و خیر مقدم کے طور پر کی گئی تقریر سے ماخوذ، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ، (شمارہ ۱۰ اراگست ۱۹۸۱ء)۔

فیصلہ تیرا تر ے ہاتھوں میں ہے.......

فیصلہ کن دن

میرے عزیزو! آپ لوگ یہاں پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ آپ کے اندر اس بات کا احساس وشعور پیدا ہو کہ آپ یہاں کیوں آئے؟ اور تعلیمی سال کے شروع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اور یہاں کے قیام میں کیا فوائد ہیں؟ بعض وقت اگر خیال نہ کیا جائے اور آنے کے مقصد پر توجہ نہ دی جائے تو کیا خطرات ہیں اور کیا نقصانات ہیں؟ اس لحاظ سے یہ دن آپ کی زندگی کا بہت اہم دن ہے، ہم آپ سامنے کی چیز تو دیکھ سکتے ہیں لیکن دور کی نہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ بصارت کی نہیں بصیرت کی آنکھ کھول دیں تو آپ دور کی چیزیں بھی دیکھ سکتے ہیں، کاتب تقدیر اعمال نامہ لیے کھڑے ہیں اور انتظار میں ہیں، آپ کے چہرے پر ان کی نظر نہیں ہے بلکہ آپ کے دلوں پر اور دلوں کے ارادہ پر ان کی نظر ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی ایسی نظر دیتا ہے جس سے وہ اندر کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں، کاتب تقدیر آپ کے دلوں کو پڑھ رہے ہیں، آپ کے دماغ کی سلوٹوں کو دیکھ رہے ہیں، اور انتظار میں ہیں کہ وہ دیکھیں کہ آپ کے اندر کیا ارادہ اور کیا عزم پیدا ہوا اور اس کو نوشتۂ تقدیر میں لکھیں، گویا یہ آپ کی زندگی کا بہت اہم اور نازک دن ہے، فیصلہ کن دن ہے، اور ایک طرح سے گویا آپ کی معنوی پیدائش کا دن ہے، انسان کی پیدائش طبعی طور پر ایک دفعہ ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد پیدائش کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پیدا ہونے کے بعد بھی لوگ مرجاتے ہیں، اور پھر زندہ ہوتے ہیں، پھر مرتے ہیں پھر زندہ ہوتے ہیں، اور یہ سلسلہ

بعض اوقات انسان کی اس دنیا سے جدائی کے وقت تک جاری رہتا ہے جسے ہم موت کہتے ہیں ﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا﴾ (۱)۔

سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے

میرے عزیزو! معلوم نہیں اس وقت کتنے لوگوں کی نئی عمریں شروع ہو رہی ہیں، آپ میں سے بہت بڑی تعداد تو نئی ہوگی، پرانے طالب علم کم آئے ہیں، لیکن ایک تعداد ان طلبہ کی ہوگی جو دو سال، تین سال، چار سال اور بعض چھ چھ، سات سات سال سے پڑھ رہے ہیں، لیکن بڑی تعداد غالباً ان کی ہے جو اسی سال آئے ہیں اور ابھی کسی کو آئے دو دن ہوئے ہیں، کسی کو چار دن ہوئے ہیں، زیادہ تر وہی میرے مخاطب ہیں کہ تمہاری عمر اب شروع ہو رہی ہے اور کاتب تقدیر تمہارے متعلق لکھنے والا ہے، اور تمہارے فیصلہ کا منتظر ہے، تمہاری قسمت کو دیکھ رہا ہے کہ تم نے اپنے بارے میں اگر صحیح فیصلہ کر لیا، اور اللہ نے تمہیں توفیق دی، اور تم کو چاہنے والی ماؤں کی جنھوں نے تم کو رخصت کیا، اور تمہارے والدین کی دعائیں اگر اللہ کے یہاں قبول ہوگئیں، اگر تمہارے بزرگوں کے نیک اعمال جو کبھی انھوں نے کیے تھے، ان میں کسی نے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچ لیا تو پھر تمہاری صحیح عمر آج سے شروع ہو رہی ہے اور تم اس وقت گویا دنیا میں قدم رکھ رہے ہو، نئی زندگی میں قدم رکھ رہے ہو اور یہ بہت کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔

میں کہتا ہوں ساری دنیا کی سلطنتیں، ساری دنیا کے ادارے، ساری دنیا کے دانشور، تمہارے سارے خیر خواہ، تم پر جان چھڑکنے والے اگر یہ چاہیں کہ تم کام کے آدمی بن جاؤ، تم پڑھ لکھ کر آدمی بن جاؤ، عالم بن جاؤ، اور تم نہ چاہو تو وہ سب ناکام رہیں گے، اور اگر تم چاہو کہ تم کام کے آدمی بنو اور تم یہاں سے کچھ سیکھ کر نکلو، تم اپنے بھی کام آؤ اور دوسروں کے بھی کام آؤ، اور اللہ کے دین کے بھی کام آؤ، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اس سے روک نہیں سکتی اور تمہارے لیے کوئی کمی نہیں، یہ پورا کارخانۂ قدرت جو اللہ نے بنایا ہے، پورا عالم، ساری کائنات تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہے، ہوا، پانی اور ہوا میں اڑنے والے پرندے

(۱) سورۃ الأنعام: ۱۲۲

اور پانی میں تیرنے والی مچھلیاں سب تمہارے لیے دعائیں کریں گی اور حدیث میں آتا ہے، یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے کہ طالب علم کے لیے، مُعَلِّمُ النَّاسِ الْخَیْرَ کے لیے جو لوگوں کو علم کی تعلیم دیتا ہے، نیک بات کی، حق بات کی تعلیم دیتا ہے، مچھلیاں پانی میں اور چڑیاں اپنے گھونسلوں میں دعا کرتی ہیں، اور فرشتے پر بچھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم حاصل کرنے کے لیے راستہ طے کرتے ہیں اور گھر سے نکلتے ہیں، تو سارا انحصار تمہارے فیصلہ پر ہے۔

اور دیکھو میں تمہیں بتا دیتا ہوں اور اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ مدرسہ میں سارے انتظامات ہیں اور نگرانی بھی ہے، اور عہدہ دار بھی ہیں، اور درجے بھی اپنے اپنے وقت پر شروع ہوتے ہیں، اپنے وقت پر ختم ہوتے ہیں، لائق اساتذہ بھی ہیں، شفیق اساتذہ بھی ہیں، لیکن تم اگر ان کو ناکام بنانا چاہو، مدرسہ کو ناکام بنانا چاہو تو بہت آسانی کے ساتھ بنا سکتے ہو اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی، کوئی کچھ نہیں کر سکے گا، تم سب کو ناکام بنا سکتے ہو اور سب کو ہرا سکتے ہو، ہم سب ہارے تم جیتے، اگر تم فیصلہ کرلو کہ ہم مدرسہ میں نہ پڑھیں، نہ لکھیں، نہ کام کریں، اور ہم پورا سال گزار دیں تو تم کامیاب رہوگے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم پاس بھی ہو جاؤ، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امتیازی نمبروں سے پاس ہو، مگر تمہارے پلے کچھ نہیں پڑے گا، ایسے ایسے ہم نے اللہ کے شیر دیکھے ہیں اپنے زمانہ میں بھی اور ہر زمانہ میں کہ انھوں نے پڑھ کر نہیں دیا، استادوں اور ان کے والدین نے ان کے سامنے سر کاٹ کر رکھ دیا، اور سب سمجھتے رہے کہ یہ پڑھ رہے ہیں لیکن دامن جھٹک کر وہ یہاں سے ایسے گئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چڑیا سمندر میں چونچ ڈالتی ہے اور اس کی چکنی چونچ میں پانی کا قطرہ بھی نہیں ٹھہرتا، ایسے ان پر گویا چھینٹ بھی نہیں پڑی، علم کی چھینٹ بھی نہیں پڑی اور دامن بھی ان کا تر نہیں ہوا، کہنے والے نے کہا ہی تھا کہ "بازی گوئی کہ دامن تر مکن" ایسے یہ بعض لوگ ہیں کہ دریا عبور کر جائیں اور دامن تر نہ ہو۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ ساری رکاوٹیں ہیں لیکن اندر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہم کو علم حاصل کرنا ہے، کام کا آدمی بننا ہے، ہم اپنے لیے بھی، اپنے خاندان کے لیے بھی، اور اپنی ملت کے لیے بھی، اور خلق خدا کے لیے ہم کو ایک کارآمد آدمی بننا ہے، کچھ سیکھ کر

کے جانا ہے، اپنی نجات کا بھی انتظام کرنا ہے، اور اگر اللہ توفیق دے تو دوسروں کی کشتی بھی پار کرنی ہے، کنارے لے جانی ہے، کتنے ایسے آدمی تھے کہ پڑھتے تھے، کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا، جب بالکل ان کی جان پر بن آتی تھی اور غشی کھانے کے قریب ہو جاتے تھے تو کسی نان بائی کی دکان پر جا کر کھڑے ہو جاتے تھے، ذرا فاصلہ پر تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ بھیک مانگتے ہیں، اور خوشبو جو اُن کی ناک میں آتی تھی، گرم گرم روٹیوں کی جو تنور سے نکلتی تھیں، یا توے پر چڑھی ہوتی تھیں، اس سے تقویت ان کی روح کو حاصل ہوتی تھی، اور کتنے ایسے واقعات ہیں کہ جو عقل میں آنے والے نہیں ہیں لیکن واقعات ہیں، اور ہر زمانہ میں ایسی نظیریں رہی ہیں۔

میرے عزیزو! اس وقت آپ کو دو فیصلوں میں سے ایک کرنا ہے اور اسی فیصلہ پر سارا انحصار ہے، یہ کہ آپ کو پڑھنا ہے، وقت کو کارآمد بنانا ہے، اور یہاں آنے کو وصول کرنا ہے، اور یہاں سے کام کا آدمی بن کر کے جانا ہے، تب تو پھر ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ، تنکا تنکا آپ کی مدد کے لیے دعا کرنے کے لیے تیار ہے، اور سارے انتظامات اسی لیے ہیں، اور پھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کھانا خراب ملے، خدانخواستہ صحت خراب ہو، آپ کو کچھ تکلیف ہو، کوئی بیماری ہو، کوئی چیز بھی آپ کا راستہ روک نہیں سکتی، اور پھر آپ اللہ تعالیٰ کی مدد دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و رحمت کا دروازہ کھل جائے گا، مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَر، بالکل جنت کی صفت بیان کی گئی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جنت کے مزے چکھا دیتا ہے اور جنت کے مزے ان کو اسی دنیا میں آنے لگتے ہیں کہ عالم کو مسخر کر دیتا ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (۱) اپنے تمام بندوں کے دل میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے، گویا کائنات مسخر ہو جاتی ہے، لیکن آپ نے اگر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں یہاں محنت کرنی ہے، اور ہمیں یہاں آنے کو وصول کرنا ہے، اپنے والدین کو مایوس نہیں کرنا ہے، اپنے بزرگوں اور سرپرستوں کا دل نہیں دکھانا ہے، اپنے استادوں اور یہاں کے منتظمین کو دھوکہ نہیں دینا ہے، اپنے نفس کو دھوکہ نہیں دینا ہے، ہمیں کچھ کرنا ہے، تو پھر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ تم سے بڑھ کر خوش نصیب، اقبال مند

(۱) سورۃ مریم: ۹٦

کوئی نہیں، تم دنیا کے فاتح ہو، تمہارے لیے یہ عالم مسخر ہے، اور کوئی بڑی سے بڑی دنیا کی مادی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کا فیصلہ فرمالیا اور تمہیں قبول کرلیا، اور تم قبول ہو گئے، پھر تمہیں کوئی دربار سے نکال نہیں سکتا۔

اور اگر تم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ہمیں محنت کرنا ہے، وقت کو ٹھکانے لگانا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا ہے، اور تھوڑا جبر کر کے اور دل مار کر کے کچھ محنت کرنی ہے، تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا، اور علوم کے جتنے بانی ہیں، امام رازی، امام غزالی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی ایسے حضرات بھی دنیا میں دوبارہ زندہ ہوکر یہاں آ جائیں اور تمہیں پڑھانے کے لیے بیٹھ جائیں تو وہ بھی تمہارے پڑھانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے، اور تم ان سے بھی ایسے ہی بے فیض اٹھو گے جیسے کسی معمولی سے معمولی شخص کے پاس سے۔

تھوڑے دن کی محنت عمر بھر کا آرام یا تھوڑے دن کا آرام عمر بھر کی شرمندگی؟

عزیزو! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ وقت گزاریں اور کچھ نہ حاصل کریں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے آپ وقت گزاریں اور سب کچھ حاصل کرلیں، اور یہ بھی ہے کہ آپ تھوڑی تکلیف اٹھالیں، دل مارلیں، اور دل اور آنکھوں پر پتھر رکھ لیں، پھر اس کے بعد آرام ہی آرام ہے، عمر بھر آرام ہے، پھر اس کے بعد ہر بات میں آپ کی جیت، ہر بات میں آپ کی فتح، کوئی مشکل مشکل ہی نہیں۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ آپ دل نہ مار سکیں، محنت نہ کریں، اس کے بعد قدم قدم پر مشکل، یہاں تو آرام کرلیں لیکن عمر بھر ہر جگہ آپ کو شرمندہ ہونا پڑے گا، ہر جگہ آپ کو منہ چھپانا پڑے گا، ہر جگہ آپ چاہیں گے کہ کوئی آپ کا نام نہ لے، کوئی آپ کو آواز نہ دے، آپ کی طرف کوئی دیکھے نہیں، کسی کو پتہ نہ چلنے پائے کہ آپ بھی مجلس میں ہیں، آپ کو یہ نہ کہے کہ مسئلہ بتادیجیے، آپ کو کوئی یہ نہ کہے کہ کتاب پڑھ کر سنادیجیے، اس عربی عبارت کا مطلب

بتا دیجیے، ہر جگہ چور کی طرح آپ اپنا منہ چھپانے کی کوشش کریں گے، اور ہر جگہ معلوم ہوگا کہ آپ نے کوئی قصور کیا ہے، ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ تھوڑے دن آرام کرلیا اور پھر عمر بھر آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہے، کسی بڑے آدمی سے آنکھیں نہیں ملا سکتے، کسی بڑی مجلس میں بیٹھنے کی ان کو تاب نہیں، ہر جگہ چھپتے پھرتے ہیں کہیں ان کی قلعی نہ کھل جائے۔

اور جن لوگوں نے محنت کرلی ان کا حال یہ ہے کہ شیر ہو گئے، کہیں بھی بڑی سے بڑی مجلس بادشاہوں کی مجلس ہو، بڑے سے بڑے چوٹی کے عالموں کی مجلس ہو، علمی مذاکرہ ہو، بحث ومناظرہ ہو، کوئی تہذیبی مجلس ہو، کوئی علمی مجلس ہو، کہیں بھی ان کی آنکھیں نہیں جھپکتیں اور ان کو شرمانے کی یا منہ چھپانے کی ضرورت نہیں، خود انتخاب کرو کہ یہ اچھا ہے کہ وہ اچھا؟ تھوڑے دن کی محنت عمر بھر کا آرام یا تھوڑے دن کا آرام عمر بھر کی شرمندگی؟

بدترین نفاق

میرے عزیزو! ابھی تعلیمی سال شروع ہوا ہے، اس میں ایک تو دھوکہ دینے کا، اپنے نفس کے ساتھ نفاق کرنے کا معاملہ ہے، اور بدترین منافق وہ ہے جو اپنے نفس کے لیے نفاق کرتا ہے، اپنے نفس کا بھی وہ مخلص نہیں ہوتا، اپنے نفس کے لیے سچ نہیں بولتا، یہ بدترین نفاق ہے، اگر نفاق سے آپ کو نفرت ہو اور عہد کریں کہ نفاق اپنے نفس کے ساتھ نہیں کریں گے، ہم واقعی محنت کریں گے، واقعی ہم وقت سے فائدہ اٹھائیں گے، تو پھر آپ کی زندگی کی کامیابی کے لیے، آپ کی محنت کی مقبولیت کے لیے، دین کے لیے، ملت کے لیے، دنیا کے لیے آپ کے مفید اور نافع بننے کی ضمانت ہے، قرآن میں ضمانت ہے، حدیث میں ضمانت ہے، آپ اپنے ساتھ انصاف کیجیے، اپنے خیر خواہ بن جایئے، آپ کو اپنے نفس کے ساتھ محبت ہونی چاہیے کہ ہم کچھ کام کے آدمی بن جائیں، ہمارا وقت کارآمد ہو، محنت کرلیں اور تھوڑے سے جو یہاں قوانین وضوابط ہیں، ان کی پابندی کرلیں، جن سے ہمارے نظام صحت میں کوئی بہت بڑا اختلاف، کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں پیدا ہوگی کہ ہمارا نظام صحت درہم برہم ہوجائے اور بیمار پڑ جائیں۔

بس سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہم اپنے وقت کو ضائع نہیں کریں گے، ہم یہاں کے ضوابط کی پابندی کریں گے، ہم یہاں کے ماحول سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے، اور میں کہا کرتا ہوں کہ اس دور میں بھی جس کو انقلابی عہد کہا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ بہت پرفتن دور ہے اور اس میں علم اور دین کی قیمت نہیں، ہر دور میں یہ شکوہ رہا ہے کہ یہ بڑا خراب زمانہ ہے، گلُیگ ہے اور اس میں اصل علم کی قدر نہیں، لیکن بزرگوں نے دکھادیا، ثبوت دے دیا کہ زمانہ کس طرح سر جھکاتا ہے، کس طرح سجدہ ریز ہوتا ہے، بڑی بڑی سلطنتیں کس طرح سرخم کردیتی ہیں، اور اپنے خزانے اور اپنے سر قدموں میں ڈال دیتی ہیں، اور ڈال دینے کے لیے تیار ہوتی ہیں، انھوں نے ثابت کردیا کہ آج بھی دنیا ہماری محتاج ہے، اور آج بھی ہماری خوشامد کرنے کے لیے سرکاریں و سلطنتیں تیار ہیں۔

اپنی نیت درست کرلیجیے!

اللہ تعالیٰ کے ساتھ جہاں تک معاملہ کا تعلق ہے آپ کا معاملہ خدا کے ساتھ صحیح ہوجائے، میں جب پڑھایا کرتا تھا تو اس زمانے میں اس کا عملی تجربہ ہوا، میں طالب علموں سے باتیں کرنے کا عادی تھا، سوالات کرتا تھا، خیالات معلوم کرتا تھا، مانوس کرتا تھا، حالات دریافت کرتا تھا، ایک مرتبہ میں نے درجہ میں پوچھا کہ بتاؤ تم کس لیے پڑھ رہے ہو؟ تمہاری کیا نیت ہے؟ ان میں سے کئی طالب علموں نے جو بیچارے سیدھے تھے، کہا: سچ کہتے ہیں، مولانا! ہم نے اس کے متعلق اب تک سوچا ہی نہیں، آج پہلی مرتبہ ہمارے سامنے یہ سوال آیا، ہمارے ذہن میں یہ تھا بھی نہیں کہ یہ سوچنے کی بات ہے، ماں باپ نے بھیجا چلے آئے، پڑھ رہے ہیں، کوئی برا کام تو نہیں ہے، صحیح کام کررہے ہیں، ہم سوچتے ہی نہیں کہ ہم کیوں پڑھ رہے ہیں اور پڑھنے سے کیا فائدہ ہے؟ اور پڑھ کر ہم کیا کرنا چاہتے ہیں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے غور ہی نہیں کیا۔ تو ہمیں جو ڈر ہے اپنے عزیزوں سے، اپنے بھائیوں سے کہ کہیں اتنی بڑی تعداد میں ایسے لوگ نہ ہوں، ایسے بھائی نہ ہوں جنھوں نے سرے سے سوچا ہی نہ ہو کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی نیت درست کر لیجیے، یہیں بیٹھے بیٹھے نیت کر لیجیے، نیت کرنے کے لیے کوئی زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں، اپنے دل کو چند سیکنڈ کے لیے متوجہ کیجیے اپنی طبیعت کو، اور دل سے یہ کہیے کہ اے اللہ! ہم یہاں تیری رضا حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، تیرا علم دین سیکھنے کے لیے آئے ہیں تاکہ تیرے احکام ہم کو معلوم ہو جائیں، تیری شریعت کا علم حاصل ہو جائے، قرآن مجید سمجھنے کے قابل ہو جائیں، حدیث شریف سمجھنے کے قابل ہو جائیں، مسئلے مسائل بتانے کے قابل ہو جائیں، کتابیں سمجھنے کے قابل ہو جائیں، اور ہم اس ذریعہ سے اپنی نجات کا سامان فراہم کریں، ہمیں معلوم ہو کہ خدا کے عذاب سے کس طرح بچ سکتے ہیں اور کس طرح جنت کا استحقاق اور تیری خوشنودی حاصل کرتے ہیں؟

دوسرے اس کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمیں یہاں شریف آدمیوں کی طرح، شریف بچوں کی طرح، شریف گھرانوں کے نونہالوں کی طرح، شریف لوگوں کی طرح رہنا ہے، یہاں کام کا آدمی بننے کے لیے آئے ہیں، پڑھنے کے لیے آئے ہیں، کچھ سیکھنے کے لیے آئے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کو پہچاننے کے لیے، ان کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے لیے، ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، پھر دیکھو اللہ تعالیٰ تمہاری کتنی مدد فرماتا ہے، اور قدم قدم پر تمہاری کس طرح سے مدد ہوتی ہے، اور پھر تم یہاں سے بن کر نکلو گے۔

زمانہ کے انقلاب کا شکوہ پست ہمتی اور حیلہ بازی ہے

میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں، اور بھی لوگ ہیں، الحمد للہ مجھے زمانہ کے انقلاب کا قطعاً کوئی شکوہ نہیں، زمانہ کا انقلاب کوئی چیز نہیں، یہ پست ہمتوں کی اور حیلہ بازوں کی باتیں ہیں، اللہ خالق ہے اور ابدی ہے، اس کی صفات بھی ابدی ہیں، قدیم ہیں، اور ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، تو اللہ تعالیٰ جب رازق ہے تو ہمیشہ سے رازق ہے، ہمیشہ رازق رہے گا، جب وہ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے اور اس کا بنانے والا ہے ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (۱) وہ اپنے بندوں کو پہچاننے والا ہے، وہ اپنی مخلوقات کو نہ پہچانتا ہوگا؟

(۱) سورة الملك: ۱٤

اور اس نے رزق کا ذمہ لیا ہے، وہ اپنے کو 'شکور' کہتا ہے، وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اور پہچانتا ہے، اس کی قدر کرتا ہے، اس کی پرورش فرماتا ہے، اس کو انعام عطا فرماتا ہے، خوشی کا اظہار کرتا ہے، تو پھر اب کس بات کا ڈر ہے؟

اور یہ سب نہ کرنے کی باتیں ہیں، ساری کمزوری ہمارے اندر ہے باہر نہیں، انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ اس کے اندر کوئی چیز ہوتی ہے اور باہر کچھ اور، انسان اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے، تمام دنیا سے اس کو شکوہ ہوتا ہے کہ سب اس کو ذلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ کوئی اس کو ذلیل نہیں سمجھتا، اگر انسان اپنی عزت کرنا سیکھ لے اور انسان قابل عزت ہو تو اس کو کوئی بھی ذلیل نہیں سمجھ سکتا اور کسی سے اس کو شکایت کا موقع نہیں آئے گا، کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب علم دین کی قدر نہ ہوئی ہو، آج بھی اس زمانے میں علم دین کی وہ قدر ہے جو دنیا میں کسی کی نہیں ہے، اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے واقعی علم دین دیا ہے، ان کا تو عالم یہ ہے کہ بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے، بادشاہوں کو آنکھیں ملانے کا موقع نہیں دیتے۔

تم کس دین، کس علم کو حاصل کرنے کے لیے آئے ہو، تمہیں خبر ہے؟ تمہیں اگر خبر ہو جائے، واللہ العظیم، تو تم تاب نہیں لا سکتے، اگر تمہیں معلوم ہو کہ تمہیں کیا مرتبہ ملنے والا ہے، تھوڑی سی محنت کر لو گے تمہیں کیا نصیب ہوگا، تم کیا چیز بن جاؤ گے کہ زمین پر تمہارے پاؤں نہ پڑیں گے، تم میں کیا، اچھے اچھے عالی ظرفوں میں یہ ظرف نہیں ہے کہ اس کو برداشت کر سکے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو غیب میں رکھا ہے، اس کو غیب میں رہنے دو، غیب کے سو سو پردوں میں رہنے دو، لیکن جب وقت آئے گا جبھی دیکھو گے ؎

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

ہمت اور محنت کریں!

عزیزو! ہمت کرو، اسی وقت فیصلہ ہونا ہے کہ تم کیا ہو، یا تو سارے اسباب تمہارے لیے میسر نہیں، کسی بات کا شکوہ نہیں، نہ روزی کا شکوہ، نہ عزت کا شکوہ، نہ مسرت کا شکوہ، نہ کامیابی کا شکوہ، تمہارے لیے سب کی ضمانت ہے اگر تم واقعی صاحب کمال بن جاؤ، محنت

کرلو، ذرا سا دل مارلو۔ یہاں کھانا تمہارے گھروں کے برابر نہیں مل سکتا، جو اس دھوکہ میں ہیں وہ اس دھوکہ کو دور کرلیں، تمہیں اپنے گھر کے جیسا آرام نہیں مل سکتا، حالانکہ میں جانتا ہوں، بہت سے لوگوں کو جو بعض مرتبہ نخرے کرتے ہیں، (معاف کرنا)، مدرسوں میں نخرے کرتے ہیں، ان کے گھروں سے کہیں بہتر مدرسوں میں کھانا ملتا ہے، گھروں سے بہتر یہاں ان کے رہنے کی جگہ ہوتی ہے، لیکن انسان کی فطرت یہی ہے، اس کے برعکس کہتا ہوں، صاف صاف کہتا ہوں مدرسے کے ذمہ دار کی حیثیت سے، گھر کا سا کھانا تمہیں نہیں ملے گا، گھر کا سا آرام نہیں ملے گا، گھر کے جیسے حالات یہاں نہیں ملیں گے، سب گوارا کرو، اور اس کے لیے تیار ہو جاؤ کہ تھوڑی محنت کر کے یہاں سے کامیاب ہو کر نکلو گے، بس پھر کامیابی ہی کامیابی، فتح ہی فتح لکھی ہے، پھر تو بس وہی ہے جس کو ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِآيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ [(۱)] مجھ سے اگر کوئی کہے کہ کیا قرآن مجید میں کہیں عربی مدارس کے علماء اور طلبہ کے متعلق کوئی ضمانت ہے اور کوئی پیشین گوئی کی گئی ہے؟ تو میں کہوں گا سورہ الم سجدہ میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِآيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ یہ قرآن مجید میں ہے اور ایک پیغمبر کی زبان سے اللہ تعالٰی نے کہلوایا ہے یوسفؑ سے کہا گیا: ﴿أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوْسُفُ، قَالَ أَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ أَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ یہاں پر یوسف علیہ السلام نے صاف کہہ دیا اور سورہ یوسفؑ کے قصہ میں آتا ہے اور لوگ اسے یوسفؑ ہی کا قصہ سمجھتے ہیں، خصوصیت انہیں کی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل کلیہ ہے جیسے میں نے کہا، ﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ بس تقوی اور صبر ہے، تب تو ایمان ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ یہ تم جو دیکھ رہے ہو، تم نے مجھے کہاں ڈالا تھا، میں کہاں پہنچ گیا، تم نے مجھے کنویں میں ڈالا اور آج میں مصر کے تخت پر بیٹھا ہوا ہوں، تم آئے ہو میرے پاس ہاتھ پھیلائے ہوئے، یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ ﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ہم ان کو صرف مقتدی نہیں بلکہ حاکم بنادیں گے، مؤتم اور مقتدی نہیں بلکہ

---

(۱) سورة السجدة: ٢٤

امام بنادیں گے ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ صبر کیجیے، جو کھانے کو ملے کھاؤ، جو سرد گرم پیش آئے اسے برداشت کرو، زبان اور عادت کے اختلاف کو انگیز کرو، اور تقویٰ وصبر سے کام لو اور اللہ سے تعلق پیدا کرو تو یقیناً اہل کمال بن جاؤ گے، و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔ (۱)

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں نئے تعلیمی سال کے موقع پر ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء میں کی گئی تقریر، اسے مولانا شاہ ابو دجانہ تسنیم عثمانی ندوی نے قلم بند کیا، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۱ء)۔

مدارس کا اصل سرمایہ

ذہن کو تیار کرنے کی ضرورت

آپ کا نیا تعلیمی سال شروع ہورہا ہے، اور ہمارے وہ عزیز بھی جو رمضان المبارک کی تعطیلات میں گھر گئے تھے اور ابھی ان کی تعلیم کا حصہ باقی ہے، وہ بھی آ گئے ہیں، اور بہت سے عزیز طالب علم نئے داخل ہوئے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ میں ان کا خیر مقدم بھی کروں اور کچھ ان کو مشورے دوں اور ان کو بتاؤں کہ وہ کس طرح اپنی اس آمد کو اور یہاں کے قیام کو زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید بنا سکتے ہیں۔ بعض مرتبہ بڑے بڑے سفر اور بڑی بڑی مہمات اس وجہ سے پورے طور پر نتیجہ خیز، انقلاب انگیز تو بڑی چیز ہے، مفید نہیں ہوئے کہ ان کے لیے پہلے سے ذہن تیار نہیں تھا، اور اس منزل کی عظمت اور اس سفر کی اہمیت، مقامات اور ماحول کی نزاکت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے معلوم نہیں تھے، عبادات اور ارکان اسلام میں حج ایک ایسا رکن ہے کہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

شعور کے ساتھ کام کرنے کی اہمیت

اہتمام کے لفظ ہی سے مجھے یاد آیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو انسانوں کا خالق ہے، اس نے تقریباً ہر رکن کے لیے، ہر فریضہ کے لیے ایسے انتظامات فرما دیے ہیں اور ایسے خارجی انتظامات اور اس کے راستے کی منزلیں ایسی متعین کر دی ہیں اور کچھ ایسے آداب مقرر کیے ہیں کہ انسان پوری بیدار مغزی کے ساتھ اور پوری تیاری کے ساتھ ان ارکان میں مشغول ہو، اور یہ نفسیات

انسانی بلکہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے، جو کام لا ابالی پن سے اور ذہن بغیر حاضر کیے ہوئے اور بے شعوری کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے اس کے پورے ثمرات حاصل نہیں ہوتے۔

مجھ سے ایک بڑے طبیب اور بڑے تجربہ کار اور نفسیات شناس بزرگ نے فرمایا کہ جو ورزشی کام اور جو ریاضتیں اور محنتیں بغیر ورزش کے ذہن کے کی جاتی ہیں ان کا وہ ثمرہ نہیں نکلتا جو انسانی جسم کی تعمیر اور انسانی جسم کی نشو ونما میں ان ورزشوں سے نکلتا ہے جن کے ساتھ ورزش کا ذہن ہوتا ہے، مثلاً انھوں نے کہا کہ سقوں کو دیکھو جو پانی بھرتے ہیں، کتنی محنت کا کام کرتے ہیں، لیکن ان کے بازو پہلوانوں کی طرح مضبوط نہیں ہوتے اور ان کا نشو ونما اور ارتقاء ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ پہلوان کا ہوتا ہے، اس لیے کہ پانی بھرتے وقت، مشکیں اٹھاتے وقت، لے جاتے وقت ان کا ذہن ورزش کا نہیں ہوتا بلکہ ان کا ذہن بیگار کا ہوتا ہے، یا روزگار کا ہوتا ہے، یہ ایک اچھی چیز ہے، لیکن اس سے ورزش کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

ایسے ہی بہت سے لوگ ہیں، گھاس چھیلنے والے بہت سے مزدور، اسٹیشن کے قلی، یہ سب جتنی محنت کرتے ہیں اگر مجموعی طور پر حساب لگایا جائے تو پہلوان اتنی ورزشیں نہیں کرتے ہیں، اتنے ڈنڈ نہیں پیلتے، اتنی بیٹھکیں نہیں کرتے جتنی لکھنؤ اور لکھنؤ سے بڑھ کر بمبئی اور کلکتہ، ہوڑہ کے اسٹیشن کا قلی کرتا ہے، لیکن آپ نے کسی قلی کو دیکھا کہ وہ گاما کی طرح مضبوط ہو، اس کے اعضاء کی مناسب نشو ونما ہوئی ہو؟ کیا بات ہے؟

حساب لگایئے گا تو میزان ان کی محنتوں کی زیادہ نکلے گی، لیکن چوں کہ ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ ہمارا فلاں عضو مضبوط ہو اور اس میں گوشت آئے اور خون کا دوران صحیح طور پر ہو، اسی لیے ورزش کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا، پیسے بھی مل جاتے ہیں اور کھانا بھی ہضم ہو جاتا ہوگا، لیکن ورزش کا جو فائدہ انسانی جسم کی مضبوطی میں اور اس کے سڈول بننے میں اور اس کے اعضاء کے خاص طور پر ترقی کرنے میں ہے، وہ نہیں ہوتا۔

عبادات میں شعور کا اہتمام

اسی لیے تشریع الٰہی نے، آسمانی تشریع نے اور الٰہی حکمتوں نے نماز کے لیے استحضار اور

وضو، اور پھر مسجد کو جاؤ تو یہ خیال کر کے جاؤ کہ تم نماز ہی میں اس وقت سے شامل ہو گے، اور تمہارے یہ قدم جو پڑ رہے ہیں یہ سب عبادت میں شمار ہوں گے، نماز میں شمار ہوں گے، پھر جب مسجد میں قدم رکھو تو درود شریف پڑھو اور اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ پڑھو، پھر وہاں جا کر تحیۃ المسجد پڑھو، پھر سنن راتبہ ادا کرو، اور پھر اس دھیان کے ساتھ بیٹھو کہ نماز کا انتظار کرنے والا بیٹھتا ہے تو وہ نماز ہی میں محسوب ہوتا ہے، اور وہاں کوئی دنیا کی باتیں نہ ہوں ان سب کا مجموعی اثر یہ پڑتا ہے کہ پھر وہ پورا وقت ثواب کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے اور اس کو وہ روحانی ترقی ہوتی ہے جس کو ہم آپ محسوس نہیں کرتے۔

ہم روحانی ترقی مجاہدات میں اور مراقبات میں اور تصوف میں زیادہ محسوس کرتے ہیں، لیکن مسجد میں صحیح نیت کے ساتھ بیٹھنے والے کو جو ترقی ہوتی ہے، اور جو حضوری اس کو حاصل ہوتی ہے، اور جو قرب خداوندی اس کو حاصل ہوتا ہے، اس کی لوگوں کو اہمیت معلوم نہیں ہے، قدر نہیں ہے، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی تصوف کی چیز نہیں ہے، کوئی سلوک نہیں ہے، کوئی مجاہدہ نہیں ہے۔

میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ سب سے مہتم بالشان رکن جس کے لیے بڑا اہتمام کر دیا گیا ہے، اور جس کی ساخت یہ رکھی گئی ہے کہ بغیر اہتمام کے وہ ادا ہی نہیں ہو سکتا وہ حج ہے، لیکن حج میں بھی جو لوگ حج کی تیاری نہیں کرتے (تیاری سے میری مراد پاسپورٹ یا قرعہ اندازی وغیرہ کی تیاری نہیں ہے) یعنی اپنے ذہن کو تیار نہیں کرتے، حج کے فضائل اور حج پر جو اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں، اور حج کی جو روح ہے، اور حج کے جو مناسک ہیں، اور حکمتیں ہیں اور روحانی فوائد ہیں، جو لوگ حج کا اس نظر سے مطالعہ نہیں کرتے اور حج کی عظمت سے واقف نہیں ہیں، اور محرکات بھی ان کے اتنے عمیق اور اتنے صحیح نہیں ہیں جو ایک حاجی کے ہونے چاہئیں، تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پورا حج کر لیتے ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا حج بھی صحیح ہوتا ہے، یعنی مفتی فتویٰ کی زبان میں یہی کہے گا کہ ان کا حج صحیح ہے اور کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ ان کا حج ادا نہیں ہوا، لیکن حج کا اصل فائدہ ﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ

وَيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ﴾ (۱) اور پھر یہ کہ جس کو حج مبرور نصیب ہوا وہ ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ (۲)، تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے، اور کسی دن شیطان کو اتنا رسوا اور ذلیل وخوار نہیں دیکھا گیا ہے جتنا کہ عرفات کے دن دیکھا گیا، کس کثرت سے اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتا ہے، پھر حج میں جو اللہ تعالیٰ نے انقلاب انگیزی کی شان رکھی ہے کہ زندگی سراسر تبدیل ہو جاتی ہے، بالکل مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے، اور انسان کی گویا اخلاقی حیثیت سے بھی، ذہنی حیثیت سے بھی از سر نو پیدائش ہوتی ہے، بہت سے لوگوں کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، وہ چلے جاتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ زاد وراحلہ ہی شرط ہے، بیشک شرط ہے، اور اس کے بعد پورا حج کر کے چلے آتے ہیں اور کوئی فرق نہیں ہوتا، بعض اوقات (اللہ معاف کرے گستاخی ہوئی) الٹا اثر ہوتا ہے۔

بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش

روح ابراہیمی اور عشق ابراہیمی کوٹ کوٹ کر، اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر اور محمد رسول اللہ (ﷺ) کا اللہ تعالیٰ سے تعلق کوٹ کوٹ کر اب بھی بھرا ہوا ہے، بیت اللہ وہی، حرم وہی ؎

کعبہ را ہردم تجلی می فزود
ایں ز اخلاص ابراہیم بود

آج بھی بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش ہوتی ہے، اور جب بات آ گئی ہے تو میں عرض کردوں، خود میرا بھی تجربہ ہے، شاید اللہ کسی کو وہاں لے جائے، ہمارے ایک بزرگ دوست جو خود صاحب باطن اور صاحب احوال تھے، انھوں نے مجھے خود قصہ سنایا کہ میں مکہ

---

(۱) سورۃ الحج:۲۸ (۲) رواه البخاري في صحيحه عن أبي هريرة، كتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، حديث رقم ۱۵۲۱

معظمہ گیا تھا تو ایک خاص مقصد لے کر گیا تھا اور ان کی زندگی کا ایک اہم مرحلہ تھا، اس کے لیے مجھے دعا کرانی تھی، میرے والد صاحب نے مجھے بہت تاکید کی تھی کہ اگر کوئی عارف باللہ، کوئی مستجاب الدعوات ملے - اور وہاں نہ ملے گا تو کہاں ملے گا؟ - تو میری طرف سے عرض کرنا کہ دعا کریں، وہاں ایک بزرگ تھے حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ، شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب سید الطائفہؒ کے خلفائے خاص میں تھے، تو وہ جب ان کے پاس گئے تو ان بزرگ نے ان سے کہا کہ میاں! جو کام تم خود کر سکتے ہو، وہ میرے ذمہ کیوں کرتے ہو؟ تم کرلو، ہم نے کہا: وہ کس طرح؟ کہا: دیکھو بیت اللہ شریف پر تجلیات کی بارش ہر وقت ہوتی ہے، تم آنکھ بند کر کے آنکھ کھولو اور دعا کرو، جب کسی تجلی خاص سے اتصال ہو جائے گا تو اس وقت دعا قبول ہوگی۔

بیت اللہ اب بھی وہی ہے، جن کو اللہ نے توفیق دی وہ اب بھی محسوس کرتے ہیں، مگر اللہ کے شیر بہت سے ایسے ہیں کہ وہاں جاتے ہیں اور ویسے ہی چلے آتے ہیں، کیا بات ہے؟ حج کی تیاری انھوں نے نہیں کی تھی، حج کی عظمت ان کے دل میں نہیں بیٹھی، بیت اللہ شریف کو پہچانا نہیں تھا، ان کا مسعیٰ (صفا اور مروہ کے درمیان) مطاف اور بیت الرکن والمقام اور چیز سے اتصال قلبی نہیں ہوا تھا، پورا پورا حج کر آتے ہیں، ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں، اور اگر کوئی کہے تو بے ادبی کی بات ہوگی۔

نیت کی اہمیت

میں نے کہا کہ بہت سے اللہ کے شیر ایسے ہیں جاتے ہیں اور ویسے کے ویسے چلے آتے ہیں، تو جب یہ بیت اللہ کا حال ہے جہاں ہر وقت دور چلتا رہتا ہے اور رحمتِ الٰہی برستی رہتی ہے، گھنگھور گھٹا برستی رہتی ہے، پھر مدارس اور پھر علمی حلقے اور پھر اساتذہ کی صحبتیں یہ کیا چیز ہیں، کہنا یہ ہے کہ بہت کچھ تعلق انسان کی ذہنی کیفیت سے ہے، اگر انسان کی ذہنی کیفیت درست ہو جائے جس کو نیت کہتے ہیں، شریعت نے نیت کو اسی لیے اہمیت دی ہے، نیت انسان

کے اندر استعداد پیدا کر دیتی ہے، اس کو اہل بنا دیتی ہے، یعنی گویا جیسے کوالی فائی (Qualify) کرنا کسی کو کہتے ہیں، وہ انسان کو اس کے لیے تیار کر دیتی ہے کہ اب وہ اس کے اثرات کو جذب کرے، اس لیے نیت کی بڑی اہمیت ہے، تو ذہنی کیفیت پر بہت اثر پڑتا ہے۔

مثلاً ایک شخص ایک بڑے سے بڑے جامعہ میں، کسی زمانہ میں بغداد کا جامعہ نظامیہ تھا، نیشا پور کا جامعہ نظامیہ تھا، امام غزالی کا حلقۂ درس تھا اور کس کس کے حلقۂ درس تھے، اور کتنے کتنے مدارس تھے، اس پر مستقل کتابیں ہیں، اس مدرسہ میں یا کسی مدرسہ میں بھی اگر جانے والا اس کیفیت کے ساتھ جا رہا ہے کہ میں ایک باغ میں قدم رکھ رہا ہوں اور میں ایک ادنیٰ درجہ کا گل چیں ہوں، اور میں ایک ایک پھول کا اور ایک ایک کلی کا محتاج ہوں، اور یہ باغ کلیوں سے بھرا ہوا ہے اور مجھے اپنا دامن بھر لینا ہے، وہ دامن بھر کر کے آیا۔

اور اگر کوئی اس خیال سے وہاں گیا کہ کچھ بھی نہیں، کانٹے ہی کانٹے ہیں، لوگوں نے خواہ مخواہ گلستاں نام رکھ دیا ہے، یہاں تو بھوک ہے، پیاس ہے، تکلیف ہے، اچھا کھانا نہیں ملے گا اور معلوم نہیں کتنی ہمیں وہاں ناز برداریاں کرنی پڑیں، کتنی ہمیں سختیاں جھیلنی پڑیں گی اور کیا فائدہ ہے اس علم کا، اور کون سے بڑے استاد آسمان سے اترے ہیں، تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اور بعض وقت یہ چیزیں انسان کی ذہنی کیفیت کی بہت حد تک تلافی کر دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات بدل بن جاتی ہے، اگر اس جگہ میں کوئی کمی ہے اور مرکز میں کوئی کمی ہے تو اس کی بھی تلافی اس سے ہو جاتی ہے، ایسا دیکھا گیا ہے کہ دینے والے کے پاس زیادہ سامان نہیں، لیکن لینے والے کی ہمت بلند ہے اور طلب ہے تو اللہ تعالیٰ نے دینے والے کی اس محدود پونجی میں برکت عطا فرمائی ہے اور لعل و جواہر سے دامن بھر دیا ہے، یعنی بہت سے لوگوں کو ایسے استادوں سے فائدہ پہنچا ہے جو سچ پوچھیے اگر باقاعدہ یعنی تولا جاتا اور یہ کام کوئی پیمائش اور وزن کا ہوتا تو یہ فیصلہ ہوتا کہ اس استعداد والے کے لیے یہ استاد کافی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس متوسط استعداد والے استاد سے اس عالی استعداد والے طالب علم کو ایسا فائدہ پہنچایا جیسے کسی بڑے استاد سے فائدہ پہنچا اور پہنچ سکتا ہے، اس کی صدہا مثالیں ہماری علمی تاریخ میں

ہیں، ہمارے مدارس کی تاریخ میں اور تعلیم وتربیت کے نظام کی تاریخ میں ہیں۔ بہت سے استادوں کے طالب علموں نے اپنے استادوں سے ایسا فائدہ اٹھایا کہ خود استادوں کو حیرت ہوئی، اور بعض اوقات تقریر کرتے وقت، درس دیتے وقت ان کو حیرت ہوئی کہ یہ مضامین کہاں سے آرہے ہیں۔

اور مجھے خود اس کا تجربہ ہے کہ بعض اہل طلب طالب علموں کے سامنے مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر کوئی تغیر ہوگیا ہے اور میرے اندر جیسے کوئی سوتا پھوٹ گیا ہے، کوئی منفذ کہیں سے ایسا تھا جو بند تھا، اب کھل گیا ہے، اور اس میں قلب کو دخل ہے، مثلاً پوچھا جائے امام الحرمین بیشک بڑے پایہ کے شخص ہیں، امام جوینی ہیں، لیکن امام غزالیؒ تو ان سے بھی بڑھ گئے، ایسے آپ کو صدہا لوگ ملیں گے جو اپنے استادوں سے بڑھ گئے ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے اندر استعداد تھی اور طلب تھی اور قدر تھی، اور بعض اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ بعض ذہین اور حساس طلبہ کو اپنے استادوں میں کچھ کمی محسوس ہوئی کہ وہ تسلی نہیں کرسکتے تو وہ ناکام ہوئے، لیکن جن سعید طالب علموں نے طے کرلیا کہ نہیں ہمیں انھیں سے فائدہ اٹھانا ہے، اور ہمیں انشاء اللہ انہیں سے فیض حاصل ہوگا تو وہ کامیاب ہوئے، تو وہ جو مولانا روم کا شعر ہے ؂

آب کم جو تشنگی آمدید ست
تا کہ آبت جوشد گراز بالاو پست

پانی کی فکر کم کرو اور پانی کم تلاش کرو، تشنگی زیادہ پیدا کرو تا کہ تمہارے پاؤں کے نیچے سے پانی ابلے، تا کہ آبت جوشد از بالا و پست، اوپر اور نیچے سے پانی اُبلے اور پانی برسے۔

اپنی درسگاہ پر ناز

ہمارے عزیز بھائی جو اس سال پہلی مرتبہ آئے ہیں، وہ اپنے ذہن میں اپنے فائدہ کے لیے، مدرسہ کے فائدہ کے لیے نہیں کہتا، مدرسہ کو الحمد للہ جو کچھ بننا تھا، اس کو جو کچھ مشہور ہونا تھا، جو کچھ امتیاز پیدا کرنا تھا، پیدا کرچکا، اور اصل عزت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، اپنے فائدہ کے لیے میں کہتا ہوں کہ مدرسہ اور مدرسہ سے تعلق رکھنے والوں کی وقعت پیدا کریں، اور اس

پر اللہ کا شکر ادا کریں، جتنا اللہ کا شکر ادا کریں گے، ان کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری صحیح رہنمائی فرمائی، ہم صحیح جگہ پر آئے ہیں، اور ہمیں انشاء اللہ یہاں سے فائدہ پہنچے گا، اور ہمیں یہاں سے فائدہ اٹھانا ہے، بھرپور فائدہ اٹھانا ہے، اتنا ہی ان کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔

اور جن لوگوں کے دلوں میں شروع سے شک بیٹھا ہوا ہے، تردد ہے، اور وہ اپنے مدرسے کے بارے میں، درسگاہ کے بارے میں، اساتذہ کے بارے میں، نظام تعلیم کے بارے میں، نصاب کے بارے میں احساس کمتری میں، احساس کہتری میں مبتلا ہیں، اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس نصاب سے کیا ہوگا؟ یہاں پڑھ کر ہم کیا کرلیں گے؟ جامعہ ازہر جاتے یا سعودی عرب کی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ یا جامعۃ الامام محمد ابن سعود وغیرہ جن کے نام آپ سنتے ہیں یا سنیں گے، وہاں جاتے تو کچھ فائدہ بھی ہوتا، اور یہاں کتنی ہمیں عربی سکھالیں گے، یہ خود عجمی ہیں اور یہاں کا ماحول بھی عرب کا نہیں ہے، ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ تو ان کو واقعی فائدہ نہیں ہوگا، اور صاف مجھے نظر آتا ہے، میرا تجربہ ہے، بحیثیت مدرس کے بھی، بحیثیت معتمد تعلیم کے بھی، بحیثیت ایک تاریخ کے موضوع کا مطالعہ کرنے والے کے بھی کہ ایسے لوگوں کو بالعموم فائدہ نہیں پہنچتا اور وہ کورے کے کورے رہتے ہیں اور بالکل ویسے ہی جاتے ہیں۔

لیکن جن کے ذہن میں درسگاہ کا وقیع تصور ہوتا ہے، اس کے نظام کا، اس کے مقاصد کا، اس کے تخیل کا، اس کے طریقۂ تعلیم کا، ان کو بہت سی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود فائدہ پہنچ جاتا ہے، یہ تجربہ ہے۔

اور ہمیں ایک بڑی یونیورسٹی کے ایک بڑے پروفیسر اور بڑے ذہین اور جن کے ہاتھوں سے درجنوں آدمی پی. ایچ. ڈی. کر کے نکلے، انھوں نے کہا کہ مولانا! ایک چیز ہمارے یہاں ہے جس کو (Sense of Pride) کہتے ہیں ''یعنی اپنی درسگاہ پر ناز''، اس کو بہت دخل ہے، جن لوگوں کو اپنی درسگاہ پر، مادر علمی پر، اپنے اساتذہ پر ناز ہوتا ہے، وہ بہت فائدہ اٹھاتے ہیں، اور پھر اللہ تعالیٰ ان سے بہت فائدہ پہنچاتا ہے، یہ سنس آف پرائڈ ہے، مسلم

یونیورسٹی کا بہت بڑا سرمایہ اور اس کی بہت بڑی طاقت اپنی درسگاہ پر فخر اور ناز تھا، وہ یہ کہ ہم بہترین درسگاہ میں ہیں، ہماری درسگاہ کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا،علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ میں یہ بات ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے سامنے بھی ان کی آنکھیں نہیں جھپکتی تھیں، ہمارے یہاں کے طلبہ میں آپس میں جو اتحاد ہے، جو رشتہ قائم ہو جاتا ہے، واقعی علی گڑھ برادری کا رشتہ ضرب المثل تھا،کوئی شخص کہیں چلا جاتا بے تکلف کسی علیگ کے مکان میں چلا جاتا،اور گھر والوں سے کہتا کہ میں علی گڑھ کا طالب علم ہوں، میں ٹھہروں گا۔

ایک صاحب نے واقعہ سنایا،''قومی آواز'' میں چھپا تھا کہ ہم کلکتہ گئے تو ہم نے کہا کہ کہاں ٹھہریں؟ ہوٹل میں ٹھہرنے کی سکت نہیں تھی، تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک معروف روزنامہ کے ایڈیٹر علیگ ہیں، دفتر میں پہنچے اور ہم نے کہا کہ ہم علی گڑھ کے طالب علم ہیں، ہم آپ کے یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں،تو انھوں نے کہا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ آپ پہلے میرے گھر نہیں گئے، پہلے یہاں آئے ہیں، آپ کو تو چاہیے تھا کہ پہلے وہاں جاتے، چائے پیتے،ناشتہ کی فرمائش کرتے، سامان رکھوادیتے، کہتے ہمارا گھر ہے، ہمیں یہاں رہنا ہے، یہ لایئے وہ لایئے، پھر آپ ہم سے ملتے اور کہتے کہ ہم ٹھہر گئے ہیں، اب آپ ہم سے پہلے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے یہاں ٹھہریں گے، یہ تو علی گڑھ کی بات نہیں ہوئی۔

تو یہ بات کسی زمانہ میں ہمارے ندوی طلبہ، ندوی فضلاء میں بھی تھی کہ ایک ندوی دوسرے ندوی کو ایسا ہی بھائی سمجھتا تھا، بالکل بے تکلف،لوگ کہتے تھے کب کی ملاقات ہے، اور صرف رشتہ یہ ہے کہ ایک ہی درسگاہ میں دس برس پہلے انھوں نے پڑھا ہے، یہی بات کم و بیش بڑے مدارس میں تھی۔

پہلی بات

میرے عزیزو! پہلی بات تو یہ ہے کہ جب یہاں آئے ہیں تو اس میں آپ کا سراسر نقصان ہے، فائدہ کچھ نہیں ہے کہ آپ اس کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھیں، اپنے والدین پر آپ کو تعجب ہو،غصہ تو میں نہیں کہتا، تعجب ہو اور تھوڑی سی شکایت کہ ہم کو کہاں بھیج دیا، اس میں

آپ بالکل محروم رہیں گے، آپ کو فائدہ نہیں ہوگا، اب تو شکل یہی ہے کہ آپ اس پر خوش ہوں، اور یہاں آئے ہیں تو ندوۃ العلماء کی تاریخ پڑھیں، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کا تذکرہ پڑھیں، 'حیاتِ شبلیؒ' پڑھیں، اور ضرور پڑھیں، 'حیات عبدالحیؒ' پڑھیں، اور ندوۃ العلماء کی تاریخ پر جو چیزیں ہیں ان کو پڑھیں، اوران سے ذہنی اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں، اس کے تخیل کو، اس کے مقاصد کو جذب کرنے کی کوشش کریں، پھر اس کے بعد جو ماحول یہاں ہے اس کو غنیمت نہیں بلکہ نعمت سمجھیں، آپ یہ سمجھیں کہ ہمارا فائدہ تو یہاں رہنے میں ہے۔

اور میں آپ سے صحیح کہتا ہوں کہ میں ۱۹۵۱ء میں مصر گیا، میری عمر ۳۶-۳۷ سال رہی ہوگی، چالیس سال سے شاید کم ہی تھی، تو مجھے وہاں ایسے لوگ ملے جو سالوں سے تھے اوران کو اس وقت تک عربی بولنی نہیں آتی تھی، اور پتہ لکھتے تو پتہ میں نحوی غلطی کرتے تھے، اور ایک شخص کے درجہ سے واقف نہیں تھے، طٰہٰ حسین بھی زندہ تھے، عباس محمود العقاد بھی زندہ تھے، احمد امین بھی زندہ تھے، منصور علی باشا، احمد باشا اور محبّ الدین الخطیب اور بڑے بڑے اہل قلم جن کے ہم مضامین پڑھتے تھے باحیات تھے، ہم یہاں تمنا کرتے تھے کہ کبھی ان کو دیکھیں، وہ اس زمانے کا آخری عہد تھا، خدا نے مجھے صحیح موقع پر پہنچایا، وہ نسل زندہ تھی، یہی شام کا حال تھا، العلامہ کرد علی، علامہ بہجۃ البیطار اور بڑے بڑے علماء زندہ تھے، پھر اس کے بعد چل چلاؤ شروع ہوا، بعض ۶۰-۷۰ کے پیٹے میں تھے، بعض ۷۵-۸۰ کے پیٹے میں تھے، اور جب جانا شروع ہوا تو وہ قافلہ ایک دم سے چلا گیا، اور مصر خالی ہوگیا، تو میں جب وہاں گیا تو مجھے کوئی چیز نئی نہیں معلوم ہوئی، اس لیے کہ میں تقریباً سب کو پڑھ چکا تھا اور سب کے متعلق اپنے ذہن میں اور اپنے استادوں اور اپنے جس ماحول میں رہتا تھا، ان کے متعلق میرے ذہن میں ایک ترتیب قائم ہوگئی تھی، اوران کی خوبیاں اوران کی کمزوریاں بھی مجھے معلوم تھیں، تقریباً ہر ایک سے میں اس طرح ملا جیسے ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے بلکہ ان سے بھی اتنا واقف نہیں تھا، اس لیے کہ میرا اشتغال عربی ادب اور زبان سے بہ نسبت اردو زبان و ادب کے زیادہ تھا، ویسے گھر کی تربیت اور ماحول کی وجہ سے شعر و شاعری کا عام چرچا تھا، میں ناواقف نہیں تھا، لیکن عرب ادباء کو تو میں، کسی کی پوری پوری کتاب، ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف

میں نے پڑھا تھا، احمد امین کی فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام کا ایک حرف نہیں چھوڑا تھا، اس کے حاشیہ پر میری رائیں لکھی ہوئی ہیں، اور وہ میرے رائے بریلی کے کتب خانہ میں اب بھی موجود ہیں۔ اس لیے آپ یہاں کے ماحول سے فائدہ اٹھائیں، اور اگر آپ یہاں علمی و روحانی ورزش کی نیت کے بغیر اور اس کا ذہن پیدا کیے بغیر یہاں چار چھ برس رہیں گے تو آپ کو فائدہ نہیں ہوگا۔

اللہ کا شکر ادا کریں

دوسری بات یہ ہے کہ جو میسر ہے، جو اللہ نے آپ کو نصیب کیا ہے، اس پر شکر کریں، میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں ندوۃ العلماء کا ناظم ہوں یا بہر حال مجھے اپنے ادارہ کی تعریف کرنی ہے کہ اچھا ہے، بلکہ اس لیے کہتا ہوں کہ میں اس میں آپ کا فائدہ سمجھتا ہوں، اور آپ کا اسی میں فائدہ ہے کہ آپ یہاں آئے ہیں تو اس کو اپنے لیے موضوع ترین جگہ سمجھیں اور اپنے استاذوں کو یہ مقام دیں کہ وہ آپ کی پوری پوری رہنمائی کر سکتے ہیں اور آپ کو پورا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

وقعت پیدا کریں

تیسری بات یہ ہے کہ وقعت پیدا کریں، بغیر وقعت کے بالکل فائدہ نہیں، کوئی کہیں بھی جائے، اگر کوئی معقولات پڑھے اور معقولات کی وقعت نہ ہو تو معقولات کا علم بھی نہیں آئے گا، جب آپ کسی چیز کی افادیت سمجھیں گے تب وہ چیز آپ کو عطا ہوگی، یہ اللہ کی سنت ہے اور یہی انسانی نفسیات ہے۔

اپنے وقت کو کارآمد بنائیں

اور چوتھی چیز یہ ہے کہ آپ اپنے وقت کو کارآمد بنائیں، اور اپنے اساتذہ سے درس کے علاوہ اوقات میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، اور ان سے ارتباط پیدا کریں، اور ان

سے آپ کا ذاتی رابطہ ہو، ان کی مجلسوں میں بیٹھیں، ان کی ہر بات غور سے اور وقعت سے سنیں، اور ذہن میں کچھ سوالات تیار کریں کہ ہم کس ترتیب سے مطالعہ کریں؟ ہم اپنی عربی اچھی کرنے کے لیے کون سی کتابیں پڑھیں؟ کس دور کی کتابیں پڑھیں؟ کن مصنفین کی کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھیں؟ کتاب کے مطالعہ کا کیا طریقہ ہے؟ وہ بتایئے، ایک کتاب ہم پڑھتے تو بہت ہیں لیکن یاد نہیں رہتی، ہم کس طرح اس کا مطالعہ کریں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور آئندہ بھی ہم اس سے کام لے سکیں؟ وہ شاید آپ کو کچھ تجربہ کی روشنی میں بتائیں گے کہ اس کو پہلی دفعہ یوں پڑھیں، دوسری مرتبہ یوں پڑھیں اور نوٹس بھی لیں، اگر وہ اہل قلم ہیں تو ان کی تحریروں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھیں، اور ان کی تقلید کی کوشش کریں، اور وہ جن لوگوں کو بتائیں کہ یہ آپ کے لیے اچھا نمونہ ہیں آپ ان کی تقلید کیجیے، ان کا اسلوب اختیار کیجیے۔

جب مولانا شبلیؒ یہاں تھے ان کی شخصیت بڑی مؤثر اور دل آویز تھی، اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی شخصی کشش عطا کی تھی کہ جو لوگ ان کے پاس بیٹھتے تھے وہ ان کے دل و دماغ میں سما جاتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کے برابر نہ کوئی عالم ہے نہ ادیب، نہ کوئی خطیب، نہ کوئی ذہین نہ کوئی مصنف، اور ان لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچا، ان میں سرفہرست مولانا سید سلیمان ندوی ہیں، انھوں نے گویا مولانا شبلیؒ کو اپنے اندر اتار لیا تھا، ان کی محبت، ان کی عقیدت سے کیا چیز بن گئے تھے، اور پھر دوسرے نمبر پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ہیں، اگر چہ وہ یہاں کے طالب علم نہیں تھے، مولانا عبدالباریؒ ہیں اور اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ہیں، حاجی معین الدینؒ احمد صاحب ندوی ہیں، مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم ہیں، اور بعض لوگ ان کو مولانا شبلی کے اسلوب کو اخذ کرنے اور اس کو کامیابی سے نقل کرنے میں سید صاحب پر بھی ترجیح دیتے ہیں، سید سلیمان ندوی کی تو ایک دوسری شخصیت ہی پیدا ہوگئی تھی، ان میں دو شخصیتیں مل گئی تھیں، ان کی اپنی شخصیت جو بعد میں اپنی محنت سے (Develop) انھوں نے پیدا کی، اور خود ان کے خاندانی اثرات، اور وہ شخصیت جو مولانا شبلیؒ کی صحبت میں بنی، لیکن مولانا عبد السلام کی شخصیت اکہری تھی، وہ مولانا شبلیؒ ہی کے اثر سے پیدا ہوئی، تو اس کا اتنا اثر پڑتا ہے۔

اور ہم نے اپنے زمانے کے طالب علموں کو بھی دیکھا ہے کہ وہ اپنے استاد سے ذہنی طور پر جتنے زیادہ مربوط تھے، اخلاقی طور پر اتنا ہی ان پر استادوں کا عکس آیا ہے، یہاں تک کہ چال ڈھال میں بھی فرق پڑ گیا ہے۔ ہاں! مولانا شبلی سے استفادہ کرنے والوں مین ایک نام میں بھول گیا، ان پر مولانا شبلیؒ کا بڑا اثر تھا، مولانا آزاد نے مولانا شبلی سے پورا فائدہ اٹھایا اور وہ بڑے ان کے قدرداں تھے اور مولانا شبلی بھی ان کے بڑے قدر شناس تھے، تو یہ ذاتی فائدہ ہے۔

جن لوگوں کا مولانا سے ایسا رابطہ تھا، ہر وقت ان کی مجلس میں اٹھتے بیٹھتے تھے، ان کے مشورہ کے مطابق تقریر تیار کرتے تھے، مضمون لکھتے تھے، کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، تو وہ جو مولانا شبلی کا خاص فن ہے اور ان کا جو طرز تحریر ہے اور جو طرز استدلال ہے، اس میں ان کے بڑے کامیاب متبع ہوئے۔ مولانا عبدالماجد کہتے تھے کہ اگر مولانا نے مجلس میں کوئی شعر پڑھ دیا تو ہم سمجھتے تھے کہ بس شاعر کو سند مل گئی، اب کچھ پوچھنا نہیں، بس فوراً یاد ہو جاتا تھا، مولانا شبلیؒ نے اس شعر کی تعریف کی ہے، اس شعر پر داد دی ہے۔

اسی طریقہ سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ جس استاد، ایک یا دو استاد یا پورے مجموعہ کو اگر وہ مقام دے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کو پورا فائدہ پہنچتا ہے، پھر جب وہ منزل طے ہو جاتی ہے اور اللہ کو منظور ہوتا ہے تو ایک منزل خود بخود آ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کو جن لوگوں سے کام لینا ہوتا ہے، ان کو پھر آگے کے رہبر بھی مل جاتے ہیں، لیکن اگر پہلے ہی رہبر کی آدمی ناقدری کرے، اور اس کو ہر وقت تنقید کا نشانہ بنائے اور اس کے نزدیک اصول مسلم یہ ہو جائے کہ وہ ناقص ہے، تو پھر اس کا یہ مزاج بن جاتا ہے اور ہر چیز میں سب سے پہلے وہ عیوب ڈھونڈتا ہے، تنقید اپنے وقت پر اپنی مقدار سے اور تناسب سے ہو تو یہ بہت ضروری ہے، ہر چیز توازن کے ساتھ بہت صحیح ہے، لیکن جب تناسب بگڑ جاتا ہے اور مزاج میں فساد پیدا ہوتا ہے تو یہ مضر ہوتی ہے، تنقید کا ایسا مزاج نہیں بنانا چاہیے کہ پہلے ہر چیز کو اعتراض اور شبہ اور تنقید کی نظر سے دیکھے اور پھر اس کے بعد اس کا ذہن بدل جائے تو الگ بات ہے۔ نہیں! ہر چیز کو پہلے اس نظر سے دیکھیے کہ ہمارے لیے مفید ہے اور ہمیں ضرور اس سے فائدہ ہوگا، ہمیں سنجیدگی سے اس کو دیکھنا چاہیے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس کے بعد اگر اس میں

کوئی خامی، کچھ جھول، کچھ ناہمواری نظر آئے تو کوئی حرج نہیں، اگر ضرورت ہو تو اس کا اظہار بھی کرے۔

میرے عزیزو! آپ کو اس وقت یہ کرنا ہے کہ آپ اس نیت کے ساتھ یہاں رہیں، میں نے ورزش کی مثال دی، نماز کی مثال دی، حج کی مثال دی، اس کے بغیر فائدہ نہیں ہوگا، ہم جہاں آئے ہیں یہ اتفاقی بات نہیں ہے ﴿ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾ [(۱)]، ﴿وَجِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَامُوسَىٰ﴾ [(۲)] یہ بھی آپ پڑھ سکتے ہیں، اللہ نے ہماری صحیح رہبری کی اور ہم یہاں غلطی کر کے نہیں آ گئے، کہ چاہا تھا کہیں اور جانا اور پہنچے کہیں اور، آپ اپنے استادوں سے پورا فائدہ اٹھائیں، اپنے ماحول سے فائدہ اٹھائیں، اور یہ بہت کچھ آپ پر منحصر ہے، آپ کے شوق پر منحصر ہے، آپ کی طلب کے مطابق سطح بلند ہوتی چلی جائے گی، آپ کے شوق اور تیاری کی سطح جتنی بلند ہوگی اتنا ہی اللہ تعالیٰ آپ کو بلند کر دے گا، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ [(۳)]

---

(۱) سورۃ یس: ۳۸ (۲) سورۃ طہ: ۴۰

(۳) المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي، ندوة العلماء (لکھنؤ) کے قاعۃ المحاضرات میں دراسات عالیہ وعلیا کے طلبہ کے سامنے ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں کی گئی تقریر، اسے مولانا شاہ ابو دجانہ تسنیم عثمانی ندوی نے قلمبند کیا، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۱ء)۔

ایک بڑی ضرورت

اس مرتبہ اپنے آخری سفر اردن کے نتائج اور اس کے بعض روشن پہلو المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي کے طلبہ اور دار العلوم کے نوجوان اساتذہ کے سامنے رکھنے کی میں نے خودخواہش کی، مگر میرے ذہن میں یہ تھا کہ ایک محدود تعداد ہوگی، یہ بالکل تصور میں نہیں تھا کہ دار العلوم کے اس وسیع ہال میں اساتذہ وطلبہ کی اتنی بڑی تعداد ہوگی، بہر حال مجھے جو بات کہنی ہے وہ ایسی نہیں کہ محدود حلقہ سے باہر نہیں کہی جائے، سب ہی طلبہ اس کے مخاطب ہیں، اور اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، میں سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں، اور اس کا مرکزی نقطہ کیا ہو، لیکن جیسا کہ بارہا تجربہ ہوا ہے، قرآن اس سلسلہ میں رہنمائی کرتا ہے، قاری کو کوئی ہدایت یا کوئی تاکید پہلے سے نہیں ہوتی لیکن حسن اتفاق سے قاری ایسی تلاوت کرتا ہے کہ ایک راہ مل جاتی ہے، اس سے ذہن کو انشراح ہو جاتا ہے۔

اس وقت بھی قاری نے جو آیت پڑھی، اس سے میرے ذہن کو رہنمائی مل گئی، انشراح ہوگیا، وہ آیت ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْماً جَهُوْلاً﴾ (۱)

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مراد ایک تو وہ عمومی امانت ہے جس میں تمام مؤمنین شریک ہیں، ایک وہ امانت ہے جو علماء کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ اپنے علم ومعرفت سے فائدہ پہنچائیں، اور دینی فراست، دینی بصیرت اور صلاحیت سے دین کی اشاعت ودعوت کا کام کریں۔

اس آیت کی روشنی میں میں اپنے احساس اور تاثر میں آپ کو شریک کرنا چاہتا ہوں،

---

(۱) سورة الأحزاب: ۷۲

اس سفر سے میرے اندر جو نئی تحریک اور نئی طاقت پیدا ہوئی، اس کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت عالم اسلام کا اصل اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ قوموں کی قیادت کر سکتے ہیں، اور ملکوں کی زندگی کا سانچہ بنا سکتے ہیں، ان کے لیے نئے رخ متعین کر سکتے ہیں، یہ وہ طبقہ ہے جو یا تو اسلام سے باغی ہے اور ذہنی وتہذیبی لحاظ سے ارتداد کا شکار ہے، یا جو طبقہ ملکوں کی قیادت کر سکتا ہے، مغربی زبانوں سے واقفیت، سیاسی نظاموں سے واقفیت اور سیاسی کاموں کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کی جو صلاحیت اس نے پیدا کر لی ہے، اس کے بنا پر جو طبقہ سارے اسلامی ملکوں میں حاوی ہے، ان کی قسمتوں کا مالک بنا ہوا ہے، (اگر یہ تعبیر صحیح ہے) یہ وہ لوگ ہیں جن کو یا تو اسلام پر اعتماد نہیں، یا وہ اسلام کو اس زمانہ کے لیے مفید اور کارآمد نہیں سمجھتے، وہ اسلام کو ایک ضائع شدہ طاقت سمجھتے ہیں، جیسے ٹارچ جس کے سیلس ختم ہو گئے ہوں، اس سے روشنی نہیں پھیل سکتی، ان کے ذہنوں میں جو بات بیٹھی ہوئی ہے جیسا کہ میں نے اردن کی ایک تقریر میں کہا تھا کہ خدا اسلام کا بھلا کرے کہ اس نے ایک زمانہ میں بڑا اچھا کردار ادا کیا تھا، وأد بنات روک دیا تھا، عورتوں کے کچھ حقوق دلا دیے تھے، کچھ انسانیت کا احترام پیدا کر دیا تھا، اس زمانہ کی حد تک اسلام مفید تھا، اب اس ترقی یافتہ زمانہ میں اسلام کا کوئی حصہ نہیں، اور کم از کم قیادت میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

یہ وہ طبقہ ہے جو اس وقت عالم اسلام میں برسر اقتدار ہے، اور سارے مسلم عوام کو ریوڑ کی طرح ہانکتا ہے، اور اب چونکہ حکومت کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے، پہلے حکومتوں کے صرف تین چار کام ہوتے تھے، زمین کا ٹیکس، محاصل وغیرہ وصول کرنا، کلکٹر اور قاضی وغیرہ اپنے اپنے زمانہ کی اصطلاحات کے مطابق منتظمین متعین کرتے، اور بیرونی حملوں سے ملک کی حفاظت کرنا، بس یہ چار کام ہوتے تھے، لیکن تعلیم کا کیا سانچہ ہو؟ اس کا مقصد ونصاب کیا ہو؟ اس سے ان کو کوئی بحث نہیں تھی، تعلیم گاہیں اور مدارس آزاد تھے، مسلمانوں کے شخصی قانون نکاح وطلاق اور میراث وغیرہ میں ان کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، اس میں دخل دینے کو وہ نہ صرف شرعاً بلکہ سیاسۃً وحکومۃً بھی ناجائز سمجھتے تھے، لیکن اب یہ حالت نہیں، اب زندگی کے ہر مسئلہ سے ان کا تعلق ہے، وہ دخل دے سکتے ہیں، بلکہ دخل دینا فرض سمجھتے ہیں، اب اس

وقت حکومتوں کا رخ کلیت کی طرف ہے کہ عوامی زندگی کے جتنے شعبے ہیں، سب ایک خاص نہج پر حکومت کی منشا کے مطابق چلیں، اس میں تعلیم کا نظام، معاشرت، تمدن، پرسنل لاء، صحافت، تصنیف وتالیف اوراظہار خیال کے جتنے ذرائع ہیں سب آ جاتے ہیں۔

میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت عالم اسلام کی خرابی، اس کے تشکک، اس کی دینی کمزوری، اس کی بے راہ روی اس کے ذہنی انحراف میں سب سے بڑا حصہ خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کا ہے، وہی حاوی ہے، وہی غذا پہنچاتا ہے، وہی خیالات کو مسموم کرتا ہے، وہی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے، اور خاص طور پر آزاد ممالک کا مسئلہ تو تنہا یہ ہے کہ آپ ایک طرف مراکش سے انڈونیشیا تک چلے جائیں، یا کمیونسٹ خیالات البعث العربي کا منتشر دستور ملے گا، سعودی عرب کے خاندان کی حد تک آپ مستثنیٰ کر سکتے ہیں، ورنہ ہر جگہ طبقۂ مثقفہ ترقی پسندی کے انھی خیالات کا اظہار کرتا ہے، کبھی آزادی نسواں پر، کبھی یہ کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں کیوں نہ دفتر میں ملازم رکھی جائیں؟ اس پر مضامین نکلنے شروع ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بہن کا حصہ بھائی سے آدھا کیوں ہے؟ شیخ عبداللہ بن باز نے اس پر نوٹس بھی لیے، مجھے لوگوں نے بتایا کہ ایسے خیالات کی تردید میں مضامین لکھے جاتے ہیں، مگر وہاں کے عربی اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔

اس وقت پورے عالم اسلام کی حالت یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ ذہین اور صاحب دماغ طبقہ مغرب کی تعلیم سے اور مغربی افکار سے پورے طور پر متاثر ہو چکا ہے، اور وہ نہ صرف ان کا قائل ہے بلکہ ان کا داعی ہے، اس کے پاس دعوت کے اور خیالات کو اخذ کرنے کے وہ ذرائع و وسائل ہیں جو ہو سکتے ہیں، یہ حال ہے ان ممالک کا جن کا میں نے نام لیا ہے، بقیہ کا اسی پر قیاس کر لیجیے، الجزائر، تونس، لیبیا وغیرہ سارے ممالک عربیہ کا یہی حال ہے۔

میں آپ سے خصوصاً المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي کے طلبہ اور نوجوان اساتذہ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فکری و تصنیفی میدان میں خیالات کو درست کرنے اور اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور اسلام کی عظمت وضرورت کو دوبارہ ذہن میں جاگزیں کرنے کے لیے جو کام اس ملک میں جس سطح پر ہوا ہے، اسے آپ حقیر نہ سمجھیں، آپ ان تمام عوامل

اور ارتباطات اور کوششوں کے ساتھ اس کے لیے تیار رہیں۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جب میں یمن پہنچا تو وہاں کے متعدد معتمد وثقہ اور ذمہ دار لوگوں نے بتایا کہ اس ملک کو کمیونسٹوں کے قبضہ میں جانے اور ارتداد کے شکار ہو جانے سے جن پندرہ آدمیوں نے بچایا، یہ وہ لوگ تھے (مجھے آپ سے کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ آپ ایک خاص ماحول میں رہتے ہیں) جنھوں نے مولانا سید ابوالاعلی مودودی، سید قطب شہید اور ابو الحسن علی ندوی کی کتابیں پڑھی تھیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ سیاسی انقلاب یا کمیونسٹ حکومت کے قبضہ کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے، مستقبل کو بدلنے، آئندہ نسلوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے کیا وسائل پیدا ہو گئے ہیں، اور لوگوں کا ذہن کیا کام کرتا ہے۔

آپ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کام آپ کے یہاں لکھنے پڑھنے کا ہو رہا ہے، یہ حقیر نہیں، ہم نے الحمدللہ ایسے ملکوں اور ایسے طبقوں میں ان کوششوں کو پہنچتے ہوئے پایا جہاں ایک بڑا ممتاز طبقہ اس سے متاثر ہے، اس کا محرک اس ندوۃ العلماء کی بنیاد ہے، جس کی بنیاد مولانا محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ (میں ان دونوں کے نام خاص طور پر لیتا ہوں) نے رکھی اور جس کی تعمیر و ترقی میں ان دونوں کا بنیادی حصہ ہے، انھوں نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا کہ اب ہوا کا رخ عوام کی طرف سے آنے والے انقلابات کی طرف نہیں جو فوجوں کے راستے سے آئیں گے، بلکہ اب جو انقلابات آئیں گے وہ خیالات وافکار کے لشکر سے آئیں گے اور فکری راستوں سے آئیں گے۔

آپ اس چیز کو ذہن میں رکھیں، اردو عربی میں دعوت کا کام اور افکار و خیالات کے نشر و اشاعت کی قیمت سمجھیں، عربی تعلیم یافتہ طبقہ پڑھنے لکھنے کا مریض ہے، آپ اس کو غذا دیں، آپ اپنے کو دینی، علمی ہر حیثیت سے دعوت کے لیے تیار کریں، اسی کے لیے المعهد العالي للدعوة و الفكر الإسلامي کی بنیاد پڑی ہے، اس کو اس وقت کا جہاد اور عبادت سمجھیں، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔[1]

---

(۱) ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق اگست ۱۹۸۴ء میں کی گئی ایک تقریر کا خلاصہ، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' (شمارہ ۲۵/ اگست ۱۹۸۴ء)۔

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دو ستون

میرے عزیزو اور بھائیو!

انسان کے غور کرنے کے لیے، اپنی زندگی کو بنانے اور ترقی دینے کے لیے، اور اپنی سیرت بہتر ثابت کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کوئی نامعلوم حقیقت یا کوئی نئی بات کہی جائے، عام طور پر جن حقیقتوں پر انسان کی زندگی کی اصلاح وترقی کا دارومدار ہوتا ہے، وہ آشکارا ہیں، اور خود اللہ کے آسمانی صحیفوں میں، اللہ کے محبوب بندے انبیاء (علیہم السلام) کی سیرت وواقعات میں اور پھر اللہ کے مخلص ومقبول بندوں کے حالات میں وہ حقیقتیں موجود ہیں اور اکثر مکرر آئی ہیں، جس طریقہ سے کہ انسان کی مادی وجسمانی زندگی کا دارومدار جن چیزوں پر ہے، وہ عام ہیں، ان میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، اسی طرح جو بنیادی باتیں ہیں، انھیں بھی معلوم کرنے کے لیے کسی پہیلی کا بجھانا یا کہیں دور کی کوڑی لانا ضروری نہیں۔

اصل میں وہ رابطہ اصل ہے جو انسان کے حدود اور انسان کی قوت ارادی اور ایک طے شدہ حقیقت یا ایک صحیح علم کے درمیان ہونا چاہیے، یہ رابطہ کبھی مضبوط ہوتا ہے اور کبھی بہت کمزور ہوجاتا ہے، ایسا کمزور ہوجاتا ہے کہ اس کا کوئی اثر زندگی پر نہیں ہوتا، مادی زندگی ہو، یا روحانی واخلاقی زندگی، یا علمی وشعوری زندگی ہو، سب میں اس رابطہ ہی کا کھیل ہے، پھر انسان کے شعور، قوت ارادی، موجودات کے حقائق کے درمیان اس رابطہ ہی کو قائم کرنے اور مضبوط کرنے کے لیے انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت ہوتی رہی ہے۔

میں اس وقت ایسی ہی باتیں آپ لوگوں کے سامنے کہنے جارہا ہوں، جو صرف ذکر و انبساط کے درجہ میں نہیں اترتیں، جتنی اچھی باتیں ہیں اکثر لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں، صرف

ان اچھی باتوں پر عمل کرنے کا جذبہ وفیصلہ کمزور ہو چکا ہوتا ہے، کچھ ایسے موانع پیدا ہو جاتے ہیں جو اس جذبہ کو سلب کر لیتے ہیں، اور عزم کو ختم کر دیتے ہیں، کسی عزم کو تازہ کرنا، جذبہ کو گرم کرنا اور اس کو فروزاں کرنا یہی انبیاء (علیہم السلام) کا پھر اپنے اپنے زمانے کے داعیوں کا کام ہوتا ہے۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ ان قصوں میں ہے جو قرآن میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، اور جن کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هَـٰذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ﴾ (۱) اور ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرَىٰ وَلَـٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (۲) یہ سارے کے سارے قرآن مجید میں جو ارشادات ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ سے انسانی زندگی کی تعمیر و ترقی میں اور انسان کو مدارج عالیہ تک پہنچنے میں بڑی رہنمائی ہو سکتی ہے، اور اس میں بڑی تسلی و تسکین کا سامان موجود ہے، جب حضرت یوسف (علیہ السلام) کی بحیثیت عزیز مصر اپنے بھائیوں سے گفتگو ہوئی اور انھوں نے کہا کہ کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے یوسف اور ان کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ تو وہ سب ایک دم سے چونک پڑے، اس لیے کہ یہ قصہ یا تو خدا کو معلوم ہے یا یوسف کو، اور ظاہر ہے یہ خدا تو ہو نہیں سکتے، چنانچہ انھوں نے بڑے اچنبے کی حالت میں کہا کہ ﴿أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوْسُفُ﴾ ارے کیا آپ یوسف ہیں؟ انھوں نے کہا: ﴿أَنَا يُوْسُفُ وَهَـٰذَا أَخِيْ﴾ میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔

اب یہاں پر میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھنے والا پوچھے کہ ایک آیت کا انتخاب کیجیے جو یکساں سب پر صادق آسکے، تو میں کہوں گا کہ ہاں وہ آیت یہ

(۱) سورۃ یوسف:۲ (۲) سورۃ یوسف:۱۱۱

ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ ﴿ أَنَا يُوسُفُ وَهَـٰذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ یہ کلام نبوت ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، صاف یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ خدا کے محبوب و مقبول نبی، ایک عارف باللہ اور صرف عارف باللہ نہیں بلکہ ایک نبی عارف باللہ کا جو مقام ہوتا ہے اس مقام سے وہ بول رہا ہے، اس موقع پر دس باتیں کیا پچاس باتیں کہی جا سکتی تھیں، میں نے بڑی قربانیاں دیں، میں نے بڑی تکلیف برداشت کی، میں کون ہوں، میں پیغمبر زادہ ہوں، میرے باپ بھی پیغمبر تھے، میرے دادا بھی پیغمبر تھے، اور جیسا کہ ان کے بارے میں نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا تھا کہ یوسف بن الکریم بن الکریم بن الکریم، یعنی یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم، تین تین چار چار پشتیں پیغمبر چلی آ رہی ہیں، یہ کہہ سکتے تھے میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا؟ میں کس گھر کا چراغ ہوں؟ میں کس کا بیٹا، کس کا پرپوتا ہوں؟ اور پھر خدا نے مجھے عقل دی ہے، ایسی عقل کہ آج یہاں تخت پر بیٹھا شاہ مصر بنا ہوا، اگر یہ روایت صحیح ہے کہ ان کو خود مختاری حاصل نہیں تھی تو بادشاہ کا معتمد و نائب بنا ہوا، اور اگر یہ روایت صحیح ہے کہ بالکل ان کے ہاتھ میں حکومت آ گئی تھی تو مصر کے خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے دیکھو، میں نے کیسا انتظام کیا ہے، اور غلہ کی تقسیم کس طرح کر رہا ہوں، وہ یہ سب کہہ سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کہا، بالکل معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلوائے جو نبی کے شایان شان ہیں۔

اگر بہت بڑے بڑے عقلاء، بڑے بڑے عارف باللہ، بڑے بڑے حکماء، اور بڑے بڑے مذاہب کے رمز شناس بیٹھ کر تلاش کریں کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟ اگر وہ ہفتوں اور مہینوں سوچیں تو اس سے بہتر جواب نہیں مل سکتا جو یوسف (علیہ السلام) نے دیا، جس میں ان کی نبوت کا ظہور بھی ہے اور ایمان کی حکمت اور اس کی معرفت بھی، صحیح بات تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی کارنامہ نہیں، ہمارا کوئی کمال نہیں، ﴿ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ﴾ اللہ ہی نے ہم پر احسان کیا۔

قانون الٰہی

پھر اس کے بعد وہ بات کہتے ہیں جو قیامت تک سب کام کرنے والوں کے لیے،

زندگی کے مرحلوں سے جن کو گزرنا ہے، جن کو مختلف آزمائشیں پیش آتی ہیں، ان کے لیے دشوار سے دشوار ترین حالات میں، نازک سے نازک ترین مواقع پر، پیچیدہ سے پیچیدہ حالات رکھنے والے ممالک میں، تاریخ کے دوروں میں اور ہر ماحول میں جو بالکل شمع کا کام کرسکتی ہے، وہ ہدایت یہ فقرہ ہے جسے میں آپ کے سامنے آج پھر دہراتا ہوں کہ انھوں نے اپنے متعلق تو کہا اور اس کے بعد قیامت تک لیے ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ [۱]، جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کو کلمہ باقیہ بنا کر چھوڑ دیا گیا، گویا ایک شمع ہدایت، ایک عالمی بصیرت اور ایک دستور العمل بنا کر چھوڑ دیا کہ دیکھو میرا اور میرے بھائی ہی کا معاملہ نہیں، خدا کا اصول یہ ہے ﴿وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾، ہر نسل کے لیے، ہر قوم کے لیے، ہر جماعت کے لیے، ہر ادارے کے آدمیوں کے لیے، مجاہدین اسلام کے لیے، اللہ کا کلمہ بلند کرنے والوں کے لیے، اصولوں اور صحیح مقاصد پر قائم رہنے والوں کے لیے، سب کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ قانون یہ ہے، الفاظ کی عمومیت دیکھیے کہ ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، اسم موصول اور اس کے ساتھ جو افعال و متعلقات ہیں، وہ سب بتاتے ہیں کہ مَنْ کون ہے، یہ جس کے متعلق کہا جا رہا ہے، ان کی کیا صفات مطلوب ہیں؟ وہ کون لوگ ہیں ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ خدا کا عام قانون یہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں جو تقویٰ اور صبر دو باتوں پر عمل کرے گا، ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ 'اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرے گا'، اس میں بھی عمومیت و اطلاق ہے، اگر وہ فرما دیتے کہ اس کو بادشاہی ملے گی، اس کو سرداری ملے گی، اس کو پیشوائی ملے گی، اس کو رزق وافر ملے گا، اس کو عزت ملے گی، اس کو قیادت ملے گی، سب محدود و معین چیزیں ہیں، اس کو بھی پسند نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ الفاظ بلوائے ہیں جو اول سے آخر تک سب کے لیے بالکل عام الفاظ ہیں، یہ کلیہ قاعدہ ہے اور سب انسانوں کی میراث ہے، اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔

---

(۱) سورۃ الزخرف:۲۸

تقویٰ کا مفہوم

﴿إِنَّـهُ مَن يَّتَّـقِ وَيَـصْبِرْ﴾ ، جو خدا سے ڈرے گا، اور نا مناسب چیزوں سے پرہیز کرے گا، تقویٰ کے معنی کیا ہیں؟ تقوی کے معنی صرف خوفِ خدا یا کثرتِ عبادت کے نہیں جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ تقویٰ ایک ایسا مثبت عمل ہے جس میں منفی شامل ہے، بعض مثبت عمل وہ ہوتے ہیں جو نفی پر مشتمل ہوتے ہیں، یعنی مجموعہ ہوتے ہیں مثبت و منفی اور ایجاب و سلب کا، تقوی وہی چیز ہے جس میں ایجاب و اثبات بھی ہے لیکن نفی پر وہ قائم ہے، اور وہ ہے ان تمام چیزوں سے بچنا جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کے یہاں خصوصیت حاصل کرنے اور زندگی کی کامیابی کے منافی ہوں، پہلی چیز ہے پرہیز اور دوسری چیز ہے عمل، یعنی یوں کہہ لیجیے پرہیز اور رضا، یا پرہیز اور توازن، ﴿إِنَّـهُ مَن يَّتَّـقِ ﴾ تو ہے پرہیز اور ﴿يَـصْبِر﴾ ہے علاج یا رضا، بس دو چیزیں ہیں جو ان نامناسب چیزوں سے جن کا تعارض ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں کی کامیابی سے، اس کے نزدیک کامرانیوں اور مقبولیت سے، اس کے یہاں کی محبوبیت سے اور اس کا مؤید، موفق اور منظور بننے سے، ان سے تو کرے پرہیز، ان کو ہاتھ نہ لگائے، اور ان سے دور رہے، پھر اس کی تعلیم پر عمل کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں اس کو برداشت کرتا رہے، یہ ہے صبر یعنی وہ استقامت دکھائے اور مشکلات کو برداشت کرے۔

پھر فرماتے ہیں: ﴿فَـإِنَّ الـلّٰـهَ لَا يُـضِيـعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ ، یہ ایسی بات ہے جیسے باشاہ کہے کہ اگر کسی نے ایسا ایسا کیا تو پھر ہم دیں گے، اور ہم ابھی نہیں بتاتے کہ کیا دیں گے، اسی وقت معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا دیں گے؟ تو آدمی کیا کیا سوچ سکتا ہے، یہاں بھی انھوں نے ایسی بات کہی جو بالکل ہر شخص کے لیے مناسب حال ہے، اگر بادشاہی کہتے تو ہر ایک کے لیے بادشاہی مناسب نہیں، اور ہر ایک کے لیے یہ نعمت بھی نہیں، اسی طرح سے حکومت بہت سے لوگوں کے لیے بڑا امتحان بلکہ سزا ہے، ایسے ہی دولت بھی ہر شخص کے لیے مناسب نہیں، اسی طرح کوئی بھی چیز آپ طے کیجیے گا وہ سب کے لیے مناسب حال نہیں

ہوسکتی، لیکن ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، میں ایسی چیز آ گئی ہے جو سب پر حاوی اور سب کے مناسب حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کے اور دین کے کام کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، جو کچھ دے گا، وقت پر دیکھنا۔

تو میرے عزیزو! جو کسی صحیح مقصد کے لیے کہیں اپنی زندگی کا کوئی وقفہ، کوئی مدت صرف کریں، وہ کسی راہ کے مسافر ہوں، اور کسی کارواں کے وہ شریک ہوں، ان کے لیے سب سے بڑھ کر کامیابی کی ضمانت دو چیزیں ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبان سے نکلوایا ہے، اور انسانی نسلوں کے لیے چھوڑا ہے ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ کہ دو باتیں کرنی ہیں، خدا کی شان کے نامناسب چیزوں سے اور مقصد کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز و احتیاط، اور مقصد کے حصول کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو برداشت کرنا، بس اس کے بعد کیا مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس کا تعلق اللہ سے ہے، ہم سے نہیں۔

تقویٰ اور صبر کامیابی کے دو ستون

میرے عزیزو! بس یہی بات ہے کہ اس وقت آپ کسی عمر کے ہوں، کسی درجہ کے طالب علم ہوں، آپ کسی خاندان اور برادری سے تعلق رکھتے ہوں، آپ کہیں سے آئے ہوں، اور آپ کے دل میں کیسے کیسے ولولے اور ارمان ہوں، سب کے لیے راستہ یہی ہے کہ ہم دو چیزوں پر عمل کریں، ایک تو یہ کہ ہمارے مقصد، یہاں کے اصول وضوابط، شرائط اور ضروریات ولوازم سے جو چیزیں میل نہیں کھاتیں، اور جن کا ان سے جوڑ نہیں ہے، ان سے تو پرہیز کریں، اور احتیاط برتیں، اپنی خواہشات پر قابو پالیں اور دل ماریں، تھوڑا سا بس اور کچھ نہیں، تقویٰ اور صبر، یہ دو چیزیں ہیں جو بالکل کافی ہیں، یہ دو ستون ہیں جن پر ہمارے مستقبل کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

اگر آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ وقت ضائع نہ کریں، غلط جگہوں پر نہ جائیں، غلط جگہوں میں نہ بیٹھیں، غلط مشاغل میں آپ وقت صرف نہ کریں، تو یہ سب تقویٰ کے تحت آجاتے ہیں، تقویٰ ایسی چیز نہیں کہ وہ صرف اولیاء اللہ ہی کے لیے ہو، وہ ہر ایک کے مناسب

حال، اس کی سطح پر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتا ہے، ایک سپاہی کا تقوی ہے، ایک مجاہد کا تقوی ہے، ایک طالب علم کا تقوی ہے، ایک داعی کا تقوی ہے، سب کا تقوی ہے، لیکن اس کی شکلیں مختلف ہیں، قدر مشترک اس میں نامناسب چیزوں سے بچنا ہے، آپ اپنا تقوی اختیار کریں، جو آپ کے مناسب حال ہو، اور آپ کی طالب علمانہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ باہر جارہے ہیں، جہاں آپ کے کان میں نامناسب چیزیں پڑ رہی ہیں، اور آپ کی نظروں کے سامنے آرہی ہیں، نامناسب جگہوں میں آپ دیکھے جارہے ہیں، جہاں کے سائے سے آپ کو بھاگنا چاہیے، اور جس کے نام سے آپ کو نفرت ہونی چاہیے، وہاں لوگوں نے دیکھا کہ آپ تماشوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، ایسے تماشہ کی مجلس میں جانا اور اس میں وقت صرف کرنا، باہر شہر میں ایسے لوگوں سے دوستیاں قائم کرنا جو آپ کے ساتھ کوئی مجانست و مشارکت نہیں رکھتے، یہ ساری چیزیں آپ کے تقوی کے خلاف ہیں، اتنا تقوی آپ اختیار کر لیجیے اور اس پر عمل کیجیے اور اس کے ساتھ ساتھ اس راہ میں جو تھوڑی سی آزادی محدود و مقید ہو جاتی ہے، اس کو آپ برداشت کر لیجیے، پھر تھوڑی سے محنت کرنی پڑتی ہے، تھوڑا سا جاگنا پڑتا ہے، نمازوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے، درجوں میں وقت پر جانا پڑتا ہے، اور سبق کی تیاری اور اس کا مطالعہ و آموختہ یہ سب ان میں آتے ہیں، اس وقت جو آپ کو تفریح کے مواقع اور معاشی مواقع حاصل ہو سکتے ہیں، تھوڑا سا ان سے صرف نظر کر لیں، اور کسی بلند مقصد پر نظر جمائیں، اور اپنے کو کسی بڑے کام کے لیے تیار کریں، یہ سب ان میں آتا ہے جن کو یوسف (علیہ السلام) نے ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ میں بیان کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی، قرآن مجید میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا کلام نہیں رہا، بلکہ اب تو وہ اللہ کے کلام میں شامل ہو گیا، قیامت تک کے لیے وہ شہادت ہے اور قابل عمل ہے، ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ﴾ جو کچھ احتیاط کرے گا، نامناسب چیزوں سے اپنے کو بچالے گا اور صبر سے کام لے گا، وہ اللہ کی قدرت کا تماشہ دیکھے گا ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾، جس درجہ کا احسان ہوگا، اس درجہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا ملے گی۔

میرے عزیزو اور بھائیو! یہی باتیں آپ سے کہنی تھیں، ہر ایک آدمی کے موافق اور اس کے مقام کے مطابق بات کہی جاتی ہے، ایک مدرسہ اور پھر دار العلوم ندوۃ العلماء جس کی دنیا میں شہرت و عزت ہے، عام بھائیوں کو معلوم بھی نہیں کہ دنیا کس نظر سے دیکھتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل سے (یہ اللہ تعالیٰ کا ایک امتحان ہے اور وہ اس امتحان میں کامیاب کرے) اس وقت جیسے ایک ہوا چلا دی ہو، من جانب اللہ ایک چیز پیدا ہوگئی ہے، مجھے واسطہ پڑتا ہے اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ یا اللہ تو ہی عزت رکھ، کس قدر لوگ اس وقت ہندوستان سے باہر ممالک عربیہ میں اور دور دراز ملکوں میں ندوہ کو، ندوہ کے طالب علموں کو، اور ندوہ سے تعلق رکھنے والوں کو دیکھتے ہیں، اس کا اندازہ ہی نہیں، ایسی حالت میں پست اور نا قابل ذکر چیزوں کا نام لیں اور کہیں کہ ارے بھائیو، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والوں کی تقلید نہ کرو، ان کا لباس اختیار نہ کرو، ان کا شعار اختیار نہ کرو، تمھارے بال ایسے نہ ہونا چاہیے، ایسے ہونا چاہیے، تمھاری صورت ایسی ہونی چاہیے، تو یہ سب باتیں آپ کے مقام سے فروتر ہوں گی، اور ہماری زبان ساتھ نہیں دے سکتی کہ میں ایسی باتیں آپ سے کہوں، آپ کا مقام اور آپ کا معیار بہت بلند ہے۔

بس آپ تقوی اور صبر اختیار کرلیں، یہ دو شہپر ہیں جن سے آپ اونچی سے اونچی سطح میں اور بڑے سے بڑے آفاق میں پرواز کر سکتے ہیں، اور یہ کوئی ایسی مشکل و ناممکن بات نہیں، ورنہ اس طرح عمومیت کے ساتھ نہیں کہی جاتی، تاریخ میں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے واقعات ہیں کہ لوگوں نے تھوڑا سا اس پر عمل کیا اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے، آپ علماء اسلام کی تاریخ پڑھیے، آپ تاریخ دعوت و عزیمت پڑھیے، آپ اور مشاہیر اسلام کے تذکرے پڑھیے، سب میں آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں لوگ انھی دو چیزوں سے کامیاب ہوئے: تقویٰ اور صبر، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے ۱۶/ جمادی الاولی ۱۴۰۵ھ (فروری ۱۹۸۵ء) میں کی گئی ایک تقریر، یہ تقریر عبد الحکیم رانچوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ مارچ ۱۹۸۵ء)۔

چار باتیں

میرے عزیزو اور بھائیو! دار العلوم اور اکثر دینی مدارس کا دستور یہ رہا ہے کہ تعلیمی سال کے آغاز میں مدرسہ کا کوئی ذمہ دار تقریر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، ہمیں اس سال کس طرح مدرسے کے نظام اور اس کے ماتحت مختلف شعبوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یا پھر سال کے اختتام پر تقریر ہوتی ہے، جو طلبہ فارغ ہو کر جا رہے ہوتے ہیں، ان سے خاص طور پر خطاب ہوتا ہے کہ آپ نے جو کچھ یہاں سے حاصل کیا ہے، اس سے کیا کام آپ کو لینا ہے اور اپنے آپ کو ملک وقوم کے سامنے کس طرح پیش کرنا ہے؟ جن طلبہ کو دوسرے سال آنا ہوتا ہے ان سے یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے خاندان، علاقے اور ماحول میں کس طرح کا نمونہ پیش کریں، اور لوگوں کے اندر تاثیر پیدا کریں۔

لیکن یہ درمیان سال میں عید الاضحیٰ کی تعطیل میں اس اہتمام سے تمام طلبہ کو جمع کرنا بعض لوگوں کو عجیب لگے گا، لیکن میرے بھائیو! آپ کو اس عید الاضحیٰ کی تعطیل کے موقع سے چند باتیں کہنے کے لیے جمع کیا گیا ہے، ان ایام کی چھٹیوں سے متعلق آپ سے کہنا یہ ہے کہ آپ ایام تشریق اور ایام نحر کی چھٹی میں گھر جا رہے ہیں، یہ کوئی دسہرہ کی چھٹی نہیں ہے، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما الصلاۃ والسلام) کی یاد میں یہ چھٹی آپ کو دی جارہی ہے، آپ وہاں بھی اس کا خیال رکھیں، ایام تشریق کا ایک شامیانہ تو وہ ہے جو حجاج کرام کے سروں پر ہوتا ہے، لیکن ایک شامیانہ وہ بھی ہے جو پوری امت مسلمہ کے سر پر ہوتا ہے، آپ اس شامیانہ سے دور نہیں، آپ اس کا خیال رکھیں کہ یہ دن غفلت، بے توجہی، تفریح بازی اور دوسری بے مقصود مشغولیتوں میں نہ گزریں، آپ اپنے گاؤں اور گھر میں ان

ایام کے فضائل بیان کریں، جو لوگ عید قربانی کے مسائل سے ناواقف ہوں اُنھیں مسائل بتائیں، آپ اہل قریہ اور اہل خانہ کے سامنے ایسا نمونہ پیش کریں کہ وہ دینی تعلیم سے مطمئن ہوں اور انھیں اعتماد ہو جائے کہ ہم نے اپنے بچوں کو دینی مدارس میں بھیج کر کچھ ضائع نہیں کیا، بلکہ ان بچوں میں اور دیگر بچوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

میں آپ سے مدرسہ کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے چار باتیں اس وقت خاص طور پر کہتا ہوں، یہ باتیں میں نے اس سے پہلے بھی کہی ہیں، اور آج پھر کہتا ہوں کہ آپ کو اس وقت چار کام کرنے ہیں:

(۱) پہلی بات یہ کہ آپ سب ہر جگہ یہ صدا لگائیں اور اپنے خاندان اور محلے کے بزرگوں سے کہیں کہ اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آپ اپنی آئندہ نسل کو دین سے وابستہ رکھنے کی فکر کریں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اردو زبان ہم بالکل بھولتے چلے جا رہے ہیں، اور یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں عربی تو کیا اُردو زبان بھی سمجھیں گی یا نہیں، اس کی فکر کی ضرورت ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کیجیے، شادیوں میں کس کس طرح کے جہیز کی شرطیں لگائی جاتی ہیں، اور نہ جانے کیسے کیسے رسوم قبیحہ مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں، آپ اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیجیے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے آپ حسن اخلاق اور سنجیدگی کا نمونہ پیش کریں، ان کو اپنے آپ سے اور اپنے مذہب سے مانوس کریں۔

یہ چار باتیں آپ سے آج خصوصاً کہنی تھیں، آپ اپنی زندگی کے پروگرام میں ان کو شامل کر لیجیے، اور اس کام کو انجام دینے کے لیے ساری محنت اور کوشش کر ڈالیے، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔(۱)

---

(۱) ۰۵/ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ کو دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، (شمارہ ۱۰/ ستمبر ۱۹۸۵ء)۔

زبان وادب خدمت دین کا مؤثر ذریعہ

ادب کے راستہ سے جہاد

آپ نے مغرب بعد جب اچانک اعلان سنا ہوگا کہ تعزیتی جلسہ ہوگا تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ کسی بلند فائق مسلمان یا کسی بڑی اسلامی سیاسی شخصیت کے انتقال کی خبر آئی ہے اور ان کی تعزیت میں جلسہ ہورہا ہے، یا کوئی بہت بڑے عالم دین جو قرآن و حدیث کی تدریس یا علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول تھے، اور جامع ازہر اور اس طرح کی باہر کی جامعات یا مدارس میں درس دیتے تھے، یا کسی شیخ وقت کا انتقال ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں جلسہ ہورہا ہے، اور شاید آپ کے لیے یہ بات خلاف توقع ہو کہ ایک استاذ ادب، ایک مصنف و ادیب، اور ایک محقق ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت باشا مرحوم کے سلسلہ میں جلسہ ہورہا ہے، وہ بھی مسجد میں ہورہا ہے، اور علماء وطلبہ کی موجودگی میں ہورہا ہے، تو آپ کو شاید ان دونوں باتوں میں کچھ تضاد محسوس ہوا ہو، اور شاید اس سے پہلے اس کی مثالیں کم عمل میں آئی ہوں، کسی ادیب یا شاعر، کسی صاحب قلم کے لیے یہاں اتنے بڑے پیمانہ پر جلسہ ہوا ہو، لیکن میں اس میں بالکل کسی قسم کا تضاد نہیں سمجھتا، میری نگاہ میں ادب کی راہ سے دین کی خدمت کرنے والوں کی بہت اہمیت ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک جہاد ہے، نیت کا عالم تو اللہ ہے لیکن آدمی کے طرز تحریر سے، گفتگو سے، اخلاق سے اور خود اس کی زندگی سے اور اس کے جذبات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی نیت میں اسلام کی خدمت تھی یا کچھ اور؟

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت باشا نے جس کام کی ابتدا کی وہ بالکل نیا نہیں تھا، وہ مختلف

گوشوں میں مختلف پیمانوں پر ہوتا رہا ہے، لیکن انھوں نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کردی، اوراس کووقت کا بہت بڑا جہاد اور ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھا۔

ادب کے اثرات

ادب کا جو اثر نوجوانوں پر اور اہل فکر پر، یہاں تک کہ اہل سیاست پر جو ملکوں میں انقلاب لاتے ہیں اور جو قوموں کو خاص رخ پر ڈال دیتے ہیں، ان پر ادب کا جو اثر ہوتا ہے اور ادب جس طرح ان کے ذہن کی تشکیل کرتا ہے، اور پھر ان کو موقع دیتا ہے کہ وہ قوموں کے ذہن کی تشکیل کریں، اور پوری پوری قوموں اور نسلوں کو اور ایک ہی نسل نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ایک خاص رخ پر ڈالنے کی کوشش کریں، اس رخ پر جس کو ان کے ذہن نے قبول کرلیا ہے اور جس کے وہ داعی بن گئے ہیں، اور جس کے اظہار کے لیے اور اس کو قلب و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے ان کے پاس قلم کی طاقت اور زبان کی طاقت موجود ہے، وہ اس سے ایک عظیم الشان تعمیری اور اسی کے ساتھ عظیم الشان تخریبی کام انجام دے سکتے ہیں، جو میں کہہ سکتا ہوں کہ بعض اوقات (ہر زمانہ کے متعلق نہیں کہتا) لیکن بعض اوقات خالص علمائے دین اور خالص مشائخ طریقت اور یہاں تک کہ خالص داعی و مبلغ بھی نہیں کر سکتے۔

قوت بیانیہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے ادب میں ایک طاقت رکھی ہے، قرآن مجید کی مشہور سورہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیتیں ہیں: ﴿الرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ (یعنی خدائے رحمان ہی ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھلایا) ہمیشہ سے انسان کی تعریف کی گئی ہے، خاص طور پر اس فلسفۂ فکر میں جو دنیا میں طویل مدت تک رائج رہا اور اب بھی اس کا اثر ہے، فلسفۂ یونانی میں انسان کی تعریف حیوان ناطق سے کی گئی ہے، اور قرآن مجید میں قوت بیانیہ کی قدر و قیمت کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کو واضح کیا گیا ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں آپ پڑھیں گے، ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو جو تمام چیزوں

سے ماوراء ہے، تمام صفات سے ماوراء ہے، اوراس کی شان بہت زیادہ ارفع واعلی ہے، اس کو بھی بیان کے لفظ سے متصف کیا ہے، اوراس کو "عربی مبین" کہا گیا ہے۔

اسی طرح ایک آیت ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ، عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ [1] (اس کو یعنی قرآن کو لے کر روح الامین اترے ہیں آپ کے دل پر تا کہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں) ﴿لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ کافی تھا، نبی کی زبان وحی ترجمان اور صادق ومصدوق، مؤید من اللہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کہا گیا کہ ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِيْنٍ﴾ فصیح عربی زبان میں، واضح اور مؤثر زبان میں۔

اسی طرح فرمایا گیا: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ [سورة إبراهيم:٤] "بِلِسَانِ قَوْمِهِ" کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنا مطلب ادا کر دیا کرتے تھے، اور وہ سمجھا لیتے تھے اور لوگ سمجھ جاتے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے، جب قرآن کہتا ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبان خدا کے یہاں بھی قابل ذکر ہے، اوراس کا ایک درجہ ہے، اوراس کا ایک معیار ہے، پھر سورہ یوسف جس طرح شروع ہوتی ہے: ﴿إِنَّآ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (یعنی ہم نے اس قرآن کو فصیح اور واضح زبان میں اتارا تا کہ اس کو سمجھو) اور خود عربی کے معنی فصیح کے ہیں۔

اور پھر رسول اللہ (ﷺ) نے خود فرمایا: "أَنَا أَفْصَحُ الْعَرَبِ، بَيْدَ أَنِّيْ مِنْ قُرَيْشٍ وَ نَشَأْتُ فِيْ بَنِيْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ" میں تمام عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، اس لیے ایک بات تو یہ ہے کہ میں قریش میں پیدا ہوا جس کی زبان مسلم ہے، ٹکسالی زبان ہے اور قریش کے بعد سعد بن بکر کی زبان سب سے زیادہ محفوظ تھی اور فصیح تھی، تو ادب کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ادب ایک آلہ ہے تعمیر کا بھی اور تخریب کا بھی، وہ ذہنوں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے، اوراس میں ایسی جادوگری ہے اوراللہ تعالیٰ نے ایسی طاقت رکھی ہے کہ وہ بڑے بڑے وکلاء اور ذہین لوگوں کواس طرح مسحور کر لیتا ہے کہ ان کو جس راستہ پر ڈال دیا جائے اور چلایا جائے وہ اس راستہ پر چل پڑتے ہیں، آپ اگر دنیا کے انقلاب کی تاریخ

(۱) سورة الشعراء:١٩٤

پڑھیں گے اور اسلام کی تجدید و اصلاح کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس قوت بیانیہ سے، زبان کی فصاحت و بلاغت سے اور قلم کی طاقت سے کتنا بڑا کام لیا گیا۔

انقلاب فرانس میں ادب کا کردار

انقلاب فرانس دنیا کی تاریخ میں ضرب المثل ہے، اس انقلاب کے پیچھے آپ کو کچھ اہل قلم نظر آئیں گے، کچھ ادباء نظر آئیں گے جنہوں نے ذہنوں کو تیار کیا جمہوریت کے لیے، آزادی کے لیے اور بغاوت کے لیے، اور پھر ان کا اتنا اثر پڑا کہ ایک ایسی نسل تیار ہوگئی جو برداشت نہیں کرسکتی تھی اس وقت کے حالات کو، فرانس میں موجود استبداد کو، جمود کو، اور تقدیس کو جو دین کے نام سے وہاں مسلط تھیں، جو وہاں کی روایات تھیں اور ان کا جو اثر تھا وہ سب ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے، ان کتابوں کے ادبی شہ پاروں نے، شاعری نے جو اس دور میں پیدا ہوئی اور یہاں تک کہ ناول نگاری نے اور قصہ کہانی کی جو کتابیں لکھی گئیں اور اس کے علاوہ اور بھی (ادب کا دائرہ وسیع ہے) اس نے فرانس کو ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا دیا کہ وہ اس انقلاب کے لیے نہ صرف تیار تھا بلکہ بے چین تھا، اور کوئی استبدادی طاقت، کوئی منطق اور دین کے نام سے کوئی دعوت اور کوئی تقدیس ان کو روک نہیں سکتی تھی، یہاں تک کہ وہ لاوا کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا اور پورا فرانس بہہ گیا، اس انقلاب فرانس کا اثر پورے یورپ پر پڑا، یہاں تک کہ آج تک ذہنوں پر قائم ہے۔

زبان و قلم نے ہمیشہ تجدید کا ساتھ دیا

یہ تو سیاسی اور عوامی انقلابات کا ذکر ہے، خود آپ اسلام کی تاریخ میں دیکھیں گے کہ (اس موقع سے فائدہ اٹھا کے کہتا ہوں) ہمیشہ زبان نے اور قلم کی طاقت نے ساتھ دیا ہے تجدیدی اور اصلاحی تحریکوں کا، اور یہ ان کا سب سے بڑا ہتھیار رہا ہے اور جہاد کا سب سے بڑا آلہ رہا ہے، اور وہ حضرات جنہوں نے حالات میں تبدیلی پیدا کردی، ایک نظام کو ختم کر کے دوسرے نظام کو جاری کردیا اور ذہنوں میں نئی بیداری بلکہ بے چینی پیدا کردی، وہ وہ لوگ تھے جنہوں نے قوت

بیانیہ سے اور قلم کی طاقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اس میں مشکل سے کوئی استثناء آپ کو ملے گا، آپ اوپر سے دیکھیں، سیدنا علی مرتضیٰؓ کتنے بڑے ادیب و خطیب تھے، عربی ادب میں اس وقت سے اب تک وہ معیاری شخصیت ہیں، پھر اس کے بعد آپ دیکھیں تو حضرت حسن بصریؒ، حضرت سماکؒ اور دوسرے داعی حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ، آج تک ان کے خطبے پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج رہے ہیں، اور بجلیاں تڑپ رہی ہیں اور کوندرہی ہیں، اور ایک شخص ہے جو گرز چلا رہا ہے اور اس سے باطل کے سارے طلسم ٹوٹتے چلے جارہے ہیں۔

پھر آپ یہاں ہندوستان میں دیکھیے، حضرت مخدوم بہاریؒ کے مکتوبات دیکھیے، صرف فارسی ادب نہیں، صرف اسلامی ادب نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ عالمی ادب میں، بین الاقوامی ادب میں اس کا ایک پایہ ہے، اور باوجود اس کے کہ اس کے مقاصد دینی تھے اور اس کی زبان دینی تھی، لیکن ادب کے ایسے نمونے ہیں جس کی مثال مغربی زبانوں میں ملنی مشکل ہے، آج بھی ان کے اندر وہ طاقت ہے کہ پڑھنے والا ہل جاتا ہے، دل ودماغ متاثر ہوتا ہے، اور وہ چیزیں دل میں پیوست ہوجاتی ہیں، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات پڑھیے جو اسلام کی کمزوری اور ہندوستان میں اس کے لیے جو آزمائش تھی دور اکبری میں، اس پر اس طرح آنسو بہائے ہیں کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے خطوط میں کیا طاقت ہے، آج بھی ان میں کتنی حرارت موجود ہے، اور حرارت کے ساتھ ساتھ کتنی رقت انگیزی ان میں موجود ہے۔

مختلف ادوار میں تشکیک والحاد کے راستے

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے سب کے استاد و بزرگ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تقریر کی، انھوں نے کہا کہ پہلے عالم اسلام میں عقائد کا تزلزل اور الحاد آرہا تھا فلسفہ کی راہ سے، اس کے لیے امام ابوالحسن اشعریؒ، امام باقلانیؒ، امام غزالیؒ اور امام رازیؒ وغیرہ پیدا ہوئے، پھر جب مغربی قوموں سے واسطہ پڑا تو اسلامی عقائد میں تزلزل تجدد، الحاد اور آزاد خیالی کی راہ سے آنے لگا، اور سائنس کے راستہ سے جب سائنسی تحقیقات آئیں تو معلوم ہوا کہ کتنی سرعت پیدا کی جاسکتی ہے اور کتنی طاقت ہے ان چیزوں میں جو خدا نے پیدا کی ہیں، اور ان کو تسخیر کیا جاسکتا ہے اپنے

مقاصد کے لیے، اور نئی نئی تحقیقات ہوئیں تو دماغ مسحور ہو گئے، ہندوستان کی بعض ایسی بڑی شخصیتیں جن کا ایک مقام ہے اور جو صاحب فکر تھے، اور خالص دینی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی، ان کے دماغ نے پورا اثر قبول کیا، اور قبول ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کو منتقل کر دیا، اس سے پوری ایک نسل متاثر ہوئی اور ہندوستان میں نئے قسم کے متکلم پیدا ہوئے کہ ان کے نام لینے کی ضرورت نہیں، اور آج تک اس کا اثر کسی نہ کسی درجہ باقی ہے۔

تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر الحاد آنے لگا سائنس کے راستہ سے، فلسفہ کا طلسم ٹوٹ گیا اور اس کی اہمیت جاتی رہی، اس لیے کہ زندگی سے اس کا تعلق نہیں رہا، پھر اس کے بعد سیاست کے راستہ سے الحاد آنے لگا، یعنی جمہوریت، ڈیموکریسی، شخصی سلطنت اور اس طرح کے نظام، یہاں تک کہ ہمارے اچھے اچھے لوگ اس سے کسی نہ کسی درجہ متاثر تھے، اور علامہ شبلیؒ جیسے آدمی نے بھی جو خود ایک دبستان تھے اور ایک دبستان کے بانی ہیں، ان کی تحریروں میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کو بھی اہمیت کا احساس ہے اور وہ سیدنا فاروقؓ کی سیرت نگاری میں لحاظ رکھتے ہیں اس ذہن کا جو سیاست سے متاثر ہے، اور میں نے ایک کتاب دیکھی، محبّ الدین خطیب کی چھاپی ہوئی سیرۃ عمر بن خطاب ابن الجوزی کی، اس کے ٹائٹل پر لکھا تھا "أَوَّلُ حَاكِمٍ ديمقراطيٍّ في الإسلام"، اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ تعریف سمجھی انھوں نے کہ یہ کہا جائے کہ یہ پہلے جمہوری حاکم ہیں اسلام کے۔

سید صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر اس کے بعد اقتصادیات کے راستہ سے الحاد آنے لگا، اور اکنامکس، اشتراکیت، اجتماعیت، کمیونزم، سوشلزم اور اور مختلف نظاموں کے ذریعہ سے ذہن بدلنے لگے، اور جو لوگ اکنامکس پڑھتے تھے، وہ متاثر ہوئے، اور کچھ پڑھے لکھے لوگوں نے اشتراکی نظام کا مطالعہ کیا اور متاثر ہوئے اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے الحاد اختیار کیا، پھر جب ان کے ہاتھ میں زمام اختیار آئی تو ملکوں اور معاشرتوں کو بدل کر رکھ دیا۔

اب الحاد ادب کے راستے سے آ رہا ہے!

پھر سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کے بعد پھر اس کا بھی اثر کم ہوا، اور اب الحاد ادب کے

راستہ سے آرہا ہے، چنانچہ یہ ہمارا مطالعہ ہے کہ اکثر جامعات کے شعبۂ ادب، وہ انگریزی ہو یا اردو، یہ خاص طور پر عقائد میں تزلزل پیدا کرنے اور الحاد وتجدد اور آزاد خیالی کا مرکز رہے ہیں، اور اب بھی بہت سی یونیورسٹیوں میں یہی حال ہے کہ انگلش ڈپارٹمنٹ اور خاص طور پر اس میں پڑھنے والے جو طلبہ ہیں وہ زیادہ آزاد خیال ہوتے ہیں، اور ان کے اندر بغاوت پیدا ہوتی ہے قدیم اقدار اور دینی اقدار سے، حالانکہ زبانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور زبانوں کے دائرے سے باہر ہے، لیکن زبان کی جو بہترین چیزیں لکھی ہوئی ہیں اور جو اُن کے پڑھانے والے ہیں وہ غیر اسلامی افکار ونظریات سے متاثر رہے ہیں، بلکہ آزاد خیالی اور فکری انتشار کے داعی رہے ہیں، اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض جامعات میں (جن کا میں نام نہیں لوں گا) شعبۂ عربی مرکز رہا ہے اس آزاد خیالی کا، چوں کہ میرا قریبی تعلق رہا ہے ان جامعات سے، اور آتا جاتا رہتا ہوں، کمیٹیوں میں بھی شامل رہا ہوں، تو مجھے معلوم ہوا کہ بعض یونیورسٹیوں کا شعبۂ عربی مرکز بنا ہوا ہے الحاد اور آزاد خیالی کا، اور وہاں پڑھنے والے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان کے جو صدر شعبہ ہیں یا بڑے اساتذہ ہیں وہ متجدد ہیں، اور داعی ہیں ان خیالات کے، میں نام نہیں لے سکتا ہوں کہ بہت سے اس دنیا سے سفر کر چکے اور بعض باقی ہیں۔

ادب کی راہ سے جو چیز مثبت یا منفی، ایجابی یا سلبی، تعمیری یا تخریبی داخل کی جاسکتی ہے، وہ دوسرے جو بہت زیادہ بھاری بھرکم، ضرورت سے زائد سنجیدہ اور دقیق علوم ہیں، جو محنت طلب علوم ہیں، ان کے ذریعہ سے داخل نہیں کی جاسکتی، ایک شعر پڑھ دیجیے، ایک فقرہ چست کر دیجیے، ایک ادیب کی چند سطریں پڑھ دیجیے، جو اس کا اثر ہوگا وہ کسی معقولات کے عالم اور فلسفہ کی کتاب کا نہیں ہوسکتا۔

اس لیے ہماری نگاہ میں بڑی قدر و قیمت ہے ان لوگوں کی جنھوں نے ادب کی راہ سے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو سنبھالا، ان کو اسلام کی طرف مائل کیا، اور جو بغاوت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا بھٹکے ہوئے نوجوانوں میں، اور ان کے عقائد میں جو تزلزل آرہا تھا، ان کے ذہن میں جو انتشار پیدا ہو رہا تھا، اور جو تشکک پیدا ہو رہا تھا، اور جس کی سربراہی افسوس ہے کہ ہمارے

ممالک عربیہ اور خاص طور پر مصر کے بعض ادیبوں نے کی، اس پر روک لگائی اور ان کا مقابلہ کیا، اور چوں کہ مصر کا اثر تمام عرب ملکوں پر ایسا پڑتا تھا جیسا کہ پہلے ایران کا اثر پڑتا تھا مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں، ہندوستان پر ولایت کا اثر پڑتا تھا انگریزوں کے دور حکومت میں، اور لفظ ولایت ہی بتاتا ہے کہ کس احترام سے یہ لفظ نکلتا تھا، تو جس طرح انگلینڈ کا اور یورپ کا اثر پڑتا تھا، اسی طرح مصر کا اثر تھا ممالک عربیہ پر، اچھے اچھے لوگ مصر کی طرف جو چیز منسوب کی جائے اس کا نام لیتے ہی اور کسی مصری کتاب کا نام لیتے ہی وہ گویا بالکل مسحور ہو جاتے، احتراماً خاموش ہو جاتے اور اس کا جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا تھا، ان مصری ادیبوں سے سارا عالم عربی متاثر ہو رہا تھا، اور تمام عرب نوجوانوں پر ان کا جادو چلنے لگا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمارے بعض دوستوں کو اس کا مقابلہ کرنے کی توفیق دی، ان میں سب سے زیادہ جنھوں نے اس سلسلہ میں سرگرمی دکھائی اور اس کو ایک تحریک اور زندگی کا مقصد بنایا، اور یہ ہے اصل چیز کہ اپنی زندگی کا مقصد بنالیا اور عبادت سمجھا، وہ ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت باشا ہیں کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذات سے خدمت کی اور بڑا کام کر گئے، بلکہ چوں کہ وہ شعبہ ادب کے سربراہ بھی تھے جامعہ الامام محمد بن سعود میں، انھوں نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور ایک نسل تیار کی، اور انھوں نے اپنے زیر تربیت طلبہ اور نوجوانوں کی رہنمائی کی اور ان کو بجائے اس کے کہ کوئی اور موضوع دیں ادب کا موضوع دیا اور ان سے درجنوں کتابیں لکھوائیں جو ان کی تحریک پر لکھی گئیں، اور جیسا کہ ہمارے عزیز مولوی محمد رابع نے کہا کہ انھوں نے یہ دو سلسلے تیار کیے، ایک دعوتی اور اسلامی شعر کا سلسلہ اور ایک حیاۃ الصحابہؓ کا سلسلہ، اور چوں کہ وہ اچھے اہل قلم اور ادیب بھی تھے اس لیے ان کی کتابیں بہت کامیاب ہوئیں۔

بہر حال ان سے ہمارا تعارف ان آخری برسوں میں ہوا جس کی مدت بہت طویل نہیں ہے، لیکن بہت جلد ہمارے ان کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا جو صرف ادبی اور علمی رشتہ نہیں تھا، بلکہ دوستانہ اور برادرانہ رشتہ بھی تھا، میں ان کی شرافت سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اور انھوں نے ادب اسلامی میں ندوۃ العلماء کا اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا جو حصہ ہے، ان

کا انھوں نے بڑی فراخ دلی بلکہ بڑی جرأت اور شرافت کے ساتھ اعتراف کیا، اور حقیقت میں اس وقت رابطہ ادب اسلامی کی جو تحریک ہے وہ ان کی ہی رہین منت ہے، انھوں نے اس کی طرف توجہ دلائی اور خود بھی وہ کوشش کرتے رہے اور اس کو ایک ادارہ کی حیثیت سے اور تحریک کی حیثیت سے لینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی اسی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی، وہ یہاں رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ میں آئے، انھوں نے جلسہ کی رہنمائی کی اور بڑی اچھی قیادت کی، اس کو صحیح رخ پر رکھا، وہ اس کے بعد بھی برابر اس تحریک سے وابستہ رہے اور ہمارے ساتھیوں اور عزیزوں اور ان کے درمیان برابر رابطہ قائم رہا، اور ہم بڑی امیدیں رکھتے تھے کہ ان کا کام اور وسیع ہوگا اور زیادہ مؤثر ہوگا، کیوں کہ ان کا شب و روز کا مشغلہ اور گویا ان کا وظیفہ یہی تھا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ انھوں نے وقت کا ایک جہاد اور دعوت کا کام سمجھ کر اس کو انجام دیا، اور بھی ایک فال نیک اور بشارت ہے کہ ان کی تعزیت کا جلسہ یہاں مسجد میں ہو رہا ہے جس میں علوم دینیہ کے اساتذہ، علماء، طلبہ موجود ہیں اور ایک تبلیغی جماعت موجود ہے جو بلاد عربیہ سے آئی ہے، یہ خود ایک فال نیک اور قرینہ ہے اس بات کا کہ، انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا ہوگا، اور میں تو ان کا بہت قدرداں ہوں، اس لیے کہ میں اس کام کی قدر و قیمت سمجھتا ہوں اور ان کے جذبہ و لگن سے واقف ہوں کہ ان کو کس قدر لگن تھی، اور میں نے آپ سے ذرا تفصیل سے اس لیے یہاں کہا کہ آپ کو بھی یہ کام کرنا ہے۔

ہندوستان میں زبان وادب کی سربراہی شروع سے علماء نے کی

دیکھیے ہمارے ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے، میں نے اپنی بعض تحریروں میں لکھا ہے کہ بہت سے اسلامی ملکوں کا رشتہ اسلام سے اس لیے کمزور پڑ گیا کہ علماء نے اس ملک کی زبان و ادب میں وہ قائدانہ حصہ نہیں لیا جس کا اثر پڑا کرتا ہے، ترکی کا معاملہ یہی ہے اور کسی حد تک مصر ذرا مستثنیٰ ہے، لیکن کئی عرب ملکوں کا اور مسلم ممالک کا حال یہ ہے کہ ادب کی قیادت اور زبان وادب میں صدارت کا مقام حاصل کرنے اور رہنمائی کرنے کی طرف علماء نے پوری

توجہ نہ دی اوراس کی اتنی اہمیت نہیں سمجھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جونئی نسل تیار ہوئی وہ ان سے ناآشنا تھی، اوراگر ناآشنا نہیں تھی تو غیر مؤثر تھی، وہ دینی حیثیت سے تو ان کا احترام کرتی تھی کہ ہاں مسئلہ پوچھنا ہوتو ان کے پاس جانا چاہیے، یہ صالح لوگ ہیں، لیکن وہ ان کو وہ مقام دینے کے لیے تیار نہ تھی جو ایک قائد کا مقام ہوتا ہے، رخ دینے والے کا مقام ہوتا ہے، اس میں ہندوستان کا استثناء ہے، یہاں کی زبان وادب میں سربراہی شروع سے علماء نے کی ہے، آپ کو معلوم ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ یہاں ایوان ادب کے چار ستون مانے گئے ہیں، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کہا جاسکتا ہے، یہ چاروں طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے، ان کی ساری تعلیم مدارس میں ہوئی تھی، چٹائیوں پر ہوئی تھی، پھر اس کے بعد یہ لوگ ادبی میدان میں آئے۔

پھر سید سلیمان ندوی جیسی شخصیت پیدا ہوئی جو ایک طرف تو بھوپال کے قاضی القضاۃ تھے اور حیدرآباد کے دینی مشیر تھے، اور پاکستان جانے کے بعد وہاں کے دستور بنانے والوں میں ہیں، تو دوسری طرف انجمن ترقی اردو کے اور ہندوستانی اکیڈمیوں کے بار بار صدر ہوتے ہیں، اور اردو زبان پر خاص علمی موضوعات پر (Original)، مجتہدانہ اور محققانہ چیزیں پیش کرتے ہیں کہ جن کو ادب کے ہی نہیں، علم وتحقیق کے کتب خانے میں اونچی سے اونچی جگہ دی سکتی ہے، اور دینی چاہیے اور دی جارہی ہے، یہ ایک بڑی دینی خدمت انھوں نے انجام دی، لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی ذہانت کا یا ادبی قابلیت کا اظہار کیا، نہیں! بلکہ انھوں نے خالص دین کی خدمت انجام دی ہے، جب کسی ملت، کسی قوم اور ملک میں رائج زبان اور مقبول اسلوب بیان اور صحافت وتحریر اور ادب وتحقیق اور علوم دینیہ کے درمیان اور علوم دینیہ کے حاملین کے درمیان خلیج واقع ہو جائے گی، یا بیچ میں خندق واقع ہو جائے گی تو اس وقت دین اپنی بہت کچھ طاقت کھودے گا، کم از کم نوجوانوں پر سے اس کی گرفت چھوٹ جائے گی۔

اس لیے ہمیشہ خاص طور پر ہمارے ندوۃ العلماء کے طلبہ وفضلاء کو کبھی اپنا رشتہ زبان و ادب سے ٹوٹنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے، کبھی یہ پوزیشن قبول نہیں کرنی چاہیے کہ لوگ انہیں یہ سمجھیں کہ یہ زبان وادب سے ناواقف ہیں، اور یہ وہی مولویانہ زبان لکھتے ہیں اور کلامی اور فقہی

مسائل پر ہی ان کی تحریریں پڑھنے کے قابل ہیں، ادب وزبان کے بارے میں، زبان کی تاریخ کے بارے میں، تنقید کے بارے میں ان کو بولنے کا کوئی حق نہیں، ان کی بات میں وزن نہیں۔

ایک وصیت

یہ میں ایک وصیت کے طور پر آپ سے کہتا ہوں کہ ہمارے ندوۃ العلماء کے مدرسۂ فکر کی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے ملک کی زبان وادب سے اپنا رابطہ ورشتہ (ٹوٹنا تو بڑی چیز ہے) کمزور نہیں ہونے دیا، دارالمصنفین کے رفقاء کی تحریر اور مولانا عبدالسلام صاحب کی تحریر، آپ دیکھیے اقبال پر بہترین جو چیزیں لکھی گئی ہیں ان میں ''اقبال کامل'' ہے، اور شعراء و شاعری کی تاریخ میں اس وقت تک جو چیز کلاسیکل سمجھی جاتی ہے وہ ''گل رعنا'' ہے جو ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی تصنیف ہے، اور ''شعر الہند'' ہے مولانا عبدالسلام صاحب کی، پھر فارسی ادبیات پر اس وقت تک جو چیز سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہے وہ ''شعر العجم'' ہے، ''شعر العجم'' پر دس تنقیدیں کی جائیں لیکن ''شعر العجم'' کی اہمیت آج تک کم نہیں ہوئی، اور مجھے لاہور کے ایک بڑے فاضل نے سنایا کہ ''تاریخ ادبیات ایران'' لکھنے والے براؤن نے ایک مرتبہ کہا کہ مجھے اردو زبان پڑھنے کی تمنا کبھی کبھی اس لیے ہوتی ہے کہ میں ''شعر العجم'' سے استفادہ کرسکوں، تو یہ خصوصیت اور معیار باقی رہنا چاہیے، ہم ڈاکٹر عبد الرحمٰن رأفت الباشا کا حق سمجھتے ہیں کہ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر ایک نماز کے بعد اور دوسری نماز سے پہلے دونوں نمازوں کے درمیان اور خالص دینی علوم کے طلبہ کے سامنے ان کی خدمات کا اعتراف کریں، ان کے لیے دعائے خیر کریں، وہ بڑے اچھے مسلمان، بڑے شریف مسلمان، عالم، بڑے صاحب قلم، بڑے ادیب اور دین کی خدمت کرنے والے تھے، عرصہ تک ان کی یاد تازہ رہے گی، اور انشاء اللہ ان کے جو نقوش ہیں وہ باقی رہیں گے، اور بہت سے لوگوں کی عرصہ تک رہنمائی کریں گے۔ (۱)

(۱) عربی زبان کے مشہور ادیب و مصنف ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت باشا (پروفیسر امام محمد یونیورسٹی، ریاض) کے انتقال پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ۲۹ر جولائی ۱۹۸۶ء کو منعقد تعزیتی جلسے میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا سید عمیر مرتضی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر اگست ۱۹۸۶ء)۔

زبان وادب سے علمائے دین کا رشتہ

زبان وادب میں مہارت کی ضرورت

ہماری تاریخ میں بعض ایسے بھی دور گزرے ہیں جن میں علماء علوم دینیہ کے سمندر میں ڈوبے رہے اوران میں تبحر پیدا کیا، لیکن انھوں نے دنیا سے کوئی ایسا رابطہ قائم نہیں رکھا جس سے زمانہ کے طریقۂ فکراورنئی نسل کے رجحانات سے واقف ہوں، اورصرف دین کی ترجمانی ہی کا فریضہ انجام نہ دیں بلکہ زمانہ پراثر انداز ہوں اوراسے صحیح رخ دے سکیں۔ان اوقات میں علماء سے عوام کا رشتہ کٹ چکا تھا، اور دونوں میں خلیج پیدا ہوگئی تھی جو جدید اور قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان محاذ آرائی کی شکل میں رونما ہوئی۔

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ اس وقت اسلامی ممالک کا حال یہ ہے کہ گاڑی میں دو گھوڑے ایک دوسرے کے مخالف سمت میں جوڑ دیے گئے ہیں، جن میں ایک جدت کی طرف اور دوسرا قدامت کی طرف کھینچ رہا ہے۔تمام ممالک اسلامیہ میں یہی صورت حال پیش آئی،علماء اپنے حصار میں محصور ہوکر رہ گئے،علمائے ازہر کا بھی یہی حال تھا، وہ اپنے علوم میں متبحر تھے، انہیں سند کا درجہ حاصل تھا، لیکن انھوں نے اپنے کواس چیز سے بے تعلق کرلیا تھا کہ اس زمانہ میں کون سا اسلوب پسند کیا جاتا ہے، زبان وادب کا کون سا طرز نوجوانوں پر اثرانداز ہوتا ہے، اورجیتی جاگتی زبان میں کس طرح خیالات ادا کیے جاتے ہیں، اس میں کس طرح دلآویزی اورساحری پیدا کی جاتی ہے، جو دلوں کو موڑ دے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان و ادب کی قیادت اس طبقہ میں چلی گئی جسے یا تو دین کے بہت سے اصولوں سے اتفاق نہیں تھا، اس نے دینی تربیت نہیں پائی تھی، دین کے بارے میں اس کے اندر احترام کا وہ جذبہ نہیں تھا

جوایک دین سماوی کے بارے میں ہونا چاہیے، اور یا تو اپنی مغربی تعلیم کی وجہ سے اور خاص طور سے نپولین کے حملہ کے بعد ایک پوری نسل ایسی پیدا ہوئی جس نے یورپ کا رخ کیا، خصوصاً فرانس کا اور فرانس کا مزاج برطانیہ کے یا دوسرے مغربی ممالک کے مزاج سے مختلف ہے، اس میں زبان کی آزادی اور فکری آوارگی پائی جاتی ہے۔

تو جب یہ نسل اپنے علاقوں میں لوٹی تو اس نے ایسا لٹریچر تیار کیا جو زبان کی شگفتگی اور مغربی چیزوں سے واقفیت اور مستشرقین کے خیالات کی نمائندگی کی وجہ سے بہت زیادہ اثر انداز ہوا، اور اسی کے ساتھ بعض عرب مصنفین نے مستشرقین کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کیا، جیسے مارگیولس کی کتاب کا چربہ طٰہٰ حسین نے ''الشعر العربی'' کے عنوان سے پیش کیا، اور بعض ناقدین نے مقابلہ کرکے دکھایا ہے کہ جو طٰہٰ حسین نے لکھا ہے، وہ ایک مغربی مصنف کے خیالات لے لیے ہیں اور اچھی عربی زبان میں شگفتہ اسلوب میں منتقل کر دیا ہے۔

اسی طرح ''المرأة المصرية'' کتاب لکھی گئی، اس میں سابقہ بے حجابی اور عورت کی آزادی کی دعوت دی گئی جو مغربی خیالات و تصورات کا نتیجہ تھی، اسی طرح اور بہت سی کتابیں لکھی گئیں جس سے اس موضوع کا پورا لٹریچر تیار ہو گیا، ادھر علمائے ازہر اپنے محدود حصار میں تھے، وہ اس میں نحوی غلطیاں نکالتے تھے اور زبان کی نشاندہی کرتے تھے، اس لیے یہ ادباء تھوڑا سا ڈرتے تھے، لیکن علماء نے اس کا مثبت اور متبادل حل نہیں پیش کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جدید نسل بالکل آزاد ہو گئی اور زبان و ادب اور آزاد خیالی دونوں لازم و ملزوم چیز ہو گئے۔

پھر زبان و ادب اور آزادانہ طریقۂ فکر نے اسلامی اصولوں، اسلامی مسلمات، اور اسلامی نظام معاشرت کے سلسلہ میں ایک متشکک طبقہ پیدا کر دیا، یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی، چنانچہ جب بھی اس طبقہ کے ہاتھ میں کوئی قیادت آ گئی، وزارت تعلیم آ گئی، یا اسی طرح وزارت تربیت، وزارت اِعلام آ گئی، تو اس کے اثرات پورے مصری معاشرہ پر پڑے، اور مصر کو چوں کہ قیادت کا درجہ حاصل تھا، اس لیے پورے عالم عربی اور پورے عالم اسلام پر اس کا اثر پڑ رہا تھا، اور ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں جب مولانا مسعود عالم

ندوی، مولانا ناظم صاحب ندوی وغیرہ پڑھتے تھے، تو مصر سے جو نئی مطبوعات اور کتابیں آتی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ مصر میں دین کے خلاف کھل کر محاذ آرائی قائم ہوگئی ہے، اس کا اثر جدید فرقہ پر بہت ہی انتشار انگیز ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے علمائے دین نے زبان و ادب کو اپنے مقام سے فروتر سمجھا اور اس پر اپنا اثر و رسوخ اور اس حلقہ میں اپنے احترام کا تصور قائم نہیں کیا، جس کے نتیجہ میں یہ صورت حال پیش آئی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خوش قسمتی

خدا کے فضل سے ہندوستان میں یہ صورت حال پیش نہیں آئی، جیسا کہ میں نے رابطہ ادب اسلامی کے جلسوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہاں کے علماء نے کسی دور میں بھی زبان و ادب سے اپنے کو غیر متعلق اور بیگانہ نہ ہونے دیا، انھوں نے ایسا نظام تعلیم بنا دیا جس نے پڑھے لکھے طبقہ کو پیدا کیا، اس میں دین اور زبان و ادب دونوں ملے ہوئے تھے، اس وقت کا نصاب اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ علماء نصاب کی کتابوں کے ذریعہ زبان کی ضروری چیزوں سے واقف ہو جاتے تھے۔

میں آپ کو ایک مثال دوں، دہلی میں مشاعرہ ہونے والا تھا، استاذ ذوقؔ نے شاہ نصیرؔ کی غزل پر غزل کہی اور شاہ نصیرؔ کو دکھائی، شاہ نصیرؔ نے دیکھا تو اس میں ہمسری اور مقابلہ کی کوشش تھی، تو شاہ نصیرؔ نے ایسا طرز اختیار کیا کہ استاد ذوقؔ کو شبہ ہوگیا کہ اس میں خامیاں تو نہیں ہیں، تو انھوں نے اسے شاہ عبد العزیزؒ کے پاس بھیجی کہ حضرت فرمائیں کہ اس میں کچھ خامیاں تو نہیں ہیں، شاہ صاحب نے دیکھا اور یہ کہہ کر بھیج دیا کہ بے تکلف اطمینان کے ساتھ یہ غزل پڑھی جائے، شاہ عبد العزیزؒ کا یہ کہہ دینا کافی تھا، اور اس کے بعد ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ کسی اور کو دکھائی جائے۔ آپ خیال کیجیے کہ استاد ذوقؔ جو بادشاہ کے بھی استاد ہیں، اور صاحبِ 'آب حیات' کے استاد ہیں، اور کتنے استادوں کے استاد ہیں، اور شاہ نصیر الدین کے زمانہ کے استاد ہیں، لیکن صرف ایک خالص عالم دین، محدث وقت، فقیہ دوراں کے محاکمہ پر اطمینان کر لیتے ہیں، یہ خوش قسمتی تھی یہاں کے مسلمانوں کی کہ یہاں کے علمائے

دین زبان وادب اور شاعری کے جدید اسلوب سے الگ نہیں ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہ نئی نسل اس خطرہ سے بچ گئی جس سے دوسری جگہوں پر دو چار ہونا پڑا۔

آپ کو معلوم ہے کہ عمارت اردو کے چار ستون مانے ہوئے علماء ہیں، یعنی علامہ شبلی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی۔ یہ سب طبقۂ علماء سے ہیں، جنھوں نے قدیم نصاب کی کتابیں پڑھیں اور ضروری حد تک دین وادب دونوں سے واقف تھے۔

''الاصلاح'' کا دائرۂ عمل

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ''الاصلاح'' کا دائرۂ عمل صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ تقریر وتحریر میں حصہ لیا جائے، مقالوں میں حصہ لیا جائے، بلکہ اس سے بڑھ کر بیش قیمت معنی میں ملک کی زبان وادب سے ایسا تعلق پیدا کیا جائے کہ دین کے خلاف محاذ آرا اور برسر جنگ نہ ہونے دیا جائے، اور دین کو ایسی زبان اور ایسے اسلوب میں پیش کیا جائے کہ ادبی ذوق رکھنے والا بھی نہ صرف یہ کہ اس کو پڑھنے پر آمادہ ہو، بلکہ اس کو اس میں چاشنی محسوس ہو، اس کا ادبی ذوق اور ادبی حاسہ اس سے غذا حاصل کرے، تو ''الاصلاح'' کو میں مقرروں اور لکھنے والوں کی ایک متوسط درجہ کی جماعت تیار کرنے کا ادارہ ہی نہیں سمجھتا، بلکہ اس سے وسیع تر معنی میں ہمارے علماء ملک کی زبان وادب کے جدید اسلوب سے واقف ہوں، زبان وادب سے ہمارا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور صرف ٹوٹنے ہی نہ پائے، بلکہ زبان وادب ہماری ضرورت محسوس کرے اور ہم سے رہنمائی حاصل کرے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے پچاس برس پہلے انجمن ترقی اردو کا جلسہ ہو یا کوئی ادبی مجلس، اس بات پر فخر محسوس کیا جاتا تھا کہ اس میں سید سلیمان ندوی شریک ہوں یا مقالہ پڑھیں یا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس کی صدارت کریں اور اس میں شرکت فرمائیں، آپ دیکھیے کہ ''گل رعنا'' جو ہمارے والد مولانا عبدالحی صاحب مرحوم کی تصنیف ہے، اور جو ''آب حیات'' کے بعد اردو شاعری کی تاریخ میں ناقدانہ کتاب سمجھی جاتی ہے، اور جس نے ''آب حیات'' کی غلطیوں کا پردہ فاش کیا، ایک عالم دین کی لکھی ہوئی ہے جو خالص قدیم نصاب کی تعلیم کا فاضل تھا۔

اپنے کو زبان وادب سے بیگانہ نہ ہونے دیں

میں خاص طور سے دارالعلوم کے فرزندوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے کو زبان وادب سے بیگانہ نہ ہونے دیں، اور قلم میں ایسی شگفتگی اور طاقت پیدا کریں کہ جدید طبقہ کو مجبور کردیں کہ وہ ان کی چیزیں پڑھیں، اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم دینیات کی کتاب پڑھ رہے ہیں، یا اس وقت ایک خشک کام کررہے ہیں، بلکہ وہ ان کے ادبی ذوق کا ساتھ دے، ہمارا مطالعہ وسیع ہو۔

سید صاحب فرمایا کرتے تھے ایک صفحہ لکھنے کے لیے سو صفحہ پڑھنے کی ضرورت ہے، وہ کہتے تھے کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں پڑھے لکھے آدمی ہیں، حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ پڑھے کم اور لکھے زیادہ ہوتے ہیں، اس وقت لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہیں، قلم اٹھاتے ہیں اور لکھنا شروع کردیتے ہیں، اس کے پیچھے کوئی مطالعہ نہیں ہوتا۔

تو ندوی شعار ہے پڑھ کر لکھنا، لکھ کر پڑھنا نہیں کہ آپ خود ہی لکھیں اور پھر اسی کو پڑھیں، تو پہلی چیز ہے پڑھ کر لکھنا۔

اور دوسری خصوصیت ہے قلم کی شرافت، آپ کا قلم مہذب ہو، شریف ہو، آپ تنقید بھی کریں تو مہذب انداز میں، عامیانہ انداز نہ ہو۔

پھر ایک بات اور یہ کہ کتابیں ترتیب سے پڑھیں، ترتیب سے پڑھنے سے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا، اور آہستہ آہستہ صلاحیت بڑھے گی، مطالعہ ایک فن ہے اور ایک ذمہ داری ہے، اس سلسلہ میں اپنے اساتذہ سے مشورہ کریں اور مطالعہ کا طریقہ معلوم کریں، بعض اوقات غلط مطالعہ ایک اچھے خاصے آدمی کو الحاد کے مرحلہ تک پہنچادیتا ہے۔ (۱)

---

(۱) ۶ ؍ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں جمعیۃ الاصلاح کے افتتاحی جلسہ میں کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ، (شمارہ ۱۰ ؍ ستمبر ۱۹۸۷ء)۔

علمی طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا کیجیے!

''الاصلاح'' سے متعلق ضروری باتیں شروع میں کہی جاتی ہیں، اس موقع پر ایک بات ذکر کرتا ہوں، ''الاصلاح'' کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے پڑھے لکھے طبقہ کو مطمئن کرنا، اس وقت مسلمانوں کے خلاف مشترکہ ایک عنوان قائم ہے، بنیاد پرست (Fundamentalist)، جن کا زمانہ گزر چکا ہے، ہم ان کو دین کہیں گے، آئیڈیل اور اخلاق وقیم (Values) کہیں گے۔

آج کل پوری زندگی میں انھیں اصول وضوابط کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے تشدد ہے، انتشار ہے، اس لیے کہ جب کوئی اصول اور حد متعین نہیں ہے، جو دل میں آتا ہے کرتے ہیں۔

آج کا جیتا جاگتا مسئلہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو جو اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اہلیت رکھتا ہے، اس کو ایمان بالغیب، قرآن و حدیث اور سلف صالحین کی تحقیقات پر اطمینان کروانا ضروری ہے۔

Fundamentalism کی اصطلاح کے خلاف مقابلہ کے لیے آپ کو پوری تیاری کرنی ہوگی، سب سے پہلے تو عقائد صحیح ہوں، مطالعہ راسخ ہو، اور پھر اس کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہو جس سے وہ متاثر ہوں۔

آج کل کی خرابی ہی یہ ہے کہ نہ اصول ہیں نہ ضوابط، اصول وضوابط پر قائم رہنا دانشمندی اور ہوش مندی کی بات ہے، ہم کو فخر سے کہنا چاہیے کہ ہم Fundamentalist ہیں۔

اب آخر میں ایک بات پھر کہتا ہوں، آپ کے اندر ایسی صلاحیت ہونی چاہیے کہ علمی طبقہ کو متاثر کرسکیں، اور جو اقتدار پر آرہا ہو، اس کو مؤثر ذریعہ سے تحریر وزبان کے ذریعہ سے یہ سمجھا سکیں کہ اسلام کے اصول وضوابط پر عمل پیرا ہونے میں ہی فلاح وکامیابی ہے، یہ اصل

مقصد ہے ''الاصلاح'' کا۔

دوسرے یہ کہ آپ علامہ شبلی نعمانیؒ اور سید الطائفہ سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے ندویوں کی تحریر سے واقف ہوں، اور ان کی کتابوں کی حفاظت کریں۔

اور آپ کو جو کتابیں انعام میں ملی ہیں، ان کا انتخاب عمدہ ہے، ان کو حفاظت سے رکھیں، آپ کو ان سے اپنے ساتھی اور یہ دار العلوم یاد آئے گا، اور ممکن ہے جن کے ہاتھوں سے لے رہے ہیں، وہ بھی یاد آئیں، میں مبارکباد دیتا ہوں ان تمام فائزین کو جنھوں نے اپنے آپ کو انعام کا مستحق قرار دیا اور انعام حاصل کیا۔ (۱)

---

(۱) جمعیۃ الاصلاح، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک جلسہ تقسیم انعامات میں کی گئی تقریر کا خلاصہ، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/ مارچ و ۱۰/ اپریل ۱۹۹۳ء)۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ کا پیغام

أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم

بسم اللّٰه الرحمن الرحيم

﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (۱)

تقویٰ اور صبر

میرے عزیزو اور بھائیو!

مجھے جو کچھ آپ کے سامنے کہنے کی توفیق ہوگی اور جو کچھ کہنا چاہیے، وہ حقیقت میں اسی آیت کی شرح ہے، اسی آیت کی تفسیر ہے: ﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾۔ میں نے کئی بار عرض بھی کیا کہ ہم سے اگر کوئی کہے کہ فلاں دینی مدرسے، فلاں دینی جامعہ کے صدر دروازے پر ایک بورڈ آویزاں کرنا ہے، ایک تختہ لگانا ہے، اس کے لیے کسی آیت کا، کسی حدیث کا، کسی توجیہ، کسی رہنمائی کرنے والے فقرے کا آپ انتخاب کر دیجیے، تو میں کہوں گا کہ بس یہ لکھ دیجیے: ﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾۔

پھر حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصے میں اس سیاق میں یہ آیت خاص معنی رکھتی ہے، اور یہ معنی کیا ہے؟ یہ ایک دریائے معانی، ایک بحرِ حقائق اور ایک اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت اور انسان کی کوشش کے بہترین نتائج کا اعلان ہے، کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبان سے اس موقع پر یہ آیت جو نکلی ہے، اور بھی خاص معنی اس میں پیدا ہو گئے ہیں، کہ یہ بات ان سے کہی جا رہی ہے جو اتنا جانتے ہیں کہ ہم نے اپنے

(۱) سورة يوسف: ۹۰

بھائی یوسف کو حسد میں، ایک نفسانیت کے اثر سے کنویں میں ڈال دیا تھا، اور پھر اس کے بعد کیا انجام ہوا؟ اس کی ان کو خبر نہیں تھی، یا اگر معلوم ہوا ہو کہ قافلہ آیا اور اس قافلہ نے ان کو وہاں سے نکالا، تو اس کے بعد یوسف (علیہ السلام) جس مقام تک پہنچے، اس مقام کا تصور، اس مقام کا تخیل بھی بڑے سے بڑا بلند خیال اور بڑے سے بڑا مفروضات کو سوچنے والا بھی نہیں کر سکتا کہ جس کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے کنویں میں ڈالا تھا، وہ اس وقت کرسی سلطنت پر، کرسی وزارت پر بیٹھا ہوا ہے، اور ہم اس سے مدد لینے آئے ہیں کہ آپ ہمیں کچھ غلہ دلوایئے، ہماری مدد کیجیے، ہم بڑی تنگی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ تو کنویں کی گہرائی، کنویں کی نیچے کی تہہ اور اس کرسی کی بلندی، اِن دونوں میں جو تفاوت ہے، جو فاصلہ ہے، وہ فاصل میلوں کا فاصلہ نہیں ہے، وہ فاصلہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا فاصلہ نہیں ہے، وہ فاصلہ موت اور زندگی کا فاصلہ ہے، وہ جگہ تھی کہ جس کے متعلق ہر طرح قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہاں سے وہ جس کو ڈالا گیا وہ نکل نہیں سکتا، اور نکلے گا تو معلوم نہیں کیا اس کو دیکھنا نصیب ہوگا، اور اس کا کیا حشر ہوگا؟

تو اس پورے فاصلے کے طے کرنے کی اور اُس عزت کے ساتھ، اعزاز خداوندی کے ساتھ، اور اجتبائے خداوندی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی تکریم اور اللہ تعالیٰ کی قدر دانی کے ساتھ، اُس فاصلہ کو کامیابی کے ساتھ، کامیابی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ طے کر کے، اُس کنویں کی تہہ سے نکل کر، اُس وقت کی دنیا کی متمدن ترین اور وسیع ترین سلطنت کے ایک تخت وزارت پر اور کرسی وزارت پر بیٹھنے کا یہ سارا جو سفر طے ہوا ہے، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس کی دو وجہیں بتائی ہیں: ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا - کہ یہ پیغمبر کا مقام ہے، کوئی دوسرا ہوتا تو صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا - کہ میں یوسف ہوں، کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ یا میں وہی ہوں جس کو تم نے کنویں میں ڈالا تھا، نہیں! وہ أنـــا یـوسف کہنے کے بعد کہتے ہیں کہ بات صرف اتنی نہیں کہ میں پیغمبر کا بیٹا ہوں، ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ دو چیزیں ہیں: تقویٰ اور صبر، محظورات سے بچنا، احتیاط سے کام لینا، نفس پر قابو رکھنا، اور اس کے تقاضوں اور اس کی خواہشات کو مغلوب کرنا، اور اس پر قابو پالینا، اور صبر سے کام لینا۔

یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ پورے نظام تعلیم پر، نظام تربیت پر، پورے اصلاحی نظام پر، دعوتی نظام پر، اخلاقی نظام پر، اور یوں کہنا چاہیے پوری تقدیر انسانی پر یہ دو چیزیں حکومت کر رہی ہیں، ان دو چیزوں کا سایہ ہے، اور ان ہی دو چیزوں کے طفیل میں، ان ہی دو چیزوں کے سایہ میں یہ سب چیزیں، یہ سب ادارے، یہ سب شعبے، یہ سب مقاصد کامیاب ہو سکتے ہیں، ترقی کر سکتے ہیں۔

اللہ کا شکر

اب میں آپ سے اس وقت بغیر کسی ترتیب کے وہ باتیں جو اللہ تعالیٰ میرے دل میں ڈالے گا، جس کی توفیق عطا فرمائے گا، کہنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آپ میں دو قسمیں ہیں، ایک تو ہمارے وہ عزیز طلبہ ہیں، ہمارے عزیز بھائی اور فرزند ہیں جو یہاں پہلے سے پڑھ رہے تھے اور کسی کو دو سال گزرے، کسی کو چار سال، چھ سال، اور کسی کا ایک سال باقی ہوگا، وہ آئے ہیں، ان سے تو میں کہوں گا کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو زندگی عطا فرمائی، اور توفیق عطا فرمائی، توفیق ان سب چیزوں پر حاوی ہے، صحت، زندگی، صحیح ارادہ، کامیابی، منزل مقصود کو پہنچنا، یہ توفیق ان سب پر شامل ہے، کوئی ایک چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ آپ اور آپ کے خاندان میں، اور آپ کے مقام پر بھی، اور آپ کے ملک میں بھی کوئی ایسی چیز پیش نہیں آئی، اور اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، جسمانی طور پر بھی آپ کو، ذہنی طور بھی آپ کو، کوئی ایسی رکاوٹ پیش نہیں آئی کہ آپ نہ آسکتے، اس کا بالکل امکان تھا، اور اس کی صدہا مثالیں ہیں، مدارس کے رجسٹروں میں آپ جا کر دیکھیے، اساتذہ سے پوچھیے، تو ان سے تو میں یہ کہوں گا کہ اس پر شکر کریں۔

شعور اور ایمان واحتساب کے ساتھ عمل

اور خاص طور پر جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کسی فعل کو شعور کے ساتھ کرنے

میں اور بغیر کسی شعور کے کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہ سارے قرآن و حدیث سے، پوری دینی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت اور شعور کو بہت بڑا دخل ہے، اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے اس زمانہ میں بہت غفلت ہوگئی ہے، اچھے سے اچھے کام کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ اللہ معاف کرے، یہاں تک شبہہ ہوتا ہے بعض لوگوں کے متعلق کہ شاید وہ حج بھی کرآتے ہوں، اور عمرے بھی کر لیتے ہوں، اور حجاز اور دیار مقدسہ جانے والے تو خیر بہت ہیں، لیکن شعور نہیں، نیت نہیں، اللہ کی رضا کی نیت نہیں ہے، ایمان و احتساب نہیں ہے، ملازمتوں کے لیے جاتے ہیں، وہاں سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، وہاں سے وہ چیزیں جو یہاں نہیں ملتیں آسانی سے ان کو لانے کے لیے، میں نام نہیں لینا چاہتا، اس مجلس میں اور اس مسجد میں ان کا نام لینا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا، ان چیزوں کو لانے کے لیے وہ جاتے ہیں۔

ایک پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا شعور بیدار کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے وہ عزیز، ابھی جن کی تعلیم کی تکمیل نہیں ہوئی، اللہ نے ان کی مدد فرمائی، ان کے والدین کو توفیق دی، یا ان کے ذمہ داروں کو، یا براہ راست ان کو توفیق دی کہ وہ آئیں اور وہ اس پر شکر کریں، اور کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اس پر دو رکعت شکرانہ کی نماز پڑھیں، کہ اللہ! تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ تو نے ہمیں یہاں پھر آنے کے قابل بنایا، اور توفیق دی، معلوم نہیں نوکری کرنے لگتے، دکان کھول لیتے، کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے۔

یہ بھی ایک سلسلہ چل پڑا ہے، کہ کسی عرب ملک میں چلے جاتے ہیں چھوٹی موٹی نوکری کے لیے، کہیں بھی تھانے میں جگہ مل جائے، چنگی میں جگہ مل جائے، کہیں جگہ مل جائے، اس سے بحث نہیں کہ ہم نے کیا مضامین پڑھے تھے، ہم نے کتاب و سنت کا علم حاصل کیا تھا، ہمیں معلوم ہے، ہمارے کتنے عزیز دوست ہیں یہاں کے پڑھے ہوئے ہیں، اور دوسرے مدارس کے پڑھے ہوئے ہیں، کہ وہ خلیج میں جا کر ایسے محکموں میں ملازم ہیں کہ جہاں ڈاڑھی رکھنے کے متعلق بھی ان کو ہدایت ہے کہ ڈاڑھی یہاں رکھنا مشکل ہے، اور جہاں ان کو لباس بدلنے اور معلوم نہیں کن کن چیزوں کو اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، انھوں نے ہم سے

شکایت کی، جب ہمارا سفر ہوتا ہے تو وہ شکایت کرتے ہیں، یہ سب کچھ پیش آ سکتا تھا، ایک بیماری ہی بہت کافی تھی، اللہ آپ کو صحت کے ساتھ رکھے، اس پر شکر ادا کرنا چاہیے، ذہن کو حاضر کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ آ گئے آ گئے، اور جیسے تھے ویسے ہی رہے، گویا گئے ہی نہیں تھے، اور پھر پڑھنا شروع کر دیا، تو آپ دیکھیں گے پورے دینیات کے کتب خانہ میں، دینیات کے دفتر میں، شعور کو بیدار کرنے اور نیت کو حاضر کرنے اور اللہ کی رضا کو طلب کرنے پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ یہ دین کا ایک مستقل باب ہے، اور اس سے بڑی غفلت برتی جا رہی ہے۔

سچی بات یہ ہے، ایک ادائے فرض اور شکر کے طور پر میں کہتا ہوں کہ اس کی طرف توجہ میری حضرت مولانا محمد الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں جا کر خاص طور پر ہوئی، میں جب وہاں حاضر ہوا، یہاں حدیث کا درس بھی دیتا تھا، بخاری شریف کا درس بھی دیا ہے، اور غالباً ابوداؤد کا درس بھی دیا ہے، اور قرآن شریف کا تو درس دیتا تھا، لیکن ان کے یہاں جا کر میں نے دیکھا کہ وہاں اس پر خاص زور ڈالا جاتا ہے کہ وضو اور نماز سے لے کر جتنے کام کیے جائیں وہ ذہن کو حاضر کر کے اور رضائے الٰہی کی نیت سے کیے جائیں، اس کو ایماناً واحتساباً کے لفظ سے حدیث میں تعبیر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ چیزیں جن کی شکل، جن کی حقیقت اور جن کی ساخت ہر چیز بالکل دین کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، کہ اس میں ذرا شبہ نہیں کیا جا سکتا، وہاں بھی کہا گیا ہے: "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَ احْتِسَاباً"، اب کوئی کہے کہ بھلا رمضان کے روزے، اس میں کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اگر کوئی کہے کہ بازار جو جائے، کسی غریب کی مدد کرے، سودا خرید کر کے لائے، یا کوئی کسی کا کام کر دے، تو جو وہ اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر وثواب کی لالچ میں- یہ مولانا الیاس صاحب کا ترجمہ ہے- اجر وثواب کی لالچ میں کرے تو ٹھیک سمجھ میں آتا ہے، لیکن روزہ؟ روزہ تو رکھا ہی اسی نیت سے جاتا ہے، روزہ تو خالص عبادت ہے، اس کے ساتھ بھی کہا گیا، یہ نبی ہی کا مقام تھا، اور نبی ہی کا منصب تھا، اور نبی ہی کی خصوصیت تھی کہ وہ یہ کہے، دوسرا مصلح، کوئی دوسرا دینی پیشوا، کوئی عالم دین شاید اس کا ذہن بھی ادھر نہ جاتا کہ روزے کے ساتھ یہ شرط لگائیں کہ "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَ احْتِسَاباً"۔

ایک واقعہ

ہم نے آپ کو سنایا ہے کہ ہماری یہاں لکھنؤ سے تقریر ہوئی، بہت شروع شروع میں جب ریڈیو قائم ہوا ہے، تو ہماری ایک تقریر یہاں رکارڈ کر لی گئی، ہم ایک بڑے لمبے سفر پر چلے گئے، افغانستان کی سرحد قریب تک ہم کو جانا تھا، تو وہاں کوئٹہ میں رمضان کی پہلی یا دوسری تاریخ پڑ گئی، تو وہاں کے ایک بڑے افسر نے جو ہندوستانی تھے، انھوں نے ہماری افطار کی دعوت کی، وہ تقریر سن کر کے آرہے تھے، انھوں نے کہا: مولانا! آپ کی تقریر سن کر ہم آرہے ہیں، بہت خوب تقریر کی اور آپ نے بڑی ضروری باتیں کہیں، ایک بات آپ نے نہیں کہی کہ افطار کرنے میں جو مزہ آتا ہے، وہ کسی چیز میں مزہ نہیں آتا، میں تو روزہ رکھتا ہی اسی لیے ہوں، میں تو روزہ ہی اس لیے رکھتا ہوں کہ افطار میں جو مزہ آتا ہے، اس وقت پانی پینے میں، یا کھانے میں جو مزہ آتا ہے، وہ کسی چیز میں نہیں آتا۔ تو صفائی سے کہہ دیا، بعد میں ہمیں ان کے دوستوں نے بتایا کہ یہ اتھیسٹ (Atheist) ہیں، یہ تو بے دین ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ روزہ رکھا جائے اور نیت نہ ہو، مگر یہ بات نبی ہی کہہ سکتا تھا، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مامور ہے، اور وحی سے اس کی رہنمائی کی جارہی ہے، پھر ''مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَاناً وَ احْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ''، شب قدر میں بغیر ایمان واحتساب کے کون اٹھے؟ لیکن اٹھتے ہیں، ایسے آپ تلاش کریں تو آپ کو ایسے لوگ مل جائیں گے کہ جن کی سرے سے کوئی نیت ہی نہیں ہوتی، سب لوگ اٹھے تھے ہم بھی اٹھ گئے، یا کوئی تکلیف تھی، یا نیند نہیں آرہی تھی، یا اس کے بعد آگے بڑھ کر بات یہ ہے کہ لوگ کہیں کہ یہ بھی بڑے شب بیدار ہیں۔

تو اس لیے ایک بات تو یہ ہے کہ جو یہاں پہلے سے پڑھ رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی تعلیم کی تکمیل اور صحیح فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، ان سے بھی ہم یہ کہیں گے کہ اس پر شکر کریں، ذرا ذہن کو حاضر کرلیں، شکر کریں کہ کوئی مانع پیش نہیں آیا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہاں بھیجا، تو ان کے تعلیمی اشتغال اور مطالعہ میں ایک برکت ہوگی، اور تائید الٰہی ہوگی کہ

شعور کے ساتھ وہ شروع ہوا ہے اور نیت کے ساتھ شروع ہوا ہے۔

اور ہمارے جو عزیز بھائی پہلی مرتبہ آئے ہیں، ان سے تو ہم یہ کہیں گے کہ ان کو تو بہت ذہن کو حاضر کر کے نماز شکرانہ پڑھنی چاہیے، دو رکعت کم سے کم پڑھیں، اور اللہ کا شکر کریں کہ بالکل ممکن تھا کہ ہم کو کسی اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی انگلش میڈیم اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی ہندی اسکول میں بھیج دیا جاتا، کسی کام پر لگا دیا جاتا، کوئی پیشہ سیکھنے کے لیے ہمیں کہیں بٹھا دیا جاتا، اور کچھ نہ ہوتا تو کوئی بیماری مانع بن جاتی، یا ماں باپ کی محبت مانع بن جاتی، سب ہوسکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں آنے کی توفیق دی، اس پر استحضار ہونا چاہیے، ذہن کو حاضر کرنا چاہیے، تو اس سے بہت بڑا فرق ہوگا، تو ان سے تو یہ کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں، زبان سے الحمد للہ اس نیت کے ساتھ کہیں، دل کی گہرائی سے الحمد للہ کہیں، اور انجام کو سوچیں کہ اگر ہم اور کسی لائن میں جاتے تو کیا انجام ہوتا؟ کہ ہم کو صحیح عقائد کا بھی علم نہ ہوتا، اور عقائد کا علم ہوتا تو ان عقائد پر ہمارا کوئی ایمان وعقیدہ نہ ہوتا، ہم کو فرائض کا علم نہ ہوتا، ہم کو اپنے پڑوسیوں، عزیزوں کی عاقبت کی فکر نہ ہوتی، ہم کو ملک میں جو حال ہو رہا ہے، جس خطرہ میں یہ ملک مبتلا ہو رہا ہے، اور اس کا سامنا کرنے جا رہا ہے، اور جو یہاں اسلام کا بظاہر انجام نظر آتا ہے، کہ کہیں یہ ملک اسپین تو نہیں بن جاتا، ہمیں ان باتوں میں سے کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی، بلکہ ممکن ہے کہ ہم اس مخالف لشکر میں، اس مخالف محاذ میں ہم شریک ہوتے، تو اس کو، ذہن کو حاضر کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اس سے فرق پڑے گا ان شاء اللہ آپ کے پڑھنے میں، آپ کے فہم میں، اور انتفاع میں اور اس وقت کے انتفاع میں بھی اور آئندہ بھی اُس سے کام لینے میں فرق پڑے گا، ایک بات تو یہ کہتا ہوں۔

اخلاص اور اختصاص

اب اس کے بعد یہ کہتا ہو کہ میں نے بہت دنوں سے ایک عنوان بنایا، بہت سے مدارس میں خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے، تو میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس کے طلبہ کو دو چیزوں کی ضرورت ہے: اخلاص - اختصاص۔

ایک تو اخلاص ہو کہ ہم اللہ کی رضا کے لیے، اللہ کے احکام ومنشا کو معلوم کرنے کے لیے، اور ضلالت سے بچنے کے لیے، اور قیامت کے خطرات سے، عذاب جہنم اور دوسرے اھوال سے بچنے کے لیے ہم یہ علم پڑھ رہے ہیں۔

اور دوسری یہ کہ اختصاص ہو، یعنی آپ استعداد پیدا کریں اور آپ کسی ایک علم کو اپنا خاص موضوع، مرکزی موضوع بنا کر محنت کریں۔

سب علوم ہیں، اور یہ ہمارا نظام تعلیم جو ہے، قدیم دینی تعلیم، اس میں علوم میں باہمی تعاون بھی ہے، اور ایک کا دوسرے پر انحصار بھی ہے، اور یہ علوم ایک دوسرے کے معاون بھی ہیں، تو اس لیے یہاں یہ تفریق نہیں ہے کہ اگر ادب ہے تو دین نہیں، اور دین ہے تو ادب نہیں، اور ادب ہے تو فلاں، نثر ہے تو نظم نہیں، نظم ہے تو نثر نہیں، یہ سب کچھ نہیں، تو یہ پورا ایک مجموعہ، پورا اجتماعی نظام جو ہے دینی تعلیم کا، اُس میں اُس سب میں ہم مشارکت پیدا کریں گے، اور اُن کا علم ہم حاصل کریں گے، اُن پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، اُس موضوع کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا کریں گے، اور بلکہ اس میں صاحب تصنیف اور صاحب تعلیم اور صاحب توجیہ بننے کی کوشش کریں گے، لیکن کسی ایک فن کو اپنا خاص موضوع بنائیں گے، اور اس میں اختصاص پیدا کریں گے۔

تو ہم کہا کرتے ہیں کہ اخلاص و اختصاص، یہ دو چیزیں ہمارے مدارس کے لیے دو بڑے عنوان ہیں، کہ تمام علوم کے بارے میں تو اخلاص کا معاملہ، پورے نظام تعلیم کے بارے میں اخلاص کا معاملہ، اللہ کی رضا کے لیے ہم پڑھ رہے ہیں، اسلام کے احکام کو، اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے، اور اس کو جذب کر لینے کے لیے، اور اس پر اپنے ایمان کو علی وجہ البصیرۃ قائم کرنے کے لیے، پھر اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہم یہ پڑھ رہے ہیں، نہ ہمیں نوکری مقصود ہے، نہ عزت مقصود ہے، نہ دولت مقصود ہے، اللہ دے دے اور وہ بھی اگر کسی درجہ میں جا کر ضروری بھی ہو تو اس کے لیے کوشش کرنا بھی کوئی حرام نہیں ہے، لیکن مقصود اصلی یہ نہیں ہے۔

فقہ کی طرف امتیازی توجہ کی ضرورت

تو ایک تو اخلاص ہو، اور دوسرے اختصاص ہو، کسی موضوع کو اپنا مخصوص، اختصاصی موضوع بنا کر اس میں کوشش کرنا، تفسیر کو لے لیجیے، حدیث کو لیجیے، اور فقہ کے متعلق آج کل یہ خیال بار بار میرے ذہن میں آتا ہے کہ ہمارے دارالعلوم میں فقہ کی طرف جتنی توجہ ہونی چاہیے، اتنی توجہ نہیں ہے، اور کچھ شروع سے ایسی روایت چلی آرہی ہے کہ جو استحضار ہونا چاہیے اور تحقیق ہونی چاہیے، مسائل پر نظر ہونی چاہیے، اور افتاء کی جو صلاحیت ہونی چاہیے، اس کی کمی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ایک وصیت

تو اس کو میں کل یا پرسوں بھی کسی موقع سے بیان کر رہا تھا، ہمارے اور آپ کے سب کے استاد مخدوم، فخر زمانہ اور فخر ہندوستان اور فخرِ عالمِ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) یہاں ڈھاکہ سے تشریف لائے، وہ بہت دل شکستہ تھے، ان کے ساتھ یونیورسٹی میں ایک بہت نامناسب واقعہ پیش آیا تھا، ہماری یہاں ٹھہرے، آخر میں ہماری یہاں، ہمارے بڑے بھائی صاحب کے پاس ٹھہرتے تھے، تو دیکھا کہ مسکراہٹ آتی ہی نہیں تھی ان کے لبوں پر، اور ایک حزن کی کیفیت ان کے چہرے پر طاری تھی، تو وہ ہمارا بہت خیال کرتے تھے، اس لیے کہ والد صاحب کے شاگرد بھی تھے، اور ان کے زمانۂ نظامت میں اور ان کے زمانۂ ذمہ داری میں انھوں نے یہاں تعلیم حاصل کی تھی، تو میں نے عرض کیا ان سے کہ سید صاحب! آپ کا طلبہ سے کوئی خطاب ہو جانا چاہیے، انھوں نے ایک دو مرتبہ تو مناسب الفاظ میں ٹال دیا کہ نہیں، پھر میں نے دو تین مرتبہ کہا تو کہا: اچھا، یہیں اسی مسجد میں ان کا خطاب ہوا، اور انھوں نے فرمایا کہ فقہ کی طرف توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

انھوں نے جب دارالمصنفین چھوڑا، تو وہ بھوپال گئے تھے، اور دارالقضاء کے وہ نگران اعلیٰ اور گویا سب سے بڑے قاضی اور اس کے صدر تھے، ان کو بہت تجربہ ہوا، پھر جب وہ پاکستان گئے تو ان کو اور مزید تجربہ ہوا، تو یہ بات انھوں نے فرمائی، اور گویا یہ ان کی وصیتوں

میں سے ایک وصیت ہے، لیکن اس کے بعد نہ ان کو یہاں تشریف لانے کی نوبت آئی، اور نہ خطاب کرنے کی۔

آپ کو سب سے زیادہ فقہ سے واسطہ پڑے گا

تو ایک بات تو یہ آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کو سب سے زیادہ جس چیز سے واسطہ پڑے گا، وہ فقہ کا علم ہے، کہ آپ جب جس گاؤں میں ہوں گے، جس محلّہ میں چھوٹا ہو یا بڑا ہو، وہاں کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا پیش آئے گا کہ لوگ آپ سے مسئلہ پوچھنے آئیں گے کہ صاحب! نماز میں یہ غلطی ہوگئی، کیا سجدۂ سہو کرنا چاہیے تھا؟ یا دوبارہ نماز پڑھنی چاہیے؟ یہ نماز صحیح ہوگئی؟ اور کوئی زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھے گا، کوئی میراث کے متعلق مسئلہ پوچھے گا، اور کوئی طہارت وغیرہ کے متعلق پوچھ سکتا ہے۔

تو ایک بات تو آپ سے یہ کہنا ہے کہ فقہ کی طرف آپ ایک امتیازی توجہ کریں، اور اب ماشاءاللہ یہاں دارالقضاء بھی قائم ہوگیا ہے، اور وہاں تربیت کا بھی کوئی نظام ہوگا، اور وہاں مقدمات بھی آتے ہیں، تو اس سے آپ مناسبت پیدا کریں، یہ مناسبت ہمارے یہاں بہت کم ہوگئی۔

علوم قرآن میں اختصاص

پھر اُس کے بعد قرآن مجید ہے، قرآن مجید کا اعجاز، قرآن مجید کا اس زندگی پر انطباق، اور قرآن مجید سے عدول کی جو اس وقت پوری نسل انسانی کو اور ہمارے ماحول کو جو سزائیں مل رہی ہیں، اور قرآن مجید ہی جو دنیا اور آخرت میں ایک کامیاب زندگی کا ضامن ہے، اور پھر اس کا معجزانہ اسلوب اور ایک ایک لفظ کا معجزہ ہونا، اور اس کی پیشین گوئیاں اور اس کی اخلاقی تعلیمات، ان ساری چیزوں سے آپ کو ایک زندہ مضمون کی طرح، ایک کتابی مضمون کی طرح نہیں، بلکہ ایک زندہ حیاتی مضمون کی طرح، حَیَوی مضمون کی طرح اور ایک عملی مضمون کی طرح آپ کی توجہ ہونی چاہیے۔ اللہ کے فضل سے، اللہ نے آپ کو ایسے استاد بھی عطا کیے

ہیں جو آپ کی اس میں مدد کر سکتے ہیں اور آپ کو روشنی دے سکتے ہیں۔

فن حدیث میں اختصاص پیدا کریں

پھر اس کے بعد حدیث کا فن ہے، حدیث کے فن کو بہت تیزی سے زوال آرہا ہے، اور ہندوستان جو مرکز بن گیا تھا، اخیر میں یمن مرکز تھا، ہماری نظر ہے تاریخ پر اور ممالک عربیہ کی تاریخ پر، یمن مرکز بن گیا تھا، پھر اس کے بعد حجاز مرکز بنا، اسی زمانے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی حجاز گئے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجاز گئے، وہاں سے علم حدیث لے کر آئے، پھر یمن کے اساتذہ وشیوخ یہاں آئے، شیخ حسین بن محسن انصاری آئے اور ہندوستان کے بڑے بڑے عالم ان کے شاگرد ہوئے، اور اس میں ایک نئی طاقت اور انجذاب پیدا ہوا۔

تو حدیث کا فن بھی بہت تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے، اس کی طرف بھی آپ کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اس کے جو مقدمات ہیں ان کو اچھی طرح سے پڑھیں، اور پہلے سے تیار ہو کر جائیں، اور اس کے بعد بھی مطالعہ کریں، اور احادیث کی شروح بھی دیکھیں، اور اس میں پھر محدثین کے حالات سے واقفیت آپ کو ہونی چاہیے، بڑی کتابیں تذکرۃ الحفاظ وغیرہ پڑھیں، لیکن کم از کم شاہ عبدالعزیز صاحب کی بستان المحدثین، اور پھر اس کے بعد آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی چیزیں پڑھیں، اور حدیث کو بحیثیت فن کے، اور ایک بہت بڑے مکتبہ کے، ایک بہت بڑے مستقل کتب خانہ کے آپ اس سے تعلق اور مناسبت پیدا کریں، اور اس سے ایسا تعلق خاطر پیدا کرلیں کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو موقع دے تو آپ جا کر اس کا درس دے سکیں۔

آج بڑے بڑے مدرسوں میں مسندیں خالی ہورہی ہیں، اس وقت نام لینے کی ضرورت نہیں، کہ جہاں افغانستان اور صوبہ سرحد اور اب جو پاکستان کہلاتا ہے، اور ہندوستان کے آخری کنارے اور جو بنگلہ دیش کہلاتا ہے، جہاں وہاں سے طلبہ آتے تھے ان سے پڑھنے کے لیے اور استفادہ کے لیے، اور عرب تک آتے ہوں، تعجب نہیں، آج وہاں ان کے درجہ کے لوگ نہیں ہیں، اور تقریباً پورے ہندوستان کا حال یہ ہورہا ہے، تو حدیث میں بھی

اختصاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

صرف ونحو میں رسوخ پیدا کریں

اور پھر اس کے بعد سب کے جو مقدمات ہیں، صرف ونحو میں آپ کو رسوخ ہو، آپ اس پر پورے طور پر حاوی ہوں، اور عبارت صحیح پڑھنا تو معمولی بات ہے، جو نحوی توجیہ ہے اور صرفی توجیہ ہے اور تصحیح ہے، اور اس میں جو نزاکتیں ہیں، ان سب کو آپ سمجھتے ہوں، اس چیز کی طرف بھی آپ کو توجہ کرنی چاہیے۔

عربیت کی طرف توجہ کی ضرورت

اور ایک بات میں یہ کہوں گا کہ عربیت کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عربیت ندوہ کا گویا ایک امتیازی نشان ہے، اور گویا ایک موروثی چیز ہے، وہ چلی آرہی ہے، اس لیے اس کا نام لیا جاتا ہے، یہ گویا یہاں کا ایک افتخار بن گیا ہے، باقی اس کی کوئی اور قدر و قیمت اور اس کے فوائد ذہن میں نہیں ہیں، یہ بات نہیں ہے، عربی زبان قرآن مجید کے اعجاز کو سمجھنے کے لیے، بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے، اعجاز تو بڑی چیز ہے، قرآن مجید کے فہم کے لیے، حدیث کے فہم کے لیے، فقہ کی باریکیوں اور جو مجتہدین کے آراء ہیں، اور ان کے فتاویٰ ہیں، ان کے فیصلے ہیں، اُن کے فرق کو سمجھنے کے لیے، اُس فرق کے مبنیٰ کو سمجھنے کے لیے جو بعض مرتبہ الفاظ پر موقوف ہوتے ہیں، اُس سب کے لیے صرف ونحو میں پوری کامل استعداد حاصل کرنی چاہیے، اور اس میں آج کل عام طور پر بہت ہی گراوٹ اور ایک انحطاط پیدا ہو گیا ہے کہ مدارس کے لوگ آتے ہیں اور ہمیں ہمارے امتحان لینے والے اساتذہ بتاتے ہیں کہ دو سطر بھی صحیح عبارت نہیں پڑھ سکتے۔

دوسری بات یہ کہ اس کی قدر و قیمت، کہ اس وقت عالم اسلام میں ممالک عربیہ کئی حیثیتوں سے، ممالک عربیہ پہلے تو اسلام کا مرکز تھے، خاص طور سے حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب، لیکن اب بھی ممالک اسلامیہ دین کا سرچشمہ، دین کا مرکز ہیں، اور دنیا کی سیاست

میں اور اسلام کے مستقبل میں، اسلام کی آئندہ تاریخ میں اور مستقبل میں ممالک اسلامیہ کو بہت بڑا رول، بہت بڑا کردار ادا کرنے کا موقع ہے، اور موقع رہے گا، اور اس کی اہمیت رہے گی، اور یورپ و امریکہ کی جیسی نظر ممالک عربیہ پر ہے، اور ممالک عربیہ کے افساد پر ہے، ممالک عربیہ میں بے دینی پیدا کرنے پر ہے، ممالک عربیہ میں اسلام پر اعتماد کھو دینے، اسلام پر سے اعتماد اٹھ جانے کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے لیے نئی نسل کو تیار کرنے کے جیسے منصوبے امریکہ اور یورپ میں ممالک عربیہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں، میں اپنی عملی واقفیت اور اپنی سیاحتوں کی بنا پر اور اپنے ان حلقوں سے تعلق کی بنا پر کہتا ہوں کہ ویسی توجہ یورپ و امریکہ کی نہ پاکستان پر ہے، نہ ایران پر ہے، اور نہ ہندوستان پر ہے۔

تو ان ممالک عربیہ میں ایسے فتنے اٹھ سکتے ہیں، ایسی تحریکیں پیدا ہو سکتی ہیں، ایسے رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ان میں ضرورت ہے ان کا مقابلہ کرنے کی، اور عربوں کو ان کی زبان میں متاثر کرنے کی، اور ان کے ذہن کو بدلنے کی، اور یہ اتنا بڑا دعوتی کام بلکہ اتنا بڑا انقلابی کام، اتنا بڑا اپنے وقت کا جہاد، اپنے وقت کی عبادت ہوگی کہ جس سے روح نبوی کے خوش ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

سب سے بڑھ کر فخر و شکر کی بات

میں آپ سے مسجد میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ روح نبوی جس سے سب سے زیادہ شادماں ہوگی، وہ یہ ہے کہ جن کے صدقے میں آپ کو ایمان ملا ہے، جن کے طفیل میں آج آپ مسلمان ہیں، جنھوں نے آپ کو کلمہ پڑھایا ہے، آپ اگر وہاں کوئی ضلالت پیدا ہو رہی ہو، تو آپ کے لیے اِس سے بڑھ کر کوئی توفیق کی بات، اِس سے بڑھ کر کوئی فخر و شکر کی بات، اِس سے بڑھ کر اگر لفظ غلط و بے محل نہ ہو تو کہوں، اس سے بڑھ کر معراج نہیں ہو سکتی، وہ معراج تو معراج آسمانی تھی، لیکن میں اس معراج زمینی کے متعلق کہتا ہوں، میں اس معراج اصلاحی کے متعلق کہتا ہوں، میں اس معراج علمی کے متعلق کہتا ہوں، اس سے بڑھ کر کوئی معراج نہیں ہو سکتی، اللہ اکبر! ماں باپ نہیں، اجداد کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے، اجداد اگر اس پر فخر کریں

اور عالم برزخ میں بھی شکر کریں کہ اللہ نے ہمارے بیٹے اور پوتے کو توفیق دی کہ یہ مصر جا کر، یہ شام جا کر، یہ حجاز مقدس جا کر وہاں کی کسی غلط چیز کو غلط کہتا ہے، اور وہاں ان کے سامنے ایسی تقریر کرتا ہے، اور ان کے سامنے ایسی تحریر پیش کرتا ہے جس سے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، اور جن سے ان کے اندر غیرت پیدا ہوتی ہے، کہ ہم نے یہ مستشرقین کا یہ اثر قبول کر لیا، ہم نے مغربی تہذیب کا یہ اثر قبول کر لیا۔

یہودی دماغ اور عیسائی وسائل بمقابلہ اسلام

آج یاد رکھیے، ابھی جب آپ کا مطالعہ بڑھے گا، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت یہودی، یہودی دماغ اور عیسائی وسائل اور طاقت واقتدار، اور امریکہ اور برطانیہ کے تجربات ، سیاسی تجربات، انقلاب لانے والے والے تجربات، سب اس وقت اس بات پر تل گئے ہیں اور ان کی ساز باز ہوگئی ہے کہ اسلام کے مستقبل کو مشکوک بنا دیا جائے، بلکہ اس کو بالکل ختم کر دینے کی کوشش کی جائے، انھوں نے اپنے مطالعہ سے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر اسلامی بیداری کو اسی طرح بڑھنے دیا گیا، تو دوبارہ دنیا اسلام کے قبضہ میں چلی جائے گی، یہ نهضة ثانية ہے، اس لیے اس کو روکنے کے لیے وہ تدبیریں کی جارہی ہیں جہاں آپ کا دماغ نہیں پہنچ سکتا۔

میں انگلستان جاتا رہتا ہوں، ہر سال جاتا ہوں، امریکہ بھی جانے کا موقع ملا ہے، اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت پوری یہودی ذہانت اور پوری مسیحی طاقت اس پر اکٹھا ہوگئی ہیں کہ ممالک عربیہ میں قومیت عربیہ کی تحریک پیدا کی جائے -- جو البعث العربي کے نام سے پہلے شروع ہو چکی ہے- اور مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کی دعوت پیش کی جائے، اور مادیت کی، اور دولت پرستی کی، اور حدود شرعیہ اور احکام الٰہیہ سے انحراف کی، اور اگر ہو سکے تو بغاوت کی کوشش کی جائے۔

سب سے بڑی سعادت

تو آپ کی یہ سب سے بڑی سعادت ہوگی کہ آپ عربی زبان میں مشق اس نیت سے

پیدا کریں کہ آپ وہاں جائیں گے، میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، اللہ مجھے معاف فرمائے، اللہ مجھے معاف کرے، اور مؤاخذہ نہ فرمائے، لیکن اس وقت آپ کے فائدہ کے لیے کہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ تمھیں اپنی عمر میں سب سے بڑی عزت کا کون سا موقع حاصل ہوا ہے؟ اور تم سب سے زیادہ کس بات پر خوش ہوئے ہو، تم نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے؟ تو میں آپ سے اس وقت کہتا ہوں کہ میں ایک مرتبہ مکہ معظّمہ گیا، اور جایا کرتا تھا، ہر سال جایا کرتا ہوں، اور میرے جانے کی سب کو خبر بھی نہیں ہوتی، جمعہ کا دن آیا، جمعہ کی نماز کا وقت آیا، اور میں گیا تو خطیب حرم شیخ عبداللہ الخیاط نے جو بڑے فاضل تھے، انھوں نے اپنے خطبہ میں میری تحریر کا ایک اقتباس پڑھا، پوری تحریر کا ایک پورا اقتباس پڑھا، یقول أحد الفضلاء، یقول أحد المفکرین کچھ اس طرح کہہ کر، تو مجھے یاد آ گیا کہ یہ میری فلاں تحریر کا، ماذا خسر العالم کا، یا کسی فلاں کتاب کا اقتباس ہے، تو میں نے کہا: اللہ اکبر! رائے بریلی کا دیہاتی، رائے بریلی کا اردو بولنے والا، جو ذہانت میں، محنت میں، کسی چیز میں کوئی فوقیت نہیں رکھتا، اس نے ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی، اور عرب استادوں سے پڑھا، اور آج وہ اتنے بڑے مجمع میں، اور اللہ تعالیٰ کی سب سے محبوب ترین زمین میں، حرم شریف میں، بیت اللہ شریف کے سامنے جو خطبہ دیا جا رہا ہے، جس سے بڑھ کر کسی فرمانروا کا کوئی خطاب، کسی شہنشاہ کا کوئی خطاب نہیں ہوسکتا، وہ خطیب جو ممبر پر کھڑا ہے، وہ جو خطاب دے رہا ہے، اس کے برابر دنیا میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا، اس کلام میں مجھ جیسے ہندی کی عبارت شہادت کے طور پر نقل کی جا رہی ہے، تو اس سے مجھ پر جو اثر ہوا، وہ آج تک مجھے یاد ہے۔

پھر اس کے بعد اتفاق سے دوسرے دن یا تیسرے دن، یاد نہیں، یا اسی دن وہاں کے رئیس المطوفین جو ہندی الاصل تھے، شاید بھوپال کی طرف کے تھے، انھوں نے دعوت کی، تو اس میں کئی علماء کو بلایا، اور خطیب صاحب کو بلایا، اور مجھے بھی بلایا، تو میں نے کہا کہ فضیلۃ الشیخ! آپ نے خطبہ میں ہماری ایک عبارت پڑھی، ہمیں بڑی خوشی ہوئی، اور بہت شرم بھی آئی، بہت فخر ہوا، کہنے لگے کہ میں تو کئی مرتبہ تمہاری عبارتیں پڑھ چکا ہوں، پہلے نام لے کر پڑھا کرتا

تھا، پھر حکومت کی طرف سے اشارہ ہوا کہ نام نہ لیا کرو، تو اب میں بغیر نام کے پڑھتا ہوں۔

تو بھائی! تم بتاؤ، میرے عزیزو! میرے فرزندو! بھائیو! تم بتاؤ، اس سے بڑھ کر دنیا میں فخر کی، اس سے بڑھ کر دنیا میں شکر کی کوئی بات ہو سکتی ہے، کہ تم عربوں کو جا کر خطاب کرو، تم عربوں کو جا کر اس دین کی دعوت دو، جو دین وہیں کے ذریعہ سے آیا اور تمام دنیا میں پھیلا ہے، اور ان کی زبان میں دعوت دو اور وہ متاثر ہوں، اور وہ اس میں کوئی عیب نہ نکال سکیں، یہ چیزیں تم کو حاصل ہو سکتی ہیں، کوئی ہماری خصوصیت نہیں، ہم تو کسی حیثیت سے بھی، ہم کوئی اپنے ساتھیوں میں بھی اپنے زمانے میں بھی تفوق نہیں رکھتے تھے، ایاز قدر خود رابشناس، لیکن یہ اللہ کا فضل اور ہمارے سرپرستوں کا اخلاص اور دعائیں تھیں کہ جو اللہ نے اس قابل کیا۔

اور یہ تو حرم شریف کا ذکر ہے، اس لیے کہہ دیا، ورنہ چوٹی کی جو جگہیں ہو سکتی ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ نے خطاب کرنے کا موقع دیا، جہاں چوٹی کے ادباء اور خطباء اور فضلاء جہاں موجود تھے، دمشق میں وہاں کی یونیورسٹی کے ہال میں ہماری تقریر ہوتی تھی، اور ہم نے دیکھا ہے اور اب یہ اس وقت کہہ رہے ہیں، اللہ معاف کرے، دیکھا ہے کہ وہ لوگ جن سے ہم استفادہ کر سکتے تھے، یعنی شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء، شیخ معروف الدوالیبی، علامہ بھجۃ البیطار اور محمد المبارک تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے آرہے ہیں کہ آج کا خطبہ فوت نہ ہو جائے، اور کوئی ہمارا مقالہ جو رجال الفکر و الدعوة في الإسلام میں چھپے ہیں، پہلی جلد جو ہے، وہ اصل میں وہاں پڑھے ہوئے خطبات ہیں، سوائے آخری خطبہ کے جو مولانا روم پر ہے، تو اس کے لیے اس طرح آتے تھے جیسے طالب علم آتے ہیں، ہال بھر جاتا تھا، پھر رمضان المبارک آگیا، اور مغرب کے بعد ہمارا محاضرہ ہوتا تھا، اب آپ خیال فرمائیے، یہاں کوئی بڑے سے بڑا محترم آدمی بھی اگر رمضان میں مغرب کے بعد کوئی تقریر کرے، تو اس کی سننے کے لیے کون آئے گا؟ مغرب کے بعد تیاری ہوتی ہے تراویح کی، اور کھا پی کر کچھ آرام کر لینے کی، لیکن ہم دیکھتے تھے کہ اسی طرح ہال بھرتا تھا اور اسی طرح سے یہ علماء آتے تھے، تو یہ آپ کے لیے بڑے شرف کی بات ہے۔

عربی پر زور کیوں؟

یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں اور سمجھنے لگے ہیں کہ کیا ندوہ میں عربی عربی عربی کا ہر وقت چرچا اور زور دیا جاتا ہے!!، نہیں! یہ اس لیے کہ آپ کچھ حق ادا کر سکیں، وہ حق ادا نہیں ہوسکتا، صاف کہتا ہوں حق نہیں ادا ہوسکتا، اگر ہم جان دے دیں جب بھی حق ادا نہیں ہوسکتا، لیکن بہر حال حق ادا کرنے کی کوشش بھی ایک طرح کی شرافت ہے، وہ یہ کہ جن کے ذریعہ سے ہم کو ایمان ملا، جن کے ذریعہ سے ہم کو انسانیت ملی، اخلاق ملے، شعور ملا، خدا شناسی ملی، رسول سے تعلق ملا، ان کو ہم دین کی بات سنا سکیں، اور ان کے کسی انحراف پر ہم ان کو ٹوک سکیں، ان کا محاسبہ کر سکیں۔

آپ کو معلوم ہے جب قومیت عربیہ کی تحریک شروع ہوئی، تو سارا عالم عربی گونج رہا تھا، لیکن یہ میں نہیں کہتا، مجھ سے وہاں کے بعض مصروں نے کہا، شیخ محمد محمود الصواف نے کہا، جن کا ابھی انتقال ہوا ہے، بڑے مجاہد تھے، اور قائد تھے، اور رابطہ عالم اسلامی کے ممبر بھی، انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے جیسا، اور البعث العربي اور آپ کے پرچوں نے جس طرح جمال عبدالناصر کو ننگا کیا، اور جس طرح قومیت عربیہ پر ضرب لگائی، ہمارے یہاں کسی نے نہیں لگائی، اور پھر جو وہاں تقریریں ہوئیں مدینہ طیبہ میں، اللہ نے ہمیں توفیق دی، تقریباً ہر سال تقریر ہوتی تھی قومیت عربیہ اور اس طرح کی چیزوں پر، اور مکہ معظمہ میں، یہاں چوٹی کے لوگ، شیخ محمد سرور الصبان جیسے آدمی، جو وزیر مالیات رہ چکے تھے، اور رابطہ عالم اسلامی کے بانی اور سکریٹری جنرل تھے، وہ بھی تھے، وہاں ہم نے ان عربوں سے کہا: رِفْقًا رِفْقًا أَيُّهَا الْعَرَب! اور اس کے بعد ہم نے کہا کہ آپ جمال عبدالناصر کو اسلام کی دعوت کے سامنے اپنا بطل، اپنا ہیرو مانتے ہیں، آپ سے زیادہ غیرت دار تو ہندوستان کے ہندو ہیں جو ہر سال راون کو جلاتے ہیں، وہ راون کو جلاتے ہیں کہ وہ رام چندر جی کا مخالف تھا، اور آپ محمد رسول اللہ (ﷺ) کے سامنے، آپ کی دعوت کے سامنے جو کھڑا ہوا ہے، حجاب بن گیا ہے، جو قومیت عربیہ کی طرف بلا رہا ہے، آپ اس کی قدر کرنے اور اس کی تعریف کرنے کی دعوت

دیتے ہیں، تو ہم نے کہا: رِفْقًا رِفْقًا أَيُّهَا الْعَرَب! محمود الصواف دور بیٹھے تھے، انھوں نے کہا: سُحْقاً سُحْقاً أَيُّهَا الْعَرَب! اور ہماری آواز میں آواز ملائی، اور کہا کہ یہ نہ کہیے، یہ کہیے۔

یہ سب جب ہوگا جب آپ کو عربی زبان پر قدرت ہوگی، اور جب آپ قدر کریں گے یہاں اور یہاں کے اساتذہ کی، الحمد للہ نام لینا مناسب نہیں، ورنہ میں نام بھی لیتا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسے اساتذہ دیے ہیں، کم سے کم عربی زبان اور انشاء اور صحافت اور اسلام کی دعوت دینے کے لیے، اور اسلامی فکر کو عربی میں اس کا اظہار کرنے کے لیے، جن کی مثال دور دور نہیں ملتی، اور عربوں کے خطوط ہمارے پاس آئے ہیں، اور ان سے زبانی ہم نے سنا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

میرے عزیزو! یہ چند باتیں ہیں، اخلاص، اختصاص، اور تفسیر، حدیث، فقہ، جس جس مرتبہ کے یہ فنون ہیں، ان مرتبوں کے لحاظ سے آپ ان کی طرف توجہ کریں، اور ان میں سے کسی میں اختصاص پیدا کریں، اس لیے کہ بہت تیزی سے زوال، تنزل آرہا ہے، آج کہیں کوئی ایسی مسند درس حدیث کی نہیں کہ جس کے لیے دوسرے ملکوں سے لوگ سفر کر کے آئیں، آخر میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تھے، وہ بھی اس دنیا سے رحلت فرما گئے، اور ان سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، ان سے پہلے مولانا انور شاہ صاحب تھے، اور ہمارے یہاں یہیں اسی ندوہ میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) تھے جو شیخ حسین بن محسن الانصاری کے خاص شاگرد تھے، اور جگہ جگہ ایسے لوگ تھے، اب وہ حدیث کی مسند بھی خالی ہو رہی ہے، کوئی اس میں اختصاص پیدا کرے، اور فقہ سے عمومی تعلق اور مناسبت ہونی چاہیے۔

اور پھر اس کے بعد عربیت کو آپ حقیر نہ سمجھیں، یہ نہ سمجھیں کہ یہ ایک تفریحی چیز ہے، اور ایک فیشن بن گیا ہے، اور ندوہ والے اس پر فخر کرتے ہیں، بلکہ اس کو دعوت کا ایک ذریعہ سمجھ کر، دعوت کی زبان سمجھ کر، اور قرآن کی زبان سمجھتے ہوئے اپنی محنت کا میدان بنائیں، اور جب دعوت قرآن کی زبان میں دی جائے تو اس کے درجے کو کون پہنچ سکتا ہے؟ کوئی دل نکال کر کے رکھ دے، تب بھی وہ بات نہیں ہوسکتی، قرآن کی زبان میں دعوت دینا بہت بڑی بات ہے، اس

کے لیے آپ صلاحیت پیدا کریں تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کا سامان مہیا کیا ہے، النادي العربي وغیرہ میں بھی آپ شریک ہوں، یہاں کے البعث الإسلامي اور الرائد پڑھیں، اور پابندی سے پڑھیں، اور اس کے علاوہ آپ تقریر کی مشق کریں، اور پھر یہاں ہمارے ایسے جوان اور ادھیڑ اساتذہ ہیں جو اگر آج بھی کسی جامعہ عربیہ میں چلے جائیں تو ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں، اور ان کو مسند درس پہ بٹھایا جائے، الحمدللہ، میں نام نہیں لیتا ان کا، لیکن آپ ان سے واقف ہیں، اور واقف ہو سکتے ہیں، تو ادھر توجہ کریں۔

دینی امور کا اہتمام

اور پھر اس کے بعد یہ کہ یہاں نمازوں کی پابندی خود اپنے شوق سے، جلد سے جلد اذان کے بعد حاضری، اس سے پہلے بھی مسجد سے ایک تعلق ہو، نوافل بھی پڑھیں، اللہ آپ کو توفیق دے، کچھ فجر سے پہلے دو چار رکعت کی توفیق ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے، یہ سب چیزیں معاون ہیں آپ کی تعلیم کے لیے بھی، اور تعلیم کے بغیر بھی ان کی فضیلت اپنی جگہ ہے، تو یہ اور اس کے بعد یہ باہر کا جانا آنا، اور گھومنا پھرنا اس کو کم کریں، یہ ہمیں دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے، ہم اکثر گاڑی پر باہر سے آتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پارٹی اِدھر سے اُدھر جارہی ہے، ایک پارٹی اِدھر جارہی ہے، ایک پارٹی اُدھر جارہی ہے، اس میں بھی حتی الامکان کمی کریں، اضطراراً آپ شہر میں نکلیں، اس لیے کہ شہر خصوصاً آج کل کے شہر، وہ تو ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ہو سکے تو کوئی شریف آدمی اور جس کو اپنی عفت نگاہ اور عفت قلب مطلوب ہے، وہ تو وہاں مضطر ہو کر جائے تو جائے، ورنہ جانا پسند نہیں کرے گا۔

تو زیادہ تر یہاں وقت گزاریں، اور درجہ میں حاضری کی پابندی کریں، اور نمازوں میں سب سے پہلے آنے کی کوشش کریں، جلد سے جلد آنے کی کوشش کریں، اور پھر نماز کو ترقی دینے کی بھی کوشش کریں، اور پھر اس کے بعد یہ کہ ان علوم کے لیے، کتابوں کے لیے مطالعہ دیکھیں، اور اپنی استعداد میں جو خامی نظر آئے، اس خامی کو پورا کرنے کی کوشش کریں، اگر آپ کی فلاں چیز کمزور ہے تو اس کی طرف خصوصی توجہ کریں، فلاں چیز کمزور ہے تو اس کی

طرف خصوصی توجہ کریں، اور اپنے اساتذہ کو مطمئن کریں، ان کی دعائیں لیں، اور آپ یہاں سے ایسے ندوی فاضل بن کر نکلیں کہ اس پر صرف ندوے ہی کو فخر نہ ہو، ہندوستان کو فخر ہو، اور آپ جہاں جائیں ہاتھوں ہاتھ لیے جائیں۔

الحمد للہ کہ ندوہ کا اس وقت ایک مقام ہے، میں یہ آپ سے اس لیے نہیں کہتا کہ میں اس کا ایک خادم و ناظم ہوں، یا اس کا فرزند ہوں، بلکہ آپ سے کہتا ہوں کہ آج بلاد عربیہ میں ندوہ کا جو احترام ہے، اور اس کی جو وقعت ہے، وہ میں نہیں کہتا کہ کسی مدرسے کی نہیں، لیکن وہ بہت قابل شکر اور قابل فخر ہے، کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ندوہ کا ایک اسلوب ہے، اسلوب فکر ہے، اسلوب تحریر ہے، اسلوب صحافت ہے، اور وہاں ہر چیز پر فکر اسلامی غالب ہے، اور وہ لوگ کسی مغربی چیز کا اس طرح سے آسانی سے شکار نہیں ہوتے جس طرح سے ہماری جامعات کے لوگ ہوتے ہیں۔

خلیج میں جا کر نوکری کرنا آپ کے مقام سے فروتر ہے

پھر اس کے بعد ایک بات یہ بھی میں کہہ دوں، بہت سے طالب علم ہمارے یہاں اس لیے آتے ہیں کہ یہاں سے پڑھ کر وہ بلاد عربیہ میں، خلیج وغیرہ میں جائیں، اور وہاں جا کر نوکری تلاش کریں۔ یہ چیز بھی آپ کے مقام سے فروتر ہے، مجبوری کی بات الگ ہے، میں کوئی فتویٰ نہیں دیتا کہ حرام ہے یا ناجائز ہے، مکروہ ہے، لیکن آپ کے مقام سے فروتر ہے، آپ کوشش یہ کریں کہ وہاں داعی بن کر کے جائیں، آپ وہاں خطیب بن کر کے جائیں، مفکر اسلامی بن کر کے جائیں، تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا احترام بھی ہوگا، اور باقی یہ کہ جواز اور اباحت میں کوئی کلام نہیں، اور اس کے بعد یہ کہ آپ میں سے کچھ لوگ جامعات میں چلے جاتے ہیں، یہاں کی یونیورسٹیوں میں چلے جاتے ہیں، ہمیں وہاں دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے، ہمارا بھی آنا جانا ہوتا ہے، علی گڑھ پہلے ہم بہت جایا کرتے تھے، اب تو برسوں سے نہیں جانا ہوا، لیکن اور بعض یونیورسٹیوں میں کہ وہاں جاتے ہی ان کی وضع بدل جاتی ہے، لباس بدل جاتا ہے، پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ ندوی ہیں، بڑی شرم آتی ہے، اتنی جلدی تغیر

آ گیا؟ بالکل معلوم ہوتا ہے کہ ایک چولا تھا جس کا انتظار تھا کہ جلدی سے موقع ملے تو ہم اس چولے کو اتار دیں، دوسرا چولا پہن لیں، آپ کو وہاں استقامت میں، نمازوں کی پابندی میں اور وضع و ہیئت میں میں نمونہ بننا چاہیے۔

علم میں کمال اور صلاح و خشیت الٰہی سب سے بڑی قابل احترام وردی

اور جب وضع و ہیئت کا نام آ گیا تو میں آپ سے ایک بات صفائی سے کہتا ہوں کہ یہاں کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ڈاڑھی رکھے، یہاں کے طالب علم کے لیے حلقِ لحیۃ ناجائز ہے، حرام ہے، ممنوع ہے، اور خلاف قانون ہے، اور یہاں کے طالب علم کے لیے کسی طرح یہ بات زیبا نہیں کہ وہ وہ لباس اختیار کرے جس سے یہ شبہ ہو کہ یہ کالج کا طالب علم ہے، یونیورسٹی کا طالب علم ہے یا کسی عربی مدرسے کا طالب علم ہے، ٹخنہ سے نیچے پائجامہ ہونے کو جب شریعت نے ناپسند کیا ہے تو پھر وہ جو بار بار آتا ہے کہ خَالِفُوْا الْیَهُوْدَ وَ النَّصَارَی، خَالِفُوْا الْیَهُوْدَ وَ النَّصَارَی، یہود و نصاری کے شعارات کو منع کیا گیا ہے، اس لیے کہ ان کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے، اور یہ پیغمبر ہی کی زبان سے یہ بات نکل سکتی تھی، تو ڈاڑھی شرعی ڈاڑھی ہونی چاہیے، صورت شکل مولویوں کی سی، صفائی سے کہتا ہوں مولویوں کی سی ہونی چاہیے، اس سے شرمانا نہیں چاہیے، اور کسی مولوی کو اب شرمانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے سامنے انگریزی داں لوگوں کے، ماہرین کے، یورپ و امریکہ سے واپس آنے والوں کے، برسوں وہاں زندگی گزارنے والوں کے اور جو ان کے اسپیشلسٹ (Specialist)، اور بڑے بڑے با کمال ہیں، ان کے مطالعہ، اور ان کے علم، ان کے فہم، ان کی تحقیق، ان کے کردار، ان کے اخلاق کے وہ نمونے ہمارے سامنے آ چکے ہیں کہ بالکل رعب ان کا اٹھ گیا ہے، سب دھوکہ ہے، کوئی ہم پر ان کو تفوق حاصل نہیں ہے، آپ اپنے فن میں کمال پیدا کریں، تو آپ دیکھیں گے آپ یورپ جائیں گے، تو وہاں آپ کا احترام ہوگا۔

ہم نے وہاں کے بڑے بڑے مستشرقین سے باتیں کی ہیں، انھوں نے بہت توجہ سے ہماری باتیں سنی ہیں، تو بس ایک بات یہ کہنا ہے کہ اس میں شرمانے کی بالکل ضرورت نہیں، ہم آپ سے صاف کہتے ہیں، یہاں آپ رہیں تو آپ یہاں عالموں کی شکل اختیار کریں، اپنے استادوں کی تقلید کریں، اور علمائے ربانی کی تقلید کریں، اور بالکل اُس سے نہ شرمائیں، اور آپ کو تمام شرعی حدود اور محظورات کا پورا خیال رکھنا چاہیے، اور کم سے کم اِس کی اجازت بالکل نہیں ہے کہ آپ یہاں رہ کر آزادی کے ساتھ ڈاڑھی منڈائیں اور بالکل اسکول کے ایک طالب علم معلوم ہوں، اور اس طرح کا لباس آپ پہنیں، کوٹ پتلون پہنیں، اس کی یہاں اجازت نہیں دی جاسکتی، اور یہ کسی معنی میں بھی آپ کے لیے مفید نہیں ہے۔

علمائے ربانی اور نائبین رسول سے ظاہراً و باطناً مشابہت

آپ یاد رکھیے، جتنا ظاہراً و باطناً آپ کو مشابہت ہوگی علمائے ربانی سے، نائبین رسول سے، مشائخ کرام، اولیائے عظام سے، اور خادمین حدیث و فقہ اور حاملین علم سے، اتنی ہی آپ میں مقبولیت اور محبوبیت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی، آپ کا احترام کیا جائے گا، اور آپ کامیاب زندگی گزاریں گے۔

اختصاص اور امتیاز جھکاتا اور احترام پر مجبور کرتا ہے

یہ سب غلط ہے کہ فلاں شعار اختیار کر لینے سے یہ ہوتا ہے، فلاں شعار اختیار کر لینے سے یہ ہوتا ہے، علم جھکاتا ہے، اختصاص اور امتیاز، کوئی علمی امتیاز، کوئی تحقیقی کتاب، کوئی تحقیقی مقالہ، وہ بڑے بڑے امراء کو بلکہ بعض اوقات ملوک اور بادشاہوں تک کو احترام پر مجبور کر دیتا ہے، اور الحمد للہ ہم بھی اپنی تمام پستیوں کے باوجود اس منزل سے گزر چکے ہیں، کہ بادشاہ بھی احترام سے ملے ہیں، تو یہ سب باتیں محض مغالطہ ہیں کہ ہم یہ پہن کر جائیں گے تو ہمارے گاؤں میں عزت ہوگی، قصبہ میں عزت ہوگی، بازار میں عزت ہوگی، ہمارے بہت برادری کے لوگ جو انگریزی داں ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں، وہ ہمارا

احترام نہیں کرتے، کچھ نہیں، آپ کا علم سب سے بڑا سائن بورڈ ہے، اور سب سے بڑی قابل احترام وردی ہے، یہ وردی ہے آپ کی اصلی، علم میں کمال اور صلاح اور خشیت الٰہی اور سنتوں کی پابندی، اور عبادت کا ذوق اور اصلاح کی کوشش۔

اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ

آخر میں ایک بات کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ دیکھیے! اس وقت ہندوستان میں ایک ایسا دور آیا ہے جو ہمارے علم میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا، دورا کبری کو کسی قدر مشابہت ہے، لیکن دور اکبری بھی اس درجہ میں خطرناک نہیں تھا جتنا یہ دور ہے، جو اب چل رہا ہے، وہ یہ کہ اس وقت اکثریت نے یہ طے کرلیا ہے کہ اس ملک کو اسپین بنا کر رہیں گے، یعنی اس میں مسلمان رہیں گے، لیکن اپنے تمام ملی تشخصات کو چھوڑ کر، ابھی زبان کے اوپر یہ بات نہیں آئی، لیکن ہمیں معلوم ہے (ہمیں ایسے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے) کہ اذانیں بھی زور سے نہ ہوں، لاؤڈ اسپیکر تو خیر الگ چیز ہے، وہ کوئی مسنون چیز نہیں، مسجدوں کی کثرت بھی اور مسجدوں کا جائے وقوع بھی، اور مسجدوں کا وجود بھی خطرے میں ہے، اور بابری مسجد کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اس نے اس کے لیے راستہ کھول دیا ہے، اور اب وہ ہندو اخبار نویس اور کالم نگار، اور ان کے سوچنے سمجھنے والے، انگریزی اور ہندی اخباروں میں جو مضامین نکل رہے ہیں، ان میں صاف صاف یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو بالکل ہندو بن کر رہنا ہوگا، ہندوستانی بن کر رہنا ہوگا، یہاں مسلمان بن کر رہنے کی اب گنجائش نہیں ہوگی، وہ لباس میں، صورت وشکل میں، اور زبان میں، اور رسم الخط میں، اور تہذیب میں، سب میں ان تمام امتیازی خصوصیات سے دستبردار ہو جائیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہو دور سے کہ یہ مسلمان ہیں، یہ کہا جائے کہ یہ مسلمان ہیں۔

اس فتنہ کو روکنے کے لیے علماء کی ذمہ داریاں

اس وقت اس فتنہ کو روکنے کے لیے سب سے بڑی طاقت جو ہوسکتی ہے وہ علماء کی ہوسکتی ہے، وہ ہمارے فضلائے مدارس کی ہوسکتی ہے، کہ وہ جہاں جہاں کے رہنے والے ہوں،

وہاں کی مسجدوں میں تقریر کریں، جمعہ کے دن تقریر کریں، عیدین میں تقریر کریں، خوشیوں کے موقع پر تقریر کریں، نکاح وغیرہ کی مجلسوں میں تقریر کریں، کہ ہم کو اپنے پورے ملی تشخص کے ساتھ اس ملک میں رہنا ہے، کسی ایک چیز کو نہیں چھوڑنا ہے، ہم اس کے لیے بھی تیار نہیں کہ ہمارا پائینچہ ٹخنے سے نیچے ہو، ہم اس کے لیے تیار نہیں کہ ہم اپنی ڈاڑھی کو ایسا کرلیں کہ سمجھا جائے کہ اتفاقاً کچھ بال اُگ آئے ہیں، نہیں، کچھ نہیں، ہم بالکل شریعت پر عمل کریں گے، اور شریعت کے ساتھ رہیں گے، اور ہمارا نظام تعلیم وہی رہے گا، ہم اپنے بچوں کو توحید کی تعلیم دیں گے، دینیات پڑھائیں گے، اردو سے واقف بنائیں گے، اردو رسم الخط کو زندہ رکھیں گے، یہ سب سے بڑی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، اور آپ ہی سب سے بہتر طریقہ پر اس ذمہ داری کو ادا کر سکتے ہیں۔

اس وقت کا اہم ترین فریضہ

یہ باتیں سن لیجیے، اور دل پر لکھ لیجیے، کہ اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ جو ہے، وہ ہے یہی متحدہ کلچر، اور ملی تشخص سے دستبردار ہونا، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے دینی حلقے یا علمی حلقے کے بعض لوگ بھی جو قلم کا استعمال جانتے ہیں، اور علمی زبان میں بات کر سکتے ہیں، وہ بھی اس کی دعوت دینے لگے ہیں کہ مسلمانوں کو کسی بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، اور پرسنل لا کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف جو اصرار کیا، یہ بھی مسلمانوں کی ایک غلطی تھی، خواہ مخواہ کے لیے ہندوؤں میں ایک ردعمل پیدا ہوا، اور وہ سمجھے کہ مسلمان بہت تنگدل اور تنگ نظر ہیں۔

نہیں! ہم صاف صاف کہتے ہیں، ہم یہاں اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، اور اس کے ساتھ ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس ملک کی قیادت نصیب فرمائے گا، اس لیے کہ اس ملک کی آبادی کے کسی عنصر نے اپنے کو اس قابل نہیں رکھا کہ اس ملک کو خطرے سے بچائے، سب دولت پرست ہیں، مادہ پرست ہیں، نفس پرست ہیں، طاقت پرست ہیں، اقتدار پرست ہیں، جاہ پرست ہیں۔

اس لیے ہم عزت کے ساتھ رہیں گے، ہم اپنے تشخصات کے ساتھ رہیں گے، لیکن عزت کے ساتھ رہیں گے، سر اونچا کر کے چلیں گے، ہماری نگاہیں شرم سے جھکی ہوئی نہیں ہوں گی، بلکہ ہماری نگاہیں بلند ہوں گی، اور ہم سمجھیں گے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے، اور ہندوستان کا دستور اس کی اجازت دیتا ہے، اور ہندوستان صحیح سلامت اور مامون ومحفوظ اور خوشحال اسی حالت میں رہ سکتا ہے، جب اس میں ایک دوسرے کو اس کی آزادی دی جائے کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرے، اور مذہبی شعائر کا مظاہرہ کر سکے اور ان کو قائم رکھے، اور اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھے، بس یہ اس وقت کا بہت اہم ترین فریضہ ہے، میں نے اس کو اس لیے کہہ دیا کہ آپ ابھی سے اس کو اپنے پروگرام میں شامل کرلیں کہ اللہ تعالیٰ جب ہم کو موقع دے گا، بحیثیت خطیب کے، بحیثیت داعی کے، بحیثیت مدرس کے، بحیثیت مضمون نگار کے، بحیثیت صحافی کے، بحیثیت زعیم کے، تو ہم اپنے کو اس کا پابند سمجھیں گے کہ ہم مسلمانوں کو اس کی دعوت دیں کہ وہ اپنے پورے ملی تشخص کے ساتھ اس ملک میں رہیں، و آخر دعوانا أن الحمدللّٰہ رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی مسجد میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر ۱۷/شوال ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۰/اپریل ۱۹۹۳ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر ٹیپ رکارڈر کی مدد سے قلمبند کی گئی۔ (مرتب)

زبان وادب کی اہمیت اوراس کی ضرورت

قوت بیانیہ کی نعمت

عزیز بھائیو اور فرزندانِ دارالعلوم! مجھے بہت خوشی ہے کہ ''الاصلاح'' کے اس دوسرے بازو اور اس دوسرے خاندان میں آنے اور اپنے عزیزوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا ہے، 'الاصلاح' درحقیقت اس قوت بیانیہ کو پیدا کرنے کی جگہ ہے جو زبان وقلم کے ذریعہ سے وقت اور دین کے تقاضوں کو پورا کرسکے، اور دین پر جو حملے ہورہے ہیں ان کا جواب دے سکے، اور پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام پر وہ اعتماد بحال کرسکے جو متزلزل ہوتا جارہا ہے، اور جس کے بہت سے اسباب ہیں اور ان اسباب پر کتابوں میں اپنے اپنے رقبہ اور اپنی اپنی وسعت کے مطابق بحث کی جاچکی ہے۔

کل ''النادی العربی'' کے جلسے میں میں نے کہا تھا کہ اللہ کی ذات بے نیاز ہے، غنی ہے، اس کو نہ وسائل کی ضرورت ہے، نہ طاقتوں کی، خواہ جسمانی ہوں، غیبی ہوں، یا مصنوعی ہوں، کسی چیز کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ قوت بیانیہ کا ایک نعمت کے طور پر تذکرہ کیا ہے اور اس کی تاثیر بیان کی ہے، مثلاً اس نے کہا کہ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ﴾ [1] یہاں تک ہی کافی تھا، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے لحاظ سے کہ ﴿لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ﴾ ''تاکہ آپ ڈرانے والے بنیں''، لیکن اس کے بعد فرماتا ہے: ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ﴾ آپ ڈرانے والے بنیں ایسی عربی زبان میں جو واضح کرنے والی ہو، دل نشین ہو اور جو دل ودماغ کو متاثر کرے، اور جو

(۱) سورة الشعراء: ۱۹٤

یقین پیدا کرے،اور پھر فرمایا: ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [۱] یہاں عربی کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا﴾ کافی تھا،لیکن چونکہ اہل عرب مخاطب ہورہے ہیں،اور عرب ہی داعی اول ہیں دین کے،اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لیے نہ صرف عربی زبان کا انتخاب کیا بلکہ عربی مبین کہا،اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا جہاں ذکر کیا ہے خلقت انسانی کے موقع پر،تو وہاں پر بھی اس کو فراموش نہیں کیا،یہ تو کہنا بےادبی ہے، بلکہ اس کو ترک نہیں فرمایا،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿الرَّحْمَٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ [۲] اور انسان کو پیدا کیا' اور آگے فرماتا ہے کہ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ اس کو قوت بیانیہ عطا کی،اس کو سلیقہ دیا اس بات کا کہ وہ اپنی بات کو واضح کر سکے،دل نشیں کر سکے۔

تو یہ ایک طاقت ہے،اس طاقت کا استعمال جن لوگوں یا جس گروہ اور جس طبقہ اور جس ذہنیت اور مقاصد کے حامل لوگوں کے ہاتھ میں جاتا ہے، اس سے لوگ ویسا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں،اگر وہ ضالین ومضلین کے ہاتھوں میں چلا جائے،قوت بیانیہ ان کو ملے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں،تو وہ جاہلیت کی دعوت کا کام کرتے ہیں،اور عقائد سے لے کر اخلاق وسلوک اور پورے انسانی تعلقات سب کو متاثر کرتے ہیں،اور دنیا کی بین الاقوامی تاریخ میں ایسا واقعہ اور ایسا دور بار بار آیا ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں قلم پہنچ گیا اور قلم تو خیر ہر ایک لے سکتا ہے،لیکن وہ چلنے والا اور متاثر کرنے والا قلم پہنچ گیا،اور ان کو وہ زبان ساحر اور بیان ساحر مل گیا جس سے وہ بگاڑ پیدا کر سکیں، اور ایک ایسا ادب وجود میں آیا جس نے پورے معاشرہ کو متاثر کیا۔

آپ یونان کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت بڑا حصہ اس ادب کا تھا جو یونان سے پیدا ہوا، لادینیت کا ادب،تشکیک کا ادب،نفس پرستی کا ادب، ان کو ملاحم یا رزم نامہ اور شاہ نامہ کہتے ہیں،اگر یونانی شاہ نامے پڑھیں گے جن کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے،خود عیسائیوں نے کیا ہے اور کچھ تاریخ میں محفوظ بھی ہے، پھر اگر آپ قرون وسطی کی تاریخ پڑھیں،تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے فساد کی بہت بڑی علت یہ تھی کہ قلم وزبان

(۱) سورة يوسف:۲ (۲) سورة الرحمن:۱-٤

ان لوگوں کے قبضہ میں آ گئے جن کو نہ خدا کا خوف تھا، نہ انسانیت سے محبت ہی تھی، اور نہ محاسبہ کا کوئی ڈر تھا، اور وہ نفس پرست تھے، اور وہ فساد کے داعی تھے، ان کا ایسا اثر ہوا آپ کو معلوم ہے کہ یورپ بالکل ان کے چنگل میں گرفتار اور ان کے پھندے میں پھنس گیا، گبن کی (Gibbon) مشہور اور شہرۂ آفاق کتاب The History of the Decline and Fall of the Roman Empire پڑھیں یا ڈریپر (Draper) کی History of the Conflict between Religion and Science ''معرکۂ مذہب و سائنس'' پڑھیں۔ یہ میں آپ کو بتادوں کہ میں ''الاصلاح'' کا ممنون ہوں کہ میں جب یہاں پڑھتا تھا تو تعلیم کے آخری دور میں جب یہاں تدریسی کام میرے سپرد ہوا تو مجھے اس کتاب کی ضرورت تھی، میں انگریزی جانتا تھا، انگریزی پڑھی تھی اور محنت سے میں اصل انگریزی میں کتاب پڑھ سکتا تھا، History of the Conflict between Religion and Science، لیکن مجھے یہاں اس کا ترجمہ مل گیا، مولانا ظفر علی خاں کا شاہکار ترجمہ ہے ''معرکۂ مذہب وسائنس''، یہ مجھے ''الاصلاح'' سے ملا، اور ایسے ہی History of European Morals ''تاریخ اخلاق یورپ'' تھی، یہ بھی میرے لیے کام کی چیز تھی، اور ان دونوں کتابوں سے میں نے اپنی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین میں فائدہ اٹھایا، اس لیے کہ ان دونوں کتابوں کے ترجمے ہو گئے تھے، اور بڑے لائق مترجمین کے قلم سے جو سند کا درجہ رکھتے تھے، ایک مولانا ظفر علی خاں صاحب کے قلم سے ہوا تھا، ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے، میں الاصلاح کا ممنون ہوں، احسان مند ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ الاصلاح میں یہ صلاحیت باقی رہے کہ اس سے لوگ اپنی تصنیف و تالیف میں اور تحقیقات میں کام لے سکیں۔

میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اپنے ذخیرۂ کتب پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیے کہ کون سی کتابیں ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں، جو ہمارے طلبہ ہی نہیں بلکہ اساتذہ کی نظر سے گزرنی چاہئیں، اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں اور میں نے خود اپنے

متعلق شہادت دی ہے کہ اساتذہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، ''الاصلاح'' کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے، اس لیے نہیں ہے کہ وہاں جا کر اخبارات پڑھے جائیں، اخبارات تو آپ ہر جگہ پڑھ سکتے ہیں، کون سی جگہ ہے جہاں اخبار نہیں آتا، یا آپ رسائل پڑھنے آئیں، سطحی قسم کے رسائل پڑھیں جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے نکلتے ہیں، آج کل تو ہر مدرسہ سے، ہر ادارہ سے، ہر انجمن سے، ہر شہر سے رسالے نکلتے ہیں۔

ایسی چیزیں ہونی چاہئیں ''الاصلاح'' کے دارالکتب میں جن سے ذہن بنے، اور جن سے بامقصد مصنفین اور داعیوں کو اسلحہ ملے، جن سے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرسکیں، یہ ''الاصلاح'' کی بہت بڑی افادیت اور بہت بڑی خدمت ہوگی، اور اس وقت ضمناً میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے لیے میں ایک ذمہ دار اور ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے یہ صفائی سے کہتا ہوں کہ اس میں اہتمام و نظامت دونوں آپ کی مدد کرنے اور آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ نئی کتابوں کی فہرست تیار کریں، اچھے اہل نظر کے مشورہ سے اور سنجیدہ اور فکر انگیز اور مواد فراہم کرنے اور رہنمائی کرنے والی کتابوں کی، اور اس کے بعد آپ کا بجٹ اس مد کے لیے کافی نہ ہو تو میں اعلان کرتا ہوں کہ دارالعلوم اس میں مدد کرے گا۔

یہودی دماغ اور عیسائی وسائل

تو اس وقت یہ قوت بیانیہ خواہ وہ تحریری ہو یا تقریری ہو، اس وقت اور زیادہ مسلح ہوگئی ہے، اور مسلح ہی نہیں بلکہ جیسا کہ ہمارے عزیز ''الاصلاح'' کے غالباً ناظم ہیں، انھوں نے جو مضمون پڑھا، اس میں انھوں نے کہا کہ یہ بات میں نے بہت دن پہلے کہی تھی کہ صدیوں کے بعد یہ بات پیش آئی ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی وسائل و طاقت دونوں متحد ہوگئے ہیں، حالانکہ دنیا کے جن دو مذہبوں میں زیادہ سے زیادہ تضاد ہوسکتا ہے، وہ یہودیت اور عیسائیت ہیں، عیسائیت کی بنیاد اس پر ہے کہ مسیح ابن اللہ ہیں، اور یہودیت کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ حضرت مسیح پر تہمت لگاتے ہیں، نسبی تہمت لگاتے ہیں، جو کوئی عیسائی برداشت نہیں کر سکتا، لیکن اس کو عیسائیوں نے فراموش کردیا، یہاں تک کہ پاپائے اعظم نے یہ قصور معاف کر

دیا یہودیوں کا، جو عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کرتے تھے، تہمت لگاتے تھے، تو اس وقت ایک بڑی گہری سازش ہے دنیا میں اور اس نے اس وقت عنوان اختیار کیا ہے Fundamentalism کا، یعنی روس کے زوال کے بعد امریکہ نے یہ سمجھ لیا اور برطانیہ اور عیسائی اور بڑی طاقتوں نے کہ اگر اب خطرہ ہو سکتا ہے اور کوئی حریف میدان میں آ سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس لیے بڑی ہوشیاری سے اور اس میں یقیناً یہودی دماغ کام کر رہا ہے، انھوں نے اس کو عنوان دیا ہے Fundamentalist کا یعنی اصول پرست، گویا قدامت پرست اور حق پرست، یا یوں کہیے کہ جو قدیم ذخیرہ ہے اس کے پرستار، اس کی اصطلاح کی جگہ پر Fundamentalist کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے، اور اس کا اس قدر پروپیگنڈا ہے اور اس زور شور اور بلند آہنگی کے ساتھ اور ایسے مدلل بلکہ منظم طریقہ پر یہ بات کہی جا رہی ہے، کہ کسی آدمی کے لیے مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ میں Fundamentalist ہوں، حالانکہ ایک مذہبی کے لیے Fundamentalist ہونا ضروری ہے، مذہبی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ منصوصات قطعی پر، نصوص دین پر، آسمانی صحیفوں پر اور کتاب اللہ پر، عیسائی ہو تو انجیل اور اگر مسلمان ہے تو اللہ کے آخری کلام قرآن مجید کے بیانات پر، اس کے احکام پر، اس کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں۔

اور اس وقت یہ Fundamentalist کی اصطلاح اتنی عام ہو گئی ہے کہ بہت ہی تأسف اور ندامت کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ممالک عربیہ میں بھی یہ اصطلاح پہنچا دی گئی ہے، ابھی ہمارے پاس ایک خط آیا، شاید ایک ہفتہ یا دو ہفتہ ہوا ہو، میں نام نہیں لوں گا اور ایک ایسی جگہ سے آیا ہے کہ جہاں کے حاکم وسلطان ہم سے ذاتی طور پر واقف ہیں، احترام کرتے ہیں، ہمارا ان کا لندن میں ساتھ رہا ہے، اور انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انھوں نے اپنے منطقہ میں (جس جگہ کے وہ امیر ہیں) ایک سڑک کا نام ہمارے نام پر رکھا تھا "شارع أبي الحسن الندوي"، اتنا وہ خیال کرتے ہیں، اور ایک بڑے بین الاقوامی ادارے میں وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں، ان کے عزیز قریب کیا بلکہ ان کے ترجمان کا خط آیا ہمارے نام کہ متشددین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم چند مفکروں اور چند علماء کے

نام یہ سوال نامہ بھیج رہے ہیں کہ متشددین کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، جس کو عربی اصطلاح میں "متطرفین" کہتے ہیں، انتہا پسند، Fundamentalist کا ترجمہ اصلاً مبدئیین ہے، جو مبادی پر یقین رکھتے ہیں۔

نفس پرستی دنیا کے فساد کا سبب

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کا سارا فساد اس لیے ہے کہ کسی اصول پر یا کسی بنیاد پر یقین نہیں ہے، خالص نفس پرستی ہے، اور خالص فائدہ اندوزی اور اپنے نفس کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے، خواہ تمام دنیا کے مسلمہ اخلاقی اصول کے خلاف ہو، چاہے اس کا پوری انسانیت، پورے معاشرۂ انسانی اور پورے عہد پر کچھ اثر پڑے لیکن اپنا کام نکالنا ہے، یہ معنی تھے بے اصولی کے اور اس بے اصولی نے آج دنیا کو اس جگہ پر پہنچا دیا ہے کہ کسی وقت قیامت آسکتی ہے، وہ قیامت تو اللہ تعالیٰ لاسکتا ہے، اس قیامت کا ذکر نہیں، ایک ویسی قیامت یعنی قیامت صغریٰ ہر وقت ہوسکتی ہے، پہلی جنگ عظیم بھی ایک طرح کی قیامت صغریٰ تھی، دوسری جنگ عظیم بھی، ایسی جنگیں ہوسکتی ہیں اور اس سے بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہیں، وہ صرف برطانیہ اور جرمنی کی جنگ تھی اور اس میں کچھ اور طاقتیں شامل ہوگئی تھیں، اور دوسری جنگ بھی ایسی ہی تھی، لیکن اب جو جنگ ہوگی وہ بہت خطرناک ہوگی، اس لیے کہ اس وقت ایٹمی ہتھیار وسیع پیمانہ پر موجود ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ اس جنگ کا رقبہ اس جنگ سے کہیں زیادہ وسیع ہوگا، اور یہ سب نتیجہ ہوگا بے اصولی اور نفس پرستی اور مطلق آزادی کا اور ظاہر بینی کا، لیکن ان کو شرم نہیں آتی انھوں نے یہ اصطلاح ایجاد کی، حالانکہ سارا فساد یہی ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (۱) یہ کیا ہے، اس کی اصل بنیاد آپ دیکھیں اور قرآن مجید کے پورے سیاق وسباق پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ﴿بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ میں یہ بے اصولی اور نفس پرستی اور مکمل آزادی اور

---

(۱) سورة الروم: ۴۱

ہر طرح کی چھوٹ اور نفس کی تسکین کا ہر قیمت پر سامان کر لینا ہے ﴿بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا﴾[(۱)] کہ اللہ تعالیٰ جس کو فرماتا ہے، یہ سب Fundamentalist کے منکروں کے خیالات ہیں، اور ان کے مقاصد اور ان کی دعوت میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ خیال کیجیے قرآن مجید کی بلاغت کا کہ ﴿أَيْدِي النَّاسِ﴾ پہ اس کی نسبت کی ہے، اس کی نسبت کسی اور چیز پر نہیں ﴿بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ ان لوگوں کے ہاتھوں نے کیا جو کسی اصول پر ایمان نہیں رکھتے تھے، کسی بنیاد پر ان کا اتفاق نہیں تھا، کوئی حدود ان کے لیے مقرر نہیں تھے کہ یہاں سے یہاں تک جائیں گے، اور اس کے بعد آگے نہیں جائیں گے۔

خطرناک سازش

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وقت بڑا نازک اور خطرناک ہے، اس میں تبادلۂ خیال کی صلاحیت، تحریری صلاحیت اور لسانی و بیانی صلاحیت، خطابت کی صلاحیت اور تقریر کی صلاحیت ان سب چیزوں کی ضرورت ہے، اور اب وہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ جیسے کہ آج سے پچاس برس پہلے تھا کہ آپ کسی میلاد اور کسی سیرت کے جلسے میں تقریر کر دیں، یا کسی انجمن کے پلیٹ فارم سے کوئی تقریر کر دیں، یا اپنے مدرسہ کا تعارف کرا دیں، یا کوئی نیک مقصد کے لیے جلسہ ہو اور اس میں آپ تقریر کر دیں، اب تو ایک عالمی سازش ہے، بڑے وسیع اور نہایت گہرے پیمانے پر، اور اس کے مضمرات بہت دور رس اور بہت دقیق اور بہت عمیق ہیں، یہ اتنی بڑی سازش کم سے کم میرے محدود مطالعہ میں جس کے پیچھے اتنا پروپیگنڈہ ہوا اور اتنے ذرائع ابلاغ ہوں جسے آج میڈیا کہتے ہیں، ذرائع ابلاغ سب کے سب ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس اور سیمنارس، ملکوں کے دورے اور آنے جانے والے وفود یہ سب کے سب اس نکتہ پر آ کر متحد ہو گئے ہیں کہ دنیا میں (Fundametnalism) کا مقابلہ کیا جائے، یعنی کوئی اصول ہی باقی نہ رہے، حدود ہی باقی نہ رہیں، وہ سب کر سکتے ہوں جس سے دل خوش ہو جائے۔

---

(۱) سورۃ القصص: ۵۸

یورپ کا دماغ اور لذتیت

ایران کا ایک فلسفہ لذتیت جس کا نام آتا ہے، لذتیت کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز میں مزہ آئے وہ کرنا چاہیے، آج کا یورپ اسی انداز سے سوچ رہا ہے، پورے یورپ کا دماغ گویا لذتی بن گیا ہے، جس میں مزہ آئے، جس میں فائدہ ہو، البتہ لذت کو ذرا وسیع کر دیا ہے انھوں نے کہ وہ صرف لذت بطن یا لذت لسان ہی نہیں، بلکہ لذت ذہن بھی ہو، اس میں لذت سیاسی بھی شامل ہو اور لذت سائنسی بھی شامل ہو، اور وہ جو ایک فاتحانہ خوشی ہوتی ہے، اور فاتحانہ مسرت ہوتی ہے، وہ بھی اس میں شامل ہو، تو لذت کا انھوں نے دائرہ اور وسیع کر دیا ہے، اس سے وہ اور خطرناک بن گئی ہے، یونان کا جو لذتی اسکول تھا وہ وہاں تک جا ہی نہیں سکا تھا، اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، لیکن یورپ کا لذتی اسکول بہت ہی آگے پہنچ گیا ہے۔

یہ اس وقت گہری سازش ہے، اس سے بڑھ کر کوئی سازش نہیں، چوں کہ ہمارا آنا جانا ہوتا ہے اور ہمارے روابط ہیں ثقافی اور صحافی اور تحریری، چنانچہ عرب ممالک میں بھی خلیج میں بھی یہ بات داخل ہوگئی ہے کہ متشددین کا مقابلہ کرنا چاہیے، متشددین کے معنی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ معاشرہ اسلام کے احکام کے مطابق ہونا چاہیے، اس میں خوف خدا، خوف آخرت ہو، اور سے محاسبہ ہونے کا خیال ہو، اور اس میں دوسروں کے اخلاق اور حقوق کا لحاظ ہو، اور جو لوگ حکام شریعت کو جاری کرنا چاہتے ہیں، حدود شرعیہ تو خیر بڑی چیز ہیں، تعزیرات بڑی چیز ہیں شلاً رجم ہے یا جلد ہے، یہ چیزیں تو بڑی ہیں اور ان کی نوبت نہیں آتی، لیکن جو روزمرہ کے حالات ہیں اور بہت قابل عمل حدود کے اندر جو احکام شرعیہ کا اجراء چاہتے ہیں، ان سے بھی حکومتیں ڈر رہی ہیں اور وہاں سے نکلنے والے اخبارات میں اور خطوط میں یہ بات نظر آتی ہے۔

عدم اصول پرستی کے خلاف جہاد

اب بالکل (Fundametalist) کے بارے میں امریکہ اور برطانیہ اس طرح سوچ رہا ہے اور پروپیگنڈہ کر رہا ہے، ایک صدائے بازگشت آرہی ہے ان ملکوں سے، آپ کو

ان سب خطرات کو سامنے رکھنا چاہیے، اب معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ سنیما مت جاؤ بہت بری بات ہے، اس کی برائی اپنی جگہ پر مسلم ہے، جو شناعت ہے وہ شناعت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اب صرف یہ نہیں کہ کھیل کود میں زیادہ مت پڑو، فضول خرچی مت کرو، اب یہ اصلاح معاشرہ کا کام بہت اہم ہے، میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کی پوری وکالت کرتا ہوں، یہ کام آپ کو کرنا ہے اپنی اپنی جگہوں پر، اصلاح معاشرہ کی دعوت دینا ہے، مکاتب و مدارس کو جاری کرنے کی آپ کو دعوت دینا ہے، مسجد مسجد مکتب قائم ہو اور کچھ گھروں پر بھی اس کا انتظام ہو جیسے پہلے ہوا کرتا تھا، کئی پڑھے لکھے آدمی بیٹھیں اور وہاں کے بچے آئیں اور اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں، قرآن مجید پڑھ سکیں، اور جو دین کی بنیادی باتیں ہیں مثلاً کلمہ اس کو صحیح یاد ہو اور وہ شرک و توحید کا فرق سمجھتے ہوں، کفر و ایمان کا فرق سمجھتے ہوں، اور سیرت نبویؐ سے ضروری حد تک واقف ہوں، یہ سب کام آپ کو کرنا ہے۔

لیکن اس سے بڑی ایک گہری سازش اس وقت ہے جس کے لیے بڑے پیمانے پر آپ کو عملی تیاری کرنی ہے، وہ ہے عدم اصول پرستی کے خلاف جہاد، اس وقت امریکہ نے خاص طور پر جو مہم چلائی ہے اور ایک بہت بڑی سازش اور ایک بہت بڑا منصوبہ ہے، اس میں یہودی دماغ کام کر رہا ہے، اور عیسائی وسائل اور عیسائی طاقتیں اس کے پیچھے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس وقت سارے عالم میں عقیدہ کو، ایمان کو، تعلق باللہ کو، ایک دین کی پابندی کو اور آخرت کے خیال کو متزلزل کریں، اور یہ کہہ کر کہ یہ سب بنیادی باتیں ہیں، پرانی باتیں ہیں، فرسودہ باتیں کہتے ہیں، تو اس کے لیے (Fundamentalism) وغیرہ کے نام رکھتے ہیں، اس کے لیے آپ کو تیاری کرنا ہے۔

''الاصلاح'' محض تقریر و تحریر کا شعبہ نہیں

میں ''الاصلاح'' کو محض تقریر و تحریر کا ایک شعبہ نہیں سمجھتا، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کے ایک مقصد کے پورا کرنے کا یہ ایک ذریعہ ہے، اور وہ ہے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا، اسلام پر اعتماد دوبارہ واپس لانا اور خاص طور پر ترقی یافتہ جو اسلامی ممالک ہیں،

ان میں اسلام پر اعتماد متزلزل ہو چکا ہے، الجزائر میں کیا ہو رہا ہے؟ الجزائر میں خالص دینداروں اور حکومت کے نمائندوں کے درمیان جنگ ہے، نہ اسرائیل کی ان کے خلاف جنگ ہے، نہ اسرائیل کا ان کے خلاف معرکہ ہے، اور نہ کسی یورپین طاقت کی ان کے خلاف جنگ ہے، اور نہ ملک میں بگاڑ وفساد پیدا کرنے والوں کے درمیان، خالص دیندار، دین پسند، میں دین پرست نہیں کہتا، دین پسند طبقے اور جو چاہتے ہیں کہ کلمة الله هي العليا اس پر عمل ہو، یہاں اللہ کا نام بلند ہو، یہاں اللہ کا نام سب سے اونچا ہو، اللہ کا حکم سب سے زیادہ قابل اطاعت سمجھا جاتا ہو، یہاں فرائض کی پابندی ہو، اور محارم سے، حرمات سے اجتناب ہو، یہاں مسجدیں آباد ہوں، اس کا ذکر کرنا بھی الجزائر میں ایک بڑا جرم ہے، برابر خبریں آتی رہتی ہیں کہ دین پسند لوگوں میں سے اتنے آدمی شہید ہوئے، لیبیا میں بھی ہو چکا ہے، اور اب بھی لیبیا کا حال وہی ہے، اور شام تو بالکل غیر مسلم عنصر کے قبضہ میں ہے، وہاں کے دروزی حقیقت میں وہ مسلمان نہیں ہیں، کسی طور پر ان پر مسلمانوں کی تعریف صادق نہیں آتی، اس طور پر یہ فتنہ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے، اور ہمیں اندیشہ ہے کہ پاکستان بھی اس کے لپیٹ میں نہ آ جائے، اور ضیاء الحق شہید مرحوم کی شہادت اور ملک فیصل کی شہادت میں بھی امریکہ کا ہاتھ تھا، اور وہ اس بنا پر تھا کہ کوئی ایسا عنصر یا ایسا فرد غالب نہ ہونے پائے، حاوی نہ ہونے پائے اس ملک پر، اس ملک کے مستقبل کی تعمیر میں وہ آزاد نہ ہو جو اصول پسند ہو اور عقیدہ کا پختہ ہو اور اسلام کی حقانیت پر پورا یقین رکھتا ہو، اور ضروری حد تک وہ فرائض کا بھی پابند ہو، یہ ایک سازش چلی آ رہی ہے فکری طور پر بھی اور سیاسی وانتظامی طور پر بھی، انقلابی طور پر بھی، ہمیں اسی طور پر اس کا مقابلہ کرنا اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا اور اسلام کی ابدیت پر اس کا یقین واپس لانا، دوبارہ یقین پیدا کرنا ہے، اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، قیادت کر سکتا ہے۔

اس زمانہ کا اصل فتنہ

جدید نصاب تعلیم اور یورپ سے جو طریقۂ تعلیم آیا ہے، وہاں سے امپورٹ کیا گیا ہے،

اس میں یہ خاصیت ہے کہ وہ اسلام پر اعتماد کو متزلزل کر دے کہ اسلام نے بیشک ایک زمانہ میں اچھا کام کیا تھا، اچھا پارٹ ادا کیا تھا، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ زمانہ تھا، خدا بھلا کرے ان لوگوں کا، مثلاً عورت کے کچھ حقوق مل گئے، دختر کشی بند ہوگئی، اور شراب اتنی نہیں پی جانے لگی، لیکن اب اسلام اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے۔

آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اسلام اس زمانہ کا ساتھ دینا تو الگ رہا یہ تو اس تنزل کے بعد اس زمانہ کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے، اسلام اس زمانہ کو راہ پہ لگا سکتا ہے، اسلام اس زمانہ کو مبارک بنا سکتا ہے اور اسلام اس زمانہ کو رہنے کا سلیقہ سکھا سکتا ہے، اس کے لیے آپ کو تیاری کرنی ہے، بہتر ہوگا کہ ہمارے بعض اساتذہ اس میں کتابوں کا انتخاب کریں۔

کتابوں کا مطالعہ

ایک زمانہ میں ہم نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی سے مشورہ کر کے ایک فہرست بنائی تھی کہ فلاں درجے سے لے کر فلاں درجہ کے طلبہ یہ کتابیں پڑھیں، اور فلاں درجے سے فلاں درجہ تک کے طلبہ یہ کتابیں پڑھیں، اور ہم نے یہ بھی انتظام کیا تھا کہ 'الاصلاح' میں ایک رکن کی ڈیوٹی مقرر کی تھی کہ آپ یہاں بیٹھا کریں، 'الاصلاح' کے کھلنے کا جو وقت ہے اس میں ایک گھنٹہ آپ وقت دیں کہ طلبہ کو معلوم ہو کہ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کون سی کتابیں پڑھنی ہیں، طلبہ ان کے پاس جائیں اور کہیں کہ ہم اس درجہ کے طالب علم ہیں، بتائیے ہم پہلے کیا پڑھیں؟ بتائیے ہم تاریخ کا مطالعہ کہاں سے شروع کریں؟ بتائیے ہم سیرت میں اس وقت کون سی کتابیں پڑھیں؟ اس منزل پر کون سی کتاب مناسب ہوگی؟ یہ دو انتظامات ہم لوگوں نے کیے تھے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔

میں نے اتنی طوالت اور اتنی تفصیل کے ساتھ بات کر دی، حالانکہ میں اس حال میں نہیں تھا، اور میں آپ سے معذرت کرنے والا تھا، کہ مجھے بعض ضرورتیں ہیں، ہمارے معزز مہمان بھی آئے ہوئے ہیں، ذہن دوسری لائن پر کام کر رہا ہے، لیکن یہ آپ کی محبت ہے، آپ کا خلوص ہے، یا اللہ تعالیٰ جو آپ سے کام لینا چاہتا ہے، اس کی اہمیت اور قدر و قیمت

ہے کہ میں نے اتنی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔

بس آخر میں یہ کہنا ہے کہ انجمن الاصلاح کو محض آپ تحریر وتقریر کی مشق، مضمون نگاری سیکھنے کی جگہ نہ سمجھیں، بلکہ یہاں سے آپ کو وہ ذخیرہ لینا ہے، وہ مواد لینا ہے کہ جس سے آپ یہاں سے نکلنے کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو انٹلکچول کلاس (Intellectual Class) کہلاتا ہے، ذہین طبقہ جو ہے، آپ اس کو مطمئن کرسکیں، اس میں اسلام کی ضرورت کا احساس پیدا کرسکیں اور اسلام کے بارے میں اعتماد واپس لاسکیں۔

یہاں سے لے کر انڈونیشیا اور مغرب اقصیٰ اور مراکش تک ان سب جگہوں پر اس وقت جو ڈر ہے وہ یہ کہ امریکہ اور یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش سے ان سب جگہوں تک جراثیم پہنچ گئے ہیں کہ اسلام پر اعتماد متزلزل ہوجائے اور اسلام پر عمل کرنے کو وہ فرسودگی اور رجعت پسندی اور (Fundamentalism) سے تعبیر کرنے لگیں اور ایک پڑھے لکھے آدمی کو شرم آنے لگے کہ ہم حاشا وکلا (Fundamentalist) نہیں ہیں، آپ کو وہ کام کرنا ہے کہ لوگوں سے سینہ تان کر اور آنکھیں ملا کر یہ کہیں کہ ہاں ہم (Fundamentalist) ہیں، اور ہمارے نزدیک (Fundamentalist) ہی دنیا کو بچا سکتا ہے، اور ساری خرابی اور سارا فساد (Fundamentalism) نہ ہونے کی وجہ سے ہے، کوئی اصول نہیں، کوئی معیار نہیں، کوئی حدود نہیں، صرف نفس پرستی ہے، صرف خواہش پرستی ہے، صرف اقتدار پرستی ہے، صرف سیاست پرستی ہے، اس لیے آپ کو بھی تیاری کرنی ہے۔[1]

---

(۱) انجمن الاصلاح خورد، رواق سلیمانی، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے افتتاحی جلسہ میں ۲۱/ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ کو کی گئی تقریر، یہ تقریر عبداللہ وسیم ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ۔ (شمارہ ۲۵/مئی ۱۹۹۳ء)۔

حفاظتِ دین کے مراکز

میرے عزیزو! کوئی عملی بات، مخلصانہ مشورہ، ہدایت اور نصیحت انفرادی طور پر کی جاتی ہے تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے اور اثر بھی زیادہ ہوتا ہے، لیکن اگر یہی باتیں جلسۂ عام میں کی جاتی ہیں تو جتنا مجمع زیادہ ہوتا ہے، اسی اعتبار سے حصہ رسدی کم ہو جاتا ہے، اندیشہ ہے کہ آپ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ ایک عام تقریر ہے جو جلسۂ عام میں کی جاسکتی تھی، کسی پبلک ہال میں کی جاسکتی تھی، تو ہم آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ آپ یہ نہ سمجھیں، بلکہ یہ سمجھیں کہ جیسے آپ پانچ، سات، دس آدمی ہمارے پاس آئے اور کہا کہ آپ ہمیں مشورہ دیجیے کہ ہم دار العلوم کے نظام تعلیم، اس کے نصاب درس، یہاں کے اساتذہ اور علمی ماحول سے کیسے فائدہ اُٹھائیں؟ ہم اپنی زندگی کو کس رخ پر ڈالیں اور کن مقاصد کو ہمیں اپنانا چاہیے؟ دار العلوم کے مطالبات اور تقاضے کیا ہیں؟ ہم اپنی استعداد کیسے پختہ کریں تاکہ دور جدید کے فتنوں کا مقابلہ کر سکیں؟ آپ نے ہم سے عزیزانہ، سعیدانہ، اور فرزندانہ طریقہ پر سوال کیا، جیسے آپ رائے بریلی یا مہمان خانہ میں ہم سے سوالات کرتے ہیں، ہم بھی آپ سے اسی طرح باتیں کریں گے، آپ بھی ان باتوں کو سنیے گا، اسی کان سے سنیے گا، اور اسی دل سے قبول کیجیے گا۔

دار العلوم کی بنیاد اور اس کی علمی و فکری ترقی کا معیار کیا ہے؟

عزیزو! پہلی بات آپ کو یہ معلوم ہونی چاہیے کہ آپ جس دار العلوم میں پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جس ادارے میں آپ کو پڑھنے کا موقع دیا، اور شرف بخشا ہے، اس کی بنیاد

کیا ہے؟ اس کی علمی وفکری ترقی کا معیار کیا ہے؟

تاریخ کے ایک مصنف اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیمی، فکری ہی نہیں، بلکہ خاندانی تعلق کی بنیاد پر کہتا ہوں، اور اس بنا پر کہتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کے بانیوں کے حالات سے الگ الگ واقف ہوں، ایک ایک کے مسلک، ایک ایک کے مقاصد اور ایک ایک کی فکر سے واقف ہوں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دار العلوم ندوۃ العلماء (اور دوسرے صحیح الفکر و الاعتقاد مدارس) ہندوستان کی دو عہد ساز شخصیتوں کے مدرسۂ فکر پر قائم ہوا ہے، ایک حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ)، دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ)، یہ دو اس کے اصل بانی، اس کے روح رواں، اس کے رہبر اور معیار ہیں، اس کی علمی ترقی کا بھی معیار ہیں، اور اس کے فکری ارتقاء کا بھی معیار ہیں، اور اس فکر کی اشاعت اور جدّ و جہد کا بھی معیار ہیں۔

اس دار العلوم کے اصل بانی دو شخصیتیں ہیں: ایک مجدد الفِ ثانیؒ اور دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

یہی دو اس کے روح رواں، اس کے رہبر اور معیار ہیں، اس کی علمی اور فکری ارتقاء کا معیار بھی یہی دونوں ہیں۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں

حضرت مجدد الفِ ثانیؒ وہ ہیں جنھوں نے پورے برصغیر میں انقلاب برپا کر دیا، جن کے مکاتیب آپ کو پڑھنا چاہیے، ہم آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ یہیں یا یہاں سے نکلنے کے بعد ان کے مکتوبات پڑھیں، اب ہندستان میں بہت کم لوگ رہ گئے ہیں جو ان کے مکتوبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خدا آپ کو اس کی توفیق دے کہ آپ ان کے مکتوبات پڑھیں، یا کم از کم یہاں کے زمانۂ قیام میں 'تاریخ دعوت وعزیمت' کا چوتھا حصہ پڑھیں، جو انھیں کے حالات کے ساتھ مخصوص ہے، اقبال نے بہت صحیح ان کا تعارف کرایا ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار

یہ وہ مجدد صاحب ہیں جو بدعت حسنہ کے بھی قابل نہیں، میں آپ کو ان کے ایک مکتوب کا اقتباس سناتا ہوں، جس میں دین کی حمیت اور شریعت کے بارے میں ان کی غیرت وحساسیت صاف نظر آتی ہے۔

ایک معاصر نے اپنے خط میں شیخ عبدالکریم یمنی کی (جو غالباً شیخ محی الدین ابن عربی اور بعض مشائخ تصوف سے متاثر تھے) ایک ایسی تحقیق لکھی جو اہل سنت والجماعت اور اجماع امت کے خلاف تھی، حضرت مجدد صاحب نے اس کے جواب میں جو طاقتور مکتوب لکھا، اس کی نظیر نہیں ملتی، فرماتے ہیں:-

''مخدوما! ایں فقیر تاب استماع ایں چنیں کلمات ندارد، بے اختیار رگ فاروقیم درحرکت می آید، شیخ عبدالکبیر یمنی باشد یا محی الدین بن عربی، مارا محمد عربی درکار ست نہ ابن عربی، فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ اند، مارا بہ نص کار است نہ بہ فص''۔ (۱)

شیخ محی الدین ابن عربی جن کے ذریعہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ تمام دنیا میں پھیلا، اور بڑے بڑے عارفین باللہ اور بڑے بڑے مشائخ اس کے قائل ہی نہیں، اس کے داعی بلکہ اس پر مصر تھے، ان کی دو کتابیں ہیں: ایک فتوحات مکیہ ہے، جس میں انہوں نے وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی صاف صاف تبلیغ کی ہے، اور اس کو پیش کیا ہے، دوسرے فصوص الحکم۔

مجدد صاحب فرماتے ہیں:-

''مخدوما! اس طرح کی باتوں کے سننے کی میرے اندر تاب بھی نہیں، بے اختیار میری رگ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور تاویل وتوجیہ کا موقع نہیں دیتی، ایسی باتوں کے قائل

---

(۱) مکتوب ۲/۱۰۰ بنام ملاحسن کشمیری

شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی، ہمیں کلام محمد عربی (علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والسلام) درکار ہے، نہ کہ کلام محی الدین بن عربی، صدر الدین قونوی، اور شیخ عبدالرزاق کاشی، ہم کو نص سے کام ہے، نہ کہ فص سے، فتوحات مدینہ نے فتوحات مکیہ سے مستغنی بنادیا۔"

یہ سب مجدد صاحبؒ کا فیض ہے

جس وقت ہندوستان کے تخت پر ۹۶۴ھ میں جلال الدین اکبر بیٹھا ہے، اسلام کی آمد پر ایک ہزار سال ہورہے تھے، ایرانیوں کی ایک جماعت نے ایک گہری سازش کی کہ پوری دنیا کو یہ باور کرائیں کہ اسلام اور دین محمدی کا دور ختم ہوگیا، اس جماعت نے یہ اصول اکبر کے ذہن نشین کرادیا، کہ ہر مذہب کی عمر ایک ہزار (۱۰۰۰) سال ہوتی ہے، یہودیت ہزار سال رہی پھر ختم ہوگئی، عیسائیت ختم ہوئی، پھر اسلام آیا، اب اس کو ایک ہزار سال ہورہے ہیں۔

اس جماعت نے اپنی ذہانت سے سمجھا کہ اس بات کو قبول کرنے اور اس کو پوری طاقت سے نافذ کرنے والا وہ ہوسکتا ہے جو زیادہ پڑھا لکھا اور متشرّع نہ ہو، اس جماعت نے اکبر کا انتخاب کیا جس کی سمجھ میں ان کی یہ بات آگئی اور وہ الحاد کے راستہ پر پڑ گیا، وہ برہمنوں، پنڈتوں اور علماء کو جمع کرا کے بحث کرواتا تھا، پھر لادینیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایسے نازک وقت میں مجدد صاحبؒ اور ان کا خاندان سامنے آتا ہے، اس خاندان نے اس ملک کو اس خطرہ سے محفوظ کردیا کہ یہاں لادینیت کا دور دورہ ہوجائے، اسلام کا رشتہ اس ملک سے کٹ جائے اور دینی حس ختم ہوجائے۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں، اور خانۂ خدا میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ اس ملک میں دین جتنا اور جہاں بھی صحیح شکل میں پایا جاتا ہے، اس میں بڑا حصہ حضرت مجددؒ صاحب اور ان کے خاندان کا ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ نے تقریر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا کہ لوگ اس تاریخی حقیقت پر غور نہیں کرتے، سرسری انداز میں گزر جاتے ہیں کہ عام طور

پر جب بادشاہ جاہل ہو، مخالف دین ہو، اس میں کوئی خرابی ہو، تو اس کے بعد اس کا جو جانشین آتا ہے وہ اس سے بدتر ہوتا ہے، وہ اس میں اپنی سعادت سمجھتا ہے کہ اپنے والد اور سابق بادشاہ کے طریقہ پر قائم رہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ اکبر کے بعد جب جہانگیر ہوا تو وہ اس سے بہتر ہوا، دین پر قائم رہا، اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ کا معتقد بھی ہو گیا تھا، پھر جہانگیر کے بعد شاہ جہاں ہوا تو اس سے بہتر تھا، وہ جب تخت طاؤس پر بیٹھا جو بڑے فخر کی بات تھی تو وہ اتر گیا، نماز پڑھی اور سجدہ کیا اور کہا کہ فرعون بڑا کم عقل اور کم ظرف تھا کہ مصر کے تخت پر بیٹھا اور خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا، میں تخت طاؤس پر بیٹھ کر سجدہ کرتا ہوں، شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر ہوا (جن کو ہمارے فاضل دوست و ادیب شیخ علی الطنطاوی چھٹے خلیفۂ راشد سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے نزدیک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد پورے عالم اسلام میں عالم گیر جیسا متبع سنت، صاحب حمیت اور اسلامی قانون اور اسلامی شریعت کا جاری کرنے والا پیدا نہیں ہوا) اس میں جو راز ہے وہ یہ کہ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور ان کا خاندان اندر اندر کام کر رہا تھا، اور متاثر کر رہا تھا، حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ جو حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے ممتاز ترین فرزند تھے، اور جن سے ان کا سلسلہ پھیلا ہے، وہ عالم گیر کو شہزادگی کے دور میں جب خط لکھتے تو انہیں ''شہزادۂ دین پناہ'' سے خطاب کرتے۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور صحیح الفکر و حاملِ دعوت مدارس و مراکز باقی رہیں گے، اور اگر خدا کو ان کی حفاظت مطلوب اور محبوب ہے تو حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے راستہ پر رہیں گے، اگر یہ دارالعلوم دونوں کے راستہ سے ہٹا تو یہ دارالعلوم وہ دارالعلوم نہیں ہوگا، جس کی بنیاد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوریؒ، مولانا سید عبدالحی رائے بریلویؒ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوریؒ، منشی اطہر علی کاکورویؒ اور مولانا شبلی نعمانیؒ نے ڈالی تھی، یہ بات آپ یاد رکھیے کہ یہ دارالعلوم حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے راستہ پر ہے۔

امتیازی خصوصیات

عزیزو! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان دونوں کے طریقۂ عمل، ان کی دعوت، ان کی تحریک اور ان کی جدوجہد کی چند امتیازی خصوصیات ہیں:-

(۱) عقیدۂ اسلام:- سب سے پہلے اس اسلامی عقیدہ کو پورے طور پر قبول کر لینا جو صحابۂ کرام کا عقیدہ تھا، جو تابعین عظام، ائمہ اربعہ اور مجددین اور مصلحین کا عقیدہ تھا۔

(۲) دوسری بات ہے: اشاعت دین، یعنی اس دین کی اشاعت وتبلیغ کی جائے۔

(۳) اور تیسری بات جو ان دونوں حضرات کا خاصہ ہے، وہ: ''حمایتِ دین'' بلکہ ''حمیتِ دین'' ہے، بہت سے ایسے حضرات ہیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں، احترام کے ساتھ ہم ان کا نام لیتے ہیں، ان کے یہاں اشاعت دین کا جذبہ تھا، لیکن وہ چیز جس کو دینی غیرت اور حمیت کہتے ہیں، وہ ان کے یہاں یا کم از کم ان کے حالات میں زیادہ نمایاں نہیں معلوم ہوتی، ان دونوں حضرات کی خصوصیت یہ ہے کہ اشاعت دین کے ساتھ حمیت بھی تھی، یہ بہت اہم چیز ہے، کہ دین مخالف اور اس کے منافی کوئی چیز برداشت نہ ہو، اس کی نیند اڑ جائے، کھانا پینا بھول جائے اور اس کو ایک سخت کرب اور شدید درد لاحق ہو جائے، یہ بات اور حضرات میں تھی، لیکن ان دو حضرات میں سب سے نمایاں تھی۔

شاہ ولی اللہؒ کی خصوصیت اور ان کے کارنامے

حضرت شاہ صاحبؒ نے ہماری معلومات کے مطابق سب سے پہلے ہندوستان میں حدیث شریف کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا، وہ حجاز گئے اور وہاں عرب اساتذہ سے انہوں نے حدیث پڑھی اور اس کی سند حاصل کی، پھر یہاں آکر انہوں نے حدیث کا درس شروع کیا، ہماری محدود معلومات کی حد تک صحاح ستہ کی تدریس کا رواج اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں تھا، یہ کام حضرت شاہ صاحب نے شروع کیا، آپ کسی عالم سے حدیث پڑھیے اور سند لیجیے تو یہ سلسلہ شاہ ولی اللہؒ تک پہنچتا ہے، پھر اور یمنی اور حجازی سلسلہ ہے، خاص طور پر صحیحین

کا دراس، پھران کی شرح وتحشیہ کا کام اوران کی خدمت۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا، یہ بات شاید بہت سے لوگوں کے لیے انکشاف ہوگی کہ یہاں کے بہت سے علماء قرآن مجید کا دوسری زبانوں میں ترجمے کو خطرناک سمجھتے تھے، اس کی دو وجہ تھی، ایک تو یہ کہ جو اہلِ ہوئی و ہوس تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اس سے ہماری فرماں روائی چلی جائے گی، ہماری سرداری اور ہمارے مطاع ہونے کی جو حیثیت ہے، اور ہماری بات کو اللہ و رسول کی بات کی طرح لوگ سمجھتے ہیں، ہماری یہ حیثیت ختم ہو جائے گی، ہماری خیریت اسی میں ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ یہاں کی زبانوں میں نہ ہو، ایسے دنیا پرست علماء قرآن مجید کے ترجمہ کو بدعت بتاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

شاہ صاحب نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے دونوں صاحبزادوں نے اردو میں ترجمے کیے، ایک شاہ رفیع الدین کا ترجمہ جو لفظی ہے، اور ایک شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ جو بے نظیر ہے، اس میں خاص اللہ تعالیٰ کی مدد معلوم ہوتی ہے، اگر وقت ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو مثالیں دے کر بتاتا۔

یہاں صرف دو مثالیں دیتا ہوں، قرآن مجید میں ہے: ﴿قَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ﴾ [(۱)] زمخشری جیسے ادیب مفسر کو بھی "عزۃ" کا مفہوم ادا کرنے میں دشواری پیش آئی ہے، عام طور پر اس کا ترجمہ "فرعون کی عزت" "فرعون کا غلبہ" کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے، شاہ صاحب جو دہلی کے رہنے والے تھے، وہ درباری زبان سے واقف تھے، اور محاوروں کو بھی جانتے تھے، وہ خود فرماتے تھے کہ جب کسی آیت کا ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا تو بازار چلا جاتا تھا، لوگوں کی باتیں سنتا کہ وہ کس طرح اس مفہوم کو ادا کرتے ہیں، شاہ صاحب نے "بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: "فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب ہوں گے"، درباریوں اور خوشامدیوں کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے۔

---

(۱) سورۃ الشعراء: ٤٤

شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ میں صوتی آہنگ کا بھی خیال رکھا ہے، ﴿فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْراً﴾ (۱) کا ترجمہ کیا ہے: ’’تب اکھاڑ مارا ان کو اٹھا کر‘‘۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا تیسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توحید خالص پر بہت زیادہ زور دیا، ان کے پوتے حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے کتاب ’’تقویۃ الایمان‘‘ لکھی، جس سے زیادہ صاف، واضح اور طاقتور کتاب توحید کے موضوع پر ہمارے علم میں نہیں، اس کتاب کے بارے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ اس سے ہزاروں نہیں لاکھوں لوگوں کو ہدایت ملی ہے، حضرات علمائے دیوبند و مظاہر علوم اور علمائے ندوہ سب اس کے قائل تھے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے (اللہ ان کے درجات بلند فرمائے) ہمیں اس کتاب کے عربی میں ترجمہ کا حکم دیا، ہم مدینہ منوّرہ میں تھے، جانا بھی تھا، گاڑی مسجد نبویؐ کے دروازہ مجیدی پر کھڑی تھی، سامان رکھا جا چکا تھا کہ نماز پڑھیں اور روانہ ہو جائیں، حضرت شیخ الحدیث نے پیغام بھیجا کہ ترجمہ کا کام شروع کر کے جائیں، ہم نے روضۃ من ریاض الجنۃ میں عزیزی محمد واضح سلمہ کو سامنے بٹھا کر ترجمہ کا کام شروع کر دیا، ہمیں صاف معلوم ہوا کہ یہ کتاب عند اللہ وعند الرسول مقبول ہے، جو کچھ لکھا تھا وہ حضرت شیخ کو سنایا گیا، حضرت نے سن کر بڑی دعائیں دیں، جب اس کتاب کا ترجمہ ’’رسالۃ التوحید‘‘ کے نام سے مکمل ہو کر شائع ہو گیا، تو ہم نے ایک بڑے سعودی عالم جو جامعہ اسلامیہ کے استاذ بھی تھے، ان کو یہ کتاب پڑھنے کو دی، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کی کتاب ’’کتاب التوحید‘‘ سب سے بڑھی ہوئی ہے، اور ان کے متبعین تو اس کے سوا کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن انہوں نے سعودی اور ’’وہابی‘‘ ہونے کے باوجود صاف صاف کہا کہ ’’یہ تو توحید کی منجنیق ہے، یہ تو پتھراؤ کرتی ہے‘‘۔

تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے توحید خالص، قرآن کی اشاعت اور

---

(۱) سورۃ الإسراء: ۱۶

حدیث شریف کی خدمت انجام دی، آج اس ملک میں جہاں بھی حدیث شریف پڑھائی جاتی ہے، وہ سب شاہ ولی اللہ صاحبؒ اوران کے خاندان کا فیض ہے۔

شاہ صاحب نے اس پر اکتفا نہیں کرلیا، بلکہ انھوں نے اپنی خداداد فراست سے محسوس کیا کہ اب جو دور آنے والا ہے وہ عقلی دور ہوگا، عقلی طور پر متاثر کرنے والا دور ہوگا، اس کے لیے انھوں نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' جیسی بے نظیر کتاب لکھی، جو جدید علم کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ جہاد کی تحریک شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ سے شروع ہوئی، مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے (جن سے دہلی کے مسلمانوں کی جان اور عزت محفوظ نہیں تھی) شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے بلایا، جس نے مرہٹوں کو ایسی شکست فاش دی کہ تاریخ میں لکھا ہے کہ مرہٹواڑہ میں کوئی گھر نہیں بچا جہاں ماتم نہ ہوا ہو، سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔

ٹیپو سلطان شہیدؒ کا بھی روحانی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ سے تھا، انگریزوں کے حقیقی خطرہ کا ادراک سلطان ٹیپو نے کیا، اس کے خاندان کا تعلق روحانی حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا شاہ ابوسعیدؒ، حقیقی چچا سید نعمانؒ، خاص طور سے شاہ ابواللیثؒ سے تھا، جو سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔

عزیزو! ایک جسمانی نسب نامہ ہوتا ہے، ایک علمی و دینی نسب نامہ ہوتا ہے، اور ایک اعتقادی نسب نامہ ہوتا ہے، آپ اس علمی وفکری نسب نامہ کو ہمیشہ یاد رکھیے، اس نسب نامہ کو آپ نہ یہاں بھولیے اور نہ اپنے گھر جا کر بھولیے کہ ہم سب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اوران کے خاندان کے فیض یافتہ اوران کے تربیت یافتہ ہیں۔

نئے دور کے فتنوں کے مقابلہ میں ندوۃ العلماء کا کارنامہ

عزیزو! ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے بعد ہی سے وقت کے فتنوں کو نہ صرف پہچانا،

بلکہ ان کا مقابلہ بھی کیا، ان فتنوں میں قادیانیت اور عیسائیت کے فتنے تھے، جن کا مقابلہ بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے کیا، ہم نے خود یہ واقعہ مونگیر میں سنا کہ جب قادیانیوں کا بہار میں خطرہ محسوس ہوا، تو مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے مولانا مرتضٰی حسن چاند پوریؒ کو قادیانیوں سے مناظرہ کے لیے مدعو کیا، ادھر مولانا مرتضٰی حسن چاند پوری قادیانیوں سے مناظرہ کررہے تھے، ادھر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سجدہ میں دعا وگریہ زاری میں مصروف تھے، یہاں تک کہ کسی نے آکر سنایا کہ قادیانیوں کو شکست ہوئی اور جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، تب جاکر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے سجدہ سے سر اٹھایا۔

دوسرا فتنہ ''روشن خیالوں'' کا تھا جنھوں نے ایک بڑا ادارہ قائم کیا، اس جماعت کے لکھنے والوں نے دین کے حقائق کو بدل کر پیش کیا، اس کی وجہ سے اسلامی عقیدہ میں ایک تزلزل اور خطرہ پیدا ہوا، ان روشن خیالوں کا سب سے بڑا نشانہ غیبی حقائق اور معجزات تھے، وہ معجزات کی ایسی تاویل کرتے کہ وہ معجزہ ہی نہ معلوم ہوتا، اپنی تفسیروں میں انھوں نے خاص طور سے اس پر زور دیا۔

ندوۃ العلماء نے اس طبقہ کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنے نصاب میں انگریزی کا اضافہ کیا، اس کے ساتھ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نئے اسالیب بیان اور نئے طرز فکر سے طلبہ واقف ہوں، اور کون سا فتنہ کہاں اٹھ رہا ہے؟ اور کیوں یہ فتنے اٹھ رہے ہیں؟ اور کس زبان اور اسلوب میں اٹھ رہے ہیں؟ ان سے واقف ہوں۔

ان روشن خیالوں کے مقابلے کے لیے علامہ شبلیؒ کا قلم چلا، پھر مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ کا قلم چلا، پھر تو ندوی فضلاء نے ان فتنوں کا بھی تعاقب کیا جو عالم عربی میں قومیت عربیہ اور ''تجدّد وتنوّر'' کے نام سے اٹھے تھے۔

ندوۃ العلماء کے بانیوں اور منتظمین نے ہمیشہ نصاب کو ''وسیلہ'' سمجھا، ''غایت'' نہیں، غایت ومقصد میں ترمیم نہیں ہوتی، لیکن وسیلہ میں ترمیم ہوتی ہے، درس نظامی میں بھی برابر ترمیم ہوتی رہی، ہمارے والد صاحب مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کا فاضلانہ مقالہ ''ہندوستان کا

نصاب درس اور عہد بعہد اس کے تغیرات'' کا آپ مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کس دور میں کون سی کتاب پڑھائی جاتی تھی، اور کب اس میں تبدیلیاں ہوئیں، اس طرح ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب میں تاریخ اور جغرافیہ کا بھی اضافہ کیا۔

عربی زبان کی تدریس ایک زندہ زبان کی حیثیت سے

عزیزو! ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے روشن ضمیر کارکنوں نے اس وقت یہ محسوس کرلیا کہ اب تک دینی مدارس میں عربی زبان اس حد تک پڑھائی جارہی ہے کہ تفسیر وحدیث اور فقہ کی کتابیں سمجھ سکیں (اللہ تعالیٰ ان مدارس کے بانیوں کی محنتوں اور کوششوں کو قبول فرمائے) لیکن اب جو دور آنے والا ہے، اس میں اس سے کام چلنے والا نہیں ہے، اب تو عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے کہ وہ دعوت اور تصنیف وتقریر کی بھی زبان ہے، پڑھایا جانا ضروری ہے، اس زمانے میں ہندوستان کا عالم عربی سے زیادہ تعلق بھی نہیں تھا، صرف حجاج کی حجاز آمدورفت رہا کرتی تھی، حیرت ہوتی ہے کہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے حجاز کے دوران قیام میں ہمارے والد صاحب کو خط لکھا تھا کہ یہاں ایک عالم جن کو عربی پر بڑی قدرت ہے، عربی میں اچھی تقریر کرتے ہیں، میں ان کو راضی کر رہا ہوں، کہ وہ دارالعلوم جائیں، اور وہاں عربی زبان کا درس دیں، آپ اس کا خیال رکھیے کہ طلبہ کو عربی زبان میں مہارت پیدا ہو، اور اس میں وہ تقریر کرسکیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ کی نگرانی و ہدایت پر ندوۃ العلماء نے عربی کے ابتدائی نصاب کی ترتیب کا کام شروع کیا، جو اس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک تھا، اور وہ عالم عربی میں بھی مقبول اور کہیں کہیں رائج ہوا۔

اپنی استعداد کیسے مضبوط بنائیں؟

عزیزو! دنیا کی تمام زبانوں میں عربی زبان سب سے زیادہ حساس، ذکی الحس اور غیرت مند زبان ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ قرآن کی زبان ہے، پیغام الٰہی کی زبان ہے،

تعلیمات نبویؐ کی زبان ہے، اس کے علاوہ دو چیزیں اور ہیں، ایک اعراب جو کسی اور زبان میں نہیں، دوسرے مختلف المخارج اور مختلف الاصوات حروف جو دوسری زبان میں نہیں، ذراسی غلطی سے، زیر کو زبر اور منصوب کو مجرور پڑھنے اور 'ث' کو 'س' کی طرح بولنے سے سب پر پانی پھر جائے گا، آپ ایسی استعداد بنائیے کہ صحیح اعراب پڑھ سکیں، اور صحیح مخارج سے حروف کو ادا کرسکیں۔

ایک بار ہمیں جامعہ دمشق میں جس کا وائس چانسلر ایک عیسائی فاضل تھا اور جس کے جلسے میں فضلائے دمشق اور ممبران پارلیمینٹ شریک ہونے والے تھے، فلسطین کے قضیہ پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ہم نے ''العوامل الأساسية لكارثة فلسطين'' (المیۂ فلسطین کے بنیادی اسباب) کے موضوع پر مقالہ لکھا، اس کو جلسہ میں پڑھنے سے پہلے احتیاط کے طور پر علامہ بهجة البيطار کی خدمت میں گئے، اور عرض کیا کہ آپ ہمارے استاد مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دوست ہیں، براہ کرم آپ ہمارا یہ مقالہ سن لیجیے کہ شاید کوئی غلطی ہو، انہوں نے فرمایا کہ نہیں، تم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، تم تو ماذاخسر العالم کے مصنف ہو، پھر بھی ہم نے ان کو اپنا مقالہ پورا سنا دیا، انہوں نے کہیں نہیں ٹوکا، ہم سے کہا کہ آپ 'الف لام' کا استعمال کرنے میں بہت محتاط ہیں، ہندوستانی علماء جا و بے جا 'الف لام' استعمال کرتے ہیں، پھر انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک ہندستانی عالم ایک عرب عالم کے پاس آئے اور کہا کہ أَنَا ذَاهِبٌ مِنَ الْمَكَّةِ إِلَى مَدِيْنَة، فَهَلْ لَكَ حَاجَةٌ؟ اس جملہ کو سن کر عرب عالم نے کہا کہ حَاجَتِي الوَحِيْدَةُ أَنْ تَأْخُذَ الْأَلِفَ وَاللَّامَ مِنْ مَكَّةَ وَتَضَعَهُمَا عَلَى الْمَدِيْنَةِ، 'الف لام' ان عالم صاحب نے مکہ پر لگادیا، جبکہ اس پر الف نہیں آتا۔

ہم سے بعض عربوں نے شکایت کی کہ ہندوستان کے عالم وداعی آتے ہیں، مساجد میں ان کی تقریر کا اعلان ہوتا ہے، ہم بیٹھ جاتے ہیں، لیکن چند ہی جملوں کے بعد بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو عرب ممالک نہیں جانا ہے، آپ کو جانا ہے، لیکن ملازمت

کے لیے نہیں، امام وخطیب بن کر نہیں، صرف پیسہ کمانے کے لیے نہیں، بلکہ داعی بن کر یا معلم بن کر جانا ہے، آپ ابھی سے درسی استعداد پختہ کریں تا کہ کوئی اعرابی غلطی نہ ہونے پائے، جو بھی درسی کتاب پڑھیں، پوری توجہ اور انہماک سے اس کی تیاری کریں، اپنے فاضل اساتذہ سے معلوم کریں کہ ان کی مستند شرحیں اور مصادر و مراجع کون سے ہیں، پھر ان کا گہرا مطالعہ کریں، اور بھرپور علمی تیاری کریں۔

آخری بات

آخری بات یہ ہے کہ آپ علوم دینیہ میں رسوخ پیدا کیجیے، یہاں جو علمی و دینی ماحول ہے، آپ کے جو مشفق اساتذہ ہیں، ان سے فائدہ اٹھائیے، یہ فضا اور ماحول اور اساتذہ آپ کو کالجوں، یونیورسٹیوں میں نہیں ملیں گے، ہم نے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے بارے میں کہا تھا کہ ان کی ایک بڑی خصوصیت رسوخ فی العلم تھی، بہت سے علماء ایسے ہیں جو دوسرے کاموں میں لگ جاتے ہیں تو ان کے علم میں رسوخ نہیں رہتا۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہاں سے صحیح الفکر بنا کر، کامل مدرس اور پختہ کار مصنف اور مبصر بنا کر، اور داعی بنا کر نکالے، اور جو فتنے اٹھ رہے ہیں جیسے قادیانیت، الحادودہریت، اور روشن خیالی کے فتنے، کہ دین پر کھلی تنقید کرتے ہیں، اور کفر و ایمان اور حلال اور حرام کی تمیز نہیں کرتے، ان سب فتنوں کا آپ کو مقابلہ کرنا ہے، آخری بات یہ ہے کہ آپ سب کو مجدد الف ثانیؒ، اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک، ان کے مکتب خیال اور مدرسۂ فکر پر چلنا ہے، اور اسی میں اپنی سعادت سمجھنا چاہیے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔ (۱)

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی مسجد میں طلبہ و اساتذہ کے سامنے ۲۳ رصفر ۱۴۱۸ھ مطابق ۳۰ رجون ۱۹۹۷ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی نے قلمبند کی، اور ''تعمیر حیات'' (شمارہ ۱۰ راگست ۱۹۹۷ء) میں شائع ہوئی، پھر حضرت مولاناؒ کی نظر ثانی اور خفیف ترمیم واضافہ کے بعد علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

چراغ سے چراغ جلتے ہیں

عزیز طلبہ! مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر کوئی قیمتی سے قیمتی بات اور مخلصانہ سے مخلصانہ مشورہ ہوسکتا ہے تو اس کے مستحق آپ ہیں، آپ کا یہاں آنا خواہ آپ کی رضا اور آپ کے شعور سے نہ ہو، لیکن یہاں آپ کا طویل قیام، ہماری طرف انتساب اور ہمارے دارالعلوم کی طرف انتساب یہ تمام اموراس بات کے لیے کافی ہیں کہ ہم اپنے سینے میں اس عمر میں جو بہتر سے بہتر چیز رکھتے ہوں وہ پیش کریں، ہمارے اوپر شرعاً واخلاقاً یہ ذمہ داری ہے اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ آپ کے سامنے بہتر سے بہتر مشورہ پیش کریں، کئی سال سے اس کے مواقع آتے رہے اور آپ سے کچھ کہنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ میں دو تین باتوں پر خاص زور دیتا رہا ہوں۔ میں آج آپ سے صرف ایک بات کہوں گا، بقیہ چیزوں کو قصداً بیان نہیں کرتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سب باتیں بیکار ہیں، نہیں، وہ سب انتہائی مفید اور کارآمد ہیں لیکن یہ وقت اس کے لیے کافی نہیں۔

قانون الٰہی

اللہ تعالیٰ کے بہت سے قوانین ہیں جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلے آرہے ہیں، اور ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہزاروں برس سے اٹھاتے رہے ہیں، زمین سے فائدہ اٹھانے کا اور زراعت کا ایک قانون ہے، اس سے انسان خواہ وہ دینی معاملے میں نبی کے درجے کا ہو یا دنیاوی امور میں بڑے سے بڑا صاحب تدبیر اور بڑے سے بڑا صاحب شمشیر بادشاہ ہو، کوئی اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا، وہ قانون ہے کہ پہلے زمین کو جوتیے، پھر اس میں

بیج ڈالیے، محنت کیجیے، آسمان سے بارش ہو، پھر کھیتی آگے بڑھے، تب جا کر کاٹنے کی نوبت آئے گی۔

درختوں کے نشو ونما اور پھلنے پھولنے کا ایک قانون ہے، مثلاً کھجور ہی کو لیجیے، جب تک کہ ایک کو کاٹ کر دوسرے میں نہ لگائیے جس کو عربی میں تلقیح یا تأبیر النخل کہتے ہیں، پیداوار ٹھیک طور پر نہیں ہوگی، چنانچہ دنیا کی اعلیٰ ترین ہستی جس کا اللہ کے نزدیک سب سے اونچا درجہ ہے، جس کے لیے کائنات کا دھارا بدل دیا گیا، اس نے بھی دیکھا تو کہاں ایسا کیوں کرتے ہو؟ لوگوں نے اس تدبیر کو چھوڑ دیا تو پھل خراب آئے، چنانچہ کائنات کی اس سب سے اشرف زبان نے بھی کہہ دیا: "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ"۔ (۱)

اسی طرح دنیا کے ذرے ذرے کا قانون ہے جو ہمیشہ سے جاری ہے، لیکن میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ قانون یہ ہے کہ انسانی زندگی کی تکمیل انسانی زندگی سے ہوتی ہے، فلکیات، طبعیات، عمرانیات اور طبقات الارض غرضیکہ دنیا کے تمام علوم وفنون کے کچھ اصول اور قوانین ہیں، سب نے ان کا احترام کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح اللہ کا قانون ہے کہ انسانی زندگی کا چراغ انسانی زندگی کے چراغ سے روشن ہوا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا، نہ اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ ہوگا، انسان ہی انسان کے لیے سب سے بہترین نمونہ ہے جس میں وہ اپنے ہر ہر عمل کو دیکھ سکتا ہے، وہ اپنے ہر ہر نقص کو جانچ سکتا ہے اور پھر اس کو پورا کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

دنیا میں رسول اور نبی سے بڑھ کر نہ کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا، لیکن جب سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) پر نبوت کا بار ڈالا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کا واسطہ بنایا، آپ کے اندر رشد وہدایت کا شعلہ موجود تھا جو ہر وقت بھڑکنے کو تیار تھا، آپ کے اندر اس کی تمام صلاحیت اور استعداد تھی اور کسی استاذ کی ضرورت نہ تھی، لیکن اپنے اسی قانون کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو بھیجا، وہ آئے، آپ سے پڑھنے کو کہا، آپ نے عذر کیا، اس کی بنا

(۱) رواه مسلم في صحيحه، كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله (الرسول ﷺ) شرعاً دون ما ذكره من معايش الدنيا على سبيل الرأي، حديث رقم ٦١٢٨۔

پر انھوں نے سینے سے لگایا پھر کہا: پڑھو، پھر آپ نے معذرت کی، پھر سینے سے لگایا، پھر کہا: پڑھو، پھر آپ نے معذرت کی، پھر سینے سے لگایا پھر کہا: پڑھو، تو آپ نے پڑھنا شروع کیا۔

دنیا کے تمام ماہرین نے اس کو سمجھ لیا ہے کہ انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے محض معلومات کافی نہیں ہیں، معلومات اور ایجادات واکتشافات کی جو فراوانی اس وقت ہے وہ تاریخ کے کسی دور میں نظر نہیں آتی، لیکن تاریخ یہ بھی بتارہی ہے کہ اخلاقی پستی جو اس وقت ہے وہ کبھی نہیں تھی، اور یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ یورپ جو ایجادات واکتشافات کا سرچشمہ ہے، جہاں معلومات کی سب سے زیادہ فراوانی ہے، وہیں اخلاقی پستی بھی سب سے زیادہ ہے، اگر علوم وفنون کے لحاظ سے دنیا میں یورپ سب سے بڑھا ہوا ہے تو اخلاقی لحاظ سے دنیا کا سب سے تاریک ترین خطہ بھی وہی ہے، انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے کچھ عقائد چاہئیں، کچھ اصول وقوانین چاہئیں، اور کچھ مسلمات بھی ہونے چاہئیں، اور پھر ان اصول وقوانین اور مسلمات پر عمل کرنے کے لیے قوی محرکات کی ضرورت ہے، فطری دوافع اور جذبات کی ضرورت ہے، محبت اور جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے، کچھ ہونے اور حاصل کرنے پر آمادگی کا اظہار ہونا چاہیے، قربانی کا جذبہ چاہیے، اپنے اندر تواضع اور بے نفسی چاہیے، لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے، ایک دوسرے سے تعاون ہونا چاہیے، اپنے مقصد میں فنائیت اور خود فراموشی کا جذبہ چاہیے، یہ سب چیزیں آپ کو صرف کتابوں سے نہیں مل سکتی ہیں، اگر صرف کتابوں اور علمی تحقیقوں سے حاصل ہو جاتیں تو آج یورپ کے مستشرقین میں دنیا کے سب سے بڑے محدث اور مفسر نظر آتے، آج غزالی اور ابن تیمیہ نہ ہوتے بلکہ نیٹشے اور رینان ہوتے، یہ سب چیزیں اگر مل سکتی ہیں تو صرف ایک جگہ سے، اور وہ ہے انسان کا سینہ، اسی سے یہ تمام چیزیں اخذ کی جاسکتی ہیں اور اسی سے انسان انسان بن سکتا ہے۔

آپ تاریخ کے کسی دور کا مطالعہ کر لیجیے، کسی ادارے یا قوم کی تاریخ کو دیکھیے، آپ دیکھیں گے کہ آج جو کچھ نظر آرہا ہے یہ سب انسان ہی کی کاریگری ہے، دنیا میں جتنے انقلابات آئے، جتنی تحریکیں اٹھیں، یہ سب انسان ہی کے ذریعہ سے ہوا، یہ جذبات و

کیفیات صرف انسان سے انسان کی طرف منتقل ہو سکتی ہیں، خدا کے صحیفوں کو دیکھ لیجیے، اللہ کے عارف بندوں کی سوانح پڑھ لیجیے، اور پھر تاریخی شہادتوں کا مطالعہ کر لیجیے، آپ دیکھیے گا کہ جب بھی انسان انسان بنتا ہے وہ ہمیشہ انسان ہی سے بنتا ہے، جب تک اس پر باہر سے انسانی جذبات و کیفیات کا افاضہ نہ ہوگا، یہ سب کچھ نہ ہوگا۔

انسان کے اندر کانوں کے پتھروں کی طرح ہزاروں سال سے بہت سے جواہرات پوشیدہ ہیں، ہزاروں چٹانوں کے نیچے کچھ پتھر مدفون ہیں لیکن وہ انسان کے کام کے نہ ہو سکے، اس کی وجہ ایک ہے، اور وہ یہ کہ ان پر سورج کی کرنیں پڑنی چاہئیں، جب تک یہ کرنیں ان کو جگمگا نہ دیں ان کی کوئی قیمت نہیں، تاریخ میں آپ دیکھیے گا کہ اگر علم وادب، فلسفہ وفکر کے ذریعے کوئی انسان بن سکتا تو آج دنیا کے یہ بڑے بڑے مفکرین، فلاسفر اور متکلمین الحاد کی وادیوں میں نہ بھٹکتے، وہ دنیا کے عظیم ترین انسان ہوتے۔

آپ ملا نظام الدین کو دیکھ لیجیے، آج ان کا درس نظامیہ عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے، ان پر جب ملاّ عبدالرزاق بانسوی کی کرنیں پڑیں تو وہی ملا نظام الدین ملا نظام الدین بن گئے، اور آج دنیا میں ان کی شہرت جاودانی ہوگئی، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ عبدالحی سے بڑا عالم کون تھا؟ ان کے اندر علم وتحقیق کے خزانے پوشیدہ تھے، لیکن انھیں بھی ضرورت محسوس ہوئی تو سید احمد شہیدؒ کا دامن پکڑا جو علم وادب میں ان کے ہم پلہ نہ تھے، اور پھر انہی کی صحبت سے وہ بن گئے۔

انسان انسان کی صحبت سے بنا ہے

انسان انسان کی صحبت سے بنا ہے اور اسی سے بنے گا، یہی ایک آئینہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے، دنیا کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، انسان کی ہم نشینی سے اخلاق رذیلہ کا ذہول ہوتا ہے، اور ایک عزم پیدا ہوتا ہے، آپ سے نماز میں سستی ہوتی ہے لیکن آپ ایک ایسے آدمی کے ساتھ رہیں جو کڑاکے کی سردی میں تہجد کی نفلیں نہیں چھوڑتا، وہ برابر اسی سردی میں وضو کرتا ہے، نماز عشاء وفجر باجماعت ادا کرتا ہے، اس کے علاوہ نفلوں اور سنن میں ہر

وقت مشغول رہتا ہے، تو آپ سے کیسے ہوگا کہ آپ دوپہر کے وقت ظہر کی نماز بھی نہ پڑھ سکیں؟ دنیا کے تمام ریاضی دانوں کا اتفاق ہے اور ریاضی کی بنیاد اسی پر ہے کہ دس پانچ سے زیادہ ہوتا ہے اور بیس دس سے زیادہ ہوتا ہے، لیکن ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو اس سے ماوراء ہیں، ان کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کس چیز کا نام ہے، اور اسلام کس کو کہتے ہیں، اگر آپ ان کی نمازوں پر غور کریں تو آپ کہہ اٹھیں گے کہ خدا کی قسم! اگر ہماری نماز نماز ہے، تو ان کی نماز نماز نہیں بلکہ کچھ اور ہے، اور اگر ان کی نماز نماز ہے تو خدا کی قسم ہماری نماز نماز نہیں ہوسکتی، ان کے یہاں دشمن کے ساتھ محبت ہے، وہ قاتل کو سینے سے لگاتے ہیں، جو ان کے پاس قتل کے ارادے سے آئے، وہ اس کو دوست بنالیتے ہیں، جو ان کی عیب جوئی کرے، اس کو اپنا محسن مانتے ہیں، اور اپنی برائیوں پر غور کرتے ہیں، جو ان سے دشمنی کرتا ہے وہ اس کے لیے دعا کرتے ہیں، جو شخص ان کے پاس سے گزر جائے خواہ وہ سینے میں ان کی عداوت لیے ہو، خواہ ان کی برائی کرتا پھر رہا ہو، خواہ وہ ان کے قتل کے ارادے سے آیا ہو، وہ اس کے لیے دعا کرتے ہیں، اور اس کا گزرنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتا ہے، اسے کچھ نہ کچھ حاصل ہوجاتا ہے۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ چاہے کوئی کتنا ہی بڑا عالم ہو، اور کتنا ہی بڑا محقق ہو، بغیر کسی کامل یا کامل تر انسان کی صحبت کے اس کی زندگی کی ہرگز ہرگز تکمیل نہیں ہوسکتی، یہ کوئی غلط فہمی نہیں ہے، غلط فہمی زیادہ دن نہیں رہتی ہے، اسلام کے تیرہ سو برس سے یہ قانون خداوندی چلا آرہا ہے، اور اس کی مثالیں موجود ہیں، امام غزالیؒ جیسا آدمی جن کی تعلیم وتحقیق کے سامنے آج بھی یورپ کی گردنیں جھک جاتی ہیں، آج بھی یورپ ان کا لوہا مانتا ہے، ان کی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ وہ جب اپنے شیخ کی خدمت میں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ہے، شیخ ابوعلی فارمدیؒ جن کا نام آپ میں سے اکثر نہیں جانتے ہوں گے، لیکن ان کی صحبت سے امام غزالی کو کیا ملا ع

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید صبا چہ کرد

اتنے بڑے فلسفی، اتنے بڑے متکلم اور محقق کو ایک گمنام شیخ کی خدمت میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اسی شیخ کا اثر تھا کہ جب وہاں سے نکلے تو وہ چیز لے کر نکلے جس کے سامنے حکومت کا بڑا سے بڑا عہدہ ہیچ تھا، بغداد کا مسند درس جس کے سامنے بغداد کی خلافت بالکل گرد تھی، اس کے ہر فیصلہ کے سامنے حکومت کو سرنگوں ہونا پڑتا تھا، اس کو ٹھوکر مار کر چلے، زبان گنگ ہوئی اور اعضاء معطل ہو گئے، حتیٰ کہ اطباء نے کہہ دیا کہ ان کو ایسی فکر ہے جس نے تمام قویٰ کو معطل کر دیا ہے، تب امام غزالی، امام غزالی ہوئے، ورنہ بغداد میں عالموں، محققوں اور محدثوں کی کمی نہیں تھی۔

امام احمدؒ علم و فن میں کسی سے کم نہ تھے، لیکن وہ اپنے شیخ کے پاس جاتے تھے، اور نہایت ادب سے بیٹھتے تھے، حالانکہ علم و فن میں ان سے کم ہی تھے، ان کے احباب اور ساتھیوں نے کہا کہ آپ فلاں کے پاس کیوں بیٹھتے ہیں، اس سے ہم لوگوں کو غیرت ہوتی ہے، تو انہوں نے کہا: يَجْلِسُ الْإِنْسَانُ حَيْثُ يَجِدُ دَوَاءَ قَلْبِهِ، انسان جہاں دل کے درد کی دوا پاتا ہے وہیں جاتا ہے۔

سید سلیمان ندوی کو دیکھ لیجیے، ان کو کس چیز کی کمی تھی؟ دو مرتبہ خلافت کی تحریک میں یورپ گئے، مؤتمر عالم اسلامی میں ہندوستان کے واحد نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے، علمی تحقیقات و تصنیفات میں وہ مرتبہ تھا کہ علامہ اقبال جیسا قابل اور تعلیم یافتہ آدمی جو مغربی تعلیم کے لیے بھی مایۂ ناز ہے، اپنے خط میں لکھتا ہے: ''یہ سید سلیمان علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد ہے۔'' اقبال سے بڑا کون ہے جس کو اس عصر کی تعلیم نے پیدا کیا ہو، جب ان کے مکاتیب چھپنے لگے تو پاکستان کے لوگوں نے چاہا کہ یہ خط نہ چھپے، ایک عالم دین کی یہ عزت ان سے دیکھی نہ جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود، لوگوں نے کہا کہ آپ سے بڑھ کر کون عالم ہے، لیکن آپ فلاں کی مجلس میں کیوں شریک ہوتے ہیں؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ ایک طرف تو مجھ پر تم کو یہ اعتماد کہ مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہے، پھر دوسری طرف یہ بے اعتمادی کہ میرا کسی کی مجلس میں بیٹھنا تمہیں ناپسند ہے۔!!

عزیزو! یہاں قدم قدم پر درندے بیٹھے ہوئے ہیں، نفس پرستی، زر پرستی، جاہ پرستی اور نہ جانے کتنے کتنے فتنوں کے جال بچھے ہوئے ہیں، ہم نے دیکھا کہ کتنے لوگ علوم وفنون کے نا معلوم کتنے دریا عبور کر چکے ہیں، لیکن نفسانیت کی ایسی پستی میں مبتلا ہیں کہ خدا کی پناہ، اپنے منہ سے ایسی ایسی پست باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا متحیر ہو جائے، اتنا بڑا عالم اور ایسی پست باتیں۔!! نفس پرستی اور مال ودولت کے ادنیٰ اشاروں پر وہ ملت اسلامیہ کو غارت کردینے پر تیار ہو جاتے ہیں، دین ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں، وہ اپنے ایک ایک جملے میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی ہلاکت کا اعلان کردیتے ہیں۔

تم بلا استاذ وشیخ کے تعلق کے کچھ نہیں کر سکتے

میرے عزیزو! یہ ادارے کسی ذات یا کسی شخص واحد کی دعوت نہیں اور نہ کوئی اس کا مستحق ہے، جس طرح تم یہاں رہتے ہو یا دیوبند میں رہتے ہو، یہ کیا کوئی بھی ادارہ ہو، جامعہ زیتونہ ہو، جامع ازہر ہو یا جامع قزوین ہو، یا دنیا کی کوئی بھی درس گاہ ہو، وہاں سے صرف علم حاصل کرنا اور اس کے بعد اس سے بے تعلق ہو جانا کافی نہیں ہے، میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ دنیا کے کسی دور میں اور دنیا کے کسی حصہ میں رہو، تم بلا استاذ وشیخ کے تعلق کے کچھ نہیں کر سکتے، اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو تم اپنے معلم کے سامنے سر تسلیم خم کردو، اس کے جذبات و احساسات کا مطالعہ کرو، تم اس کے روز وشب کے اعمال، اس کے حرکات وسکنات کا بغور مشاہدہ کرو، تب تمہارے اندر اتباع سنت کا عزم پیدا ہوگا، اگر تم چاہو کہ صرف کتابوں سے حاصل کرلو تو ایسا نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ہوتا تو آج کیمبرج اور آکسفورڈ والے تم سے بڑھے ہوتے، ان میں نہ معلوم کتنے محدث ومفسر اور فقیہ پیدا ہو چکے ہوتے۔

عزیزو، جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک نظام ہے، اسی طرح یہ بھی ایک نظام ہے، جان لو، انسان انسان سے بنتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو صحابہ کرام آج دنیا میں سب سے افضل نہ ہوتے، یہ صحبت رسول ہی کی کیمیا اثری ہے ورنہ متاخرین میں بھی بہت بڑے بڑے عباد و زہاد گزرے ہیں، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے گروہ سے کہا کہ ہم تمہارے

ہاتھ پیر کاٹ دیں گے، تو انہوں نے جواب دیا: ﴿فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ، إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ [1]، یہ تھا رسول کی صحبت کا نتیجہ کہ ذرا دیر میں وہ ایمان واعتماد پیدا ہوا جس کے سامنے ہر ابتلا ومصیبت بے اثر ثابت ہوئی۔

اس بات کو یاد رکھو کہ تم اپنے کو ہمیشہ ناقص سمجھو گے، اور انسان کی ہم نشینی کرو گے، خدا ہم کو تم کو اس علم سے نفع پہنچائے، جو بھائی جارہے ہیں ہم ان کو افسوس وخوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت کرتے ہیں، خدا ہماری اور ان کی طاقتوں کو برقرار رکھے اور تعلقات کو استوار رکھے۔ (۲)

---

(۱) سورة طه:۷۲

(۲) دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے الوداعی جلسہ میں ۶ ردسمبر ۱۹۶۴ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد العلیم بستوی ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ، (شمارہ ۲۵ ردسمبر ۱۹۶۴ء)۔

فضلائے ندوہ اوران کی ذمہ داریاں

عزیزان محترم وبرادران عزیز!

مجھے اپنی سیاحتی اور علمی زندگی میں ایسی آزمائشوں سے کئی بارواسطہ پڑا ہے کہ مجھ سے محبت وتعلق کا اظہار کیا گیا اور میری حقیر ذات کے متعلق کوئی لکھی ہوئی چیز پڑھی گئی، لیکن آج مجھے کچھ اس سے زیادہ آزمائش درپیش ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عزیز بھائیوں نے مجھے مخاطب کیا، اور میرے متعلق کچھ کہا، میں اس کی مثال ایسی ہی سمجھتا ہوں کہ کسی گھر کے بچے اور اس کے افراد یہ طے کرلیں کہ آج گھر کے بزرگ (بزرگ میں اس لیے کہتا ہوں کہ ان سے سن وسال میں اور ندوہ سے تعلق میں مجھے سبقت حاصل ہے) کو جوان کے ساتھ ہروقت رہتے تھے، جن سے ہروقت واسطہ پڑتا تھا، سپاس نامہ پیش کرنا ہے اور گھر میں اس کی تیاری ہونے لگے، اس وقت اس فرد خاندان کو جو آزمائش پیش آئے گی اور جو ذہنی کشمکش، محبت وشکایت، ممنونیت وتشکر اور اس کے ساتھ ساتھ تعجب وغیرہ کی جو ملی جلی کیفیت پیش آئے گی، وہی کیفیت اس وقت مجھے پیش آرہی ہے۔

بہر حال میں اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں، اور سپاس نامہ کی میرے نزدیک بڑی قدر وقیمت اور اس کی افادیت یہ ہے کہ اس کے بہانہ ایک خاص جماعت کو مخاطب کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس کے ضمن میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جو عام جلسوں میں نہیں کہی جاتیں۔

میرے عزیزو! آپ ایک بڑے ادارے، بڑی دینی درسگاہ کے ساختہ پرداختہ اور ایک بڑے درخت کے برگ وبار ہیں، اس ادارہ کا شجرۂ نسب ایک صاحب دل اہل باطن اور اہل اخلاص پر ختم ہوتا ہے، ویسے تو ہر مدرسہ کا نسب نامہ صفۂ نبوی پر جاکر ختم ہوتا ہے، اس کا شجرۂ

نسب وہیں جا کر ملتا ہے، میں نے ایک بار کہا تھا کہ جس مدرسہ کا نسب ونسبت صفۂ نبوی سے قائم نہ ہو وہ مدرسہ مرکز رشد وہدایت نہیں، اور جس مسجد کی نسبت ونسب حرم مکی وحرم نبوی پر ختم نہ ہو وہ مسجد "مسجد ضرار" ہے، الحمدللہ ہمارے مدارس کا شجرۂ نسب ختم ہوتا ہے اصل میں صفۂ نبوی پر اور اسی چراغ کی روشنی ہے جو ابھی تک ان مدارس کو منور کیے ہوئے ہے اور اسی سے اس میں قدر و قیمت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اس وقت بلا ارادہ و بالارادہ اور شاید بلا ارادہ زیادہ زمانہ کے حالات وتغیرات نے علمی ودینی دنیا کی نگاہوں کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف متوجہ کر دیا ہے، اور لوگوں نے اس کا ایسا تصور اپنے ذہنوں میں قائم کیا ہے اور اس سے ایسی توقعات وابستہ کی ہیں جو اس کی حیثیت وحقیقت سے کچھ زیادہ ہیں، مجھے اس سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے، اس وقت خاص طور سے عالم عربی میں ندوۃ العلماء کا ایک بہت بلند تصور ہے، مجھے یاد ہے کہ میں ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ طرابلس گیا جو ایک بہت بڑا علمی ودینی مرکز بھی ہے جو بہت پہلے شام کے جگر کا ٹکڑا تھا، بعض سازشوں اور سیاسی حالات کی بنا پر لبنان میں شامل ہو گیا، وہاں مجھے ایک تعلیم گاہ دیکھنے کی دعوت دی گئی، میں وہاں گیا اور بہت متاثر ہوا، میں نے وہاں کے ذمہ داروں سے کہا کہ بہت شائستہ درس گاہ ہے، تو انھوں نے کہا کہ ہمارا آئیڈیل (Ideal) منتہائے تخیل تو ندوۃ العلماء ہے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس وقت میری حیثیت سے واقف بھی تھے یا نہیں، میں اس وقت ندوۃ العلماء کا ایسا بڑا ذمہ دار بھی نہیں تھا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم حیات تھے، مجھے شرم بھی آئی اور خوشی بھی محسوس ہوئی، اسی طرح کوئی پندرہ بیس برس پہلے کی بات ہے ایک مرتبہ لندن گیا، وہاں کے عرب طلبہ نے اپنے ہاسٹل میں مدعو کیا، میرے عزیز رفیق ومعاون مولوی معین اللہ صاحب بھی ساتھ تھے، طلبہ نے سوالات کرنا شروع کر دیا، اور اکثر باتوں میں پوچھتے تھے کہ اس دینی وتعلیمی نظریہ کے بارے میں ندوۃ العلماء کا کیا خیال ہے؟ وہ اس طرح پوچھتے کہ ندوۃ العلماء جیسے کوئی مستقل مکتب فکر ہے یا جیسے مذاہب فکریہ میں سے ایک مستقل مذہب ہے، میں کہتا کہ بھائی وہ بے شک ایک تعلیم

گاہ اور دانش گاہ ہے، لیکن وہ کوئی ایسا جامع مکتب خیال نہیں کہ جو ہر چیز کے بارے میں ایک مستقل نظریہ رکھتا ہو۔

روحانی تشخص وتفوق

یہ بات جہاں ہمارے لیے بڑی خوشی کی ہے وہاں بڑی ذمہ داری کی بھی ہے، اس لیے ندوۃ العلماء سے نسبت رکھنے والے نوجوانوں کو، اس سے محبت رکھنے والے اس کے فرزندوں کو اس کی شہرت عزت اور نسبت کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہیے، اسی کے ساتھ ابنائے قدیم جہاں کہیں بھی ہوں انھیں وہاں کے حالات کا برابر مطالعہ کرتے رہنا چاہیے، وہاں کی دینی علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے، اپنے کو مفید بنانے مفید ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اس کی ان خصوصیات کو جو اس کے بلند نظر و بلند نگاہ بانیوں جیسے مولانا محمد علی مونگیریؒ، حکیم عبدالحیؒ، مولانا ظہور الاسلام فتحپوریؒ، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے سامنے تھیں، جو ان کا منصوبہ تھا، جو ان کے مقاصد تھے، ان کو سامنے رکھنا چاہیے، اور فکری، ذہنی رہنمائی کے ساتھ دینی اخلاقی بلکہ روحانی تشخص وتفوق اور تفوق نہیں تو تشخص کا ضرور اظہار کرنا چاہیے کہ وہاں کے گرد و پیش کے لوگوں کو یہ محسوس ہو کہ یہاں ایسے صاحب علم عالم موجود ہیں جو صاحب فکر بھی ہیں اور جو ارجمند فکر اور دردمند دل دونوں کے جامع ہیں، ندوۃ العلماء کی بنیاد میں درحقیقت زبان ہوش مند اور ذہن ارجمند کے ساتھ دل دردمند بھی تھا، لیکن ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ اکبر الہ آبادی نے زبان ہوش مند و ذہن ارجمند کا تو اعتراف کیا، لیکن دل دردمند کی مثالیں ان کے سامنے ایسی واضح نہیں تھیں کہ وہ اس کو بھی ندوۃ العلماء کے اوصاف میں شامل کرتے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی، برادر محترم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی کوششوں سے وہ بات وہ خصوصیات بھی ندوۃ العلماء میں پیدا ہونے لگیں لیکن اس کو ابھی بہت بڑھانے کی ضرورت ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دانش گاہ، تحریک اور مکتبۂ فکر کا کام زبان ہوشمند اور ذہن ارجمند سے تو چل سکتا ہے لیکن اسلام کے ساتھ دل دردمند بھی

ضرور ہونا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ یہ میرے عزیز بھائی ان اوصاف کے (جن کو بعض جگہ متضاد سمجھ لیا گیا ہے اور حقیقت میں متضاد نہیں ہیں) جامع ہوں گے، اور عوام سے بھی تعلق رکھیں گے، ابھی تک ہماری کمزوری یہ رہی ہے کہ ہم نے زیادہ تر خواص کو مخاطب کیا، اور ہماری صلاحیتیں کچھ اس طرح کی تھیں یا ہم نے جو صلاحیتیں پیدا کیں اور جن کو ضروری سمجھا کچھ اس طرح کی تھیں کہ وہ خواص کے لیے تو مفید تھیں اور خواص کا لحاظ رکھ کر ان کی پرورش کی گئی تھی، لیکن عوام سے جو رابطہ قائم ہونا چاہیے تھا، وہ ابھی تک قائم نہیں ہو سکا تھا، مگر الحمد للہ اب عوام سے بھی ندوۃ العلماء کا رابطہ قائم ہو رہا ہے اور عوام اس سے نہ صرف متعارف ہو رہے ہیں بلکہ مانوس بھی ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اس کوشش کو بڑھانا چاہیے، اور وہاں کے مسائل اور ماحول کو سامنے رکھنا چاہیے۔

ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں

تمام مدارس ہمارے اپنے ہی ہیں، الحمد للہ کسی کے ساتھ کوئی غیریت نہیں، یہاں جو مدارس ہیں ان کے ساتھ ان عزیزوں کو دلچسپی ہونی چاہیے، اور ان سے تعاون کرنا چاہیے، کہ کسی قسم کی مغایرت ہرگز نہیں ہونی چاہیے، اور حقیقت میں کوئی مغایرت ہے بھی نہیں، ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، ایک ہی نسبت کے حامل ہیں، ایک ہی مسلک پر چلنے والے ہیں، جب کبھی یہ جماعت ہدف بنتی ہے تو ہم سب ہدف بنتے ہیں، پہلے بھی کوئی حقیقی مغایرت نہیں تھی اور اب تو کسی مغایرت کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔

میں ان عزیزوں کے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں، خواہ اس جذبہ کے اظہار کے لیے انھوں نے کوئی بہت مناسب طریقہ نہ اختیار کیا ہو، لیکن بہر حال جذبہ قابل قدر ہے اور اصل چیز جذبہ ہے جیسا کہ میں نے کل ڈنر کے موقع پر کہا جو محترم سید حامد حسین صاحب (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے اعزاز میں دیا گیا تھا کہ مجھے اس میں تشکر واطمینان کی اور احسان مندی، محبت وشرافت کی جو بو نظر آتی ہے، اصل قیمت ایسی تقریبات کی یہی ہے، یہ

تعلق کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، کوئی اس کا جواز ہے تو کم از کم یہ ہے کہ اس میں تعلق کا جو جذبہ کارفرما ہے وہ اعتماد و احترام کا جذبہ ہے، اور اس کے بغیر کوئی جماعت کوئی کام نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کو اپنے اداروں، اس کے خدمت گزاروں، اس کے کارکنوں اور اپنے استادوں کے ساتھ تعلق کو قائم رکھنے کی خواہش نہ ہو، میں ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں، اور اخیر میں ان عزیزوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اور دنیا سے بڑھ کر آخرت میں شرمسار نہ کرے، ان کو ہم سے شرمسار نہ کرے اور ہم کو ان سے شرمسار نہ کرے، وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ، یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ، إِلَّا مَنْ أَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ، وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالَی عَلَی خَیْرِ خَلْقِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ أَجْمَعِیْنَ۔[1]

---

(۱) ۲۷/فروری ۱۹۸۳ء کو بستی میں ندوی برادری کے ایک جلسہ میں سپاس نامہ پیش کیے جانے کے بعد کی گئی تقریر، یہ تقریر حکیم ابو الحسن ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/جون ۱۹۸۳ء)۔

اپنے کو نیلام کی منڈی میں نہ پیش کیجیے!

میرے رفقائے کار اساتذۂ دار العلوم، برادرانِ عزیز، اور فرزندانِ عزیز!

مجھے سب سے پہلے اپنے اس تاثر کا اظہار کرنا ہے کہ میں نے رخصت ہونے والے بھائیوں کے اردو اور عربی مضامین سن کر خدا کا شکر ادا کیا، اور میں برملا اعلان کرتا ہوں کہ الحمد للہ جو کوششیں ہو رہی ہیں، وہ ضائع نہیں ہو رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى﴾ (۱)

میں اپنے عزیز رفقاء اور اساتذۂ دار العلوم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی کوششوں اور دار العلوم کے فضلاء کی تصنیفات کا اثر ان مضامین میں ہے، میں سالہا سال سے الوداعی جلسوں میں شریک ہو رہا ہوں، اور کبھی کبھی ''الاصلاح'' کی مجلسوں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے، فکری و علمی لحاظ سے بھی، قوتِ تعبیر اور قوتِ بیان کے لحاظ سے بھی، اور قدرتِ تحریر اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، اور زبان و ادب کے لحاظ سے بھی نمایاں ترقی نظر آتی ہے، یہ بات بڑی موجب شکر ہے، اور میں اپنے عزیز طلبہ کو ان کی ترقی اور ان کی سعادت مندی پر، ان کے تعلق و احترام پر اور ان کے خلوص و محبت پر مبارک باد دیتا ہوں، اور اپنے ان عزیز طلبہ سے معذرت کرتا ہوں جو اپنے مضامین نہیں سنا سکے، اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں، اور ان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان کی یہ محنت ضائع نہیں ہوئی، اس لیے کہ انہوں نے مضامین تیار کرنے میں جو وقت صرف کیا ہے، وہ ان کے لیے ہر حال میں مفید ہے، اس پر زیادہ قلق نہ کریں، ان کی یہ چیز زیورِ طباعت سے آراستہ بھی ہوسکتی ہے جو ان کے لیے بطور یادگار رہوگی۔

(۱) سورة النجم: ۳۹-٤٠

اب میں مختصر وقت میں چند ضروری اور وداعی باتیں کرنا چاہتا ہوں، یوں تو وقت کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن چونکہ یہ الوداعی جلسہ ہے، اس لیے آپ سے میں وہی باتیں کروں گا جو میرے اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور مطالعے کے لحاظ سے ہیں، اور میں جن کو آپ کے لیے مفید سمجھتا ہوں، آپ کی محبت، آپ کا میرے اوپر حق کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے۔

چار محاذ

اب میں آپ سے چار باتیں عرض کروں گا جو حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوں گی، اور چار باتیں آپ کی ذات سے متعلق عرض کروں گا۔

حالاتِ حاضرہ سے متعلق چار باتوں میں سے پہلی بات جو اگرچہ بہت بڑی ہے اور میری حقیقت اور حیثیت سے بلند ہے، مگر اس کے ذکر میں برکت اور حلاوت ہے، ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) چند چیدہ اور برگزیدہ صحابہ کرام کی مخصوص جماعت میں تشریف فرما تھے، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ میرے لیے دعا کا وقت ہے، اور ان کی طبیعت میں بھی تقاضا پیدا ہوا جو عارفین میں پیدا ہوا کرتا ہے، اور وہ تو سب عارفین سے بڑھ کر عارف تھے، انھوں نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ آپ سب آزاد ہیں، اپنے لیے دعا کریں اور منہ مانگی مراد مانگیں، تو کسی نے کہا کہ: اے اللہ! اپنے راستے میں نکلنے کی توفیق دے کہ یہ دولت تیرے راستے میں لٹا دوں، اور تیرے بندوں کی خدمت کروں، کسی نے کہا کہ اے اللہ! اپنے راستے میں نکلنے کی توفیق دے کہ میں جہاد کرکے اپنا سر کٹاؤں اور تیرے راستے میں اپنا خون بہاؤں، اسی طرح تمام صحابۂ کرامؓ کی دعائیں منقول ہیں۔ جب حضرت عمرؓ کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا کہ میری دعا ہے کہ میرے پاس ابوعبیدہ، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، خالد (رضی اللہ عنہم اجمعین) ہوں، اس کے علاوہ اور کئی نام لیے- بہرحال یہ سب وہ لوگ تھے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی فتوحات مقدر کی تھیں اور بڑے بڑے کارنامے تقدیر میں لکھے تھے- اور کہا: ان میں سے کسی کو کسی محاذ پر اور کسی کو کسی محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں ان کے ذریعہ اسلام کا پرچم لہرا دوں، اور پوری دنیا اسلام کے زیر نگیں ہو۔

آج سے پہلے اسلام کے مستقبل کے فیصلہ کن محاذ اتنے متعین اور واضح نہیں تھے، ان پر کہر تھا، کچھ ایسی تاریکیاں تھیں کہ اس وقت متعین کر کے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ چار محاذ ہیں جن کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے، اور اپنے عقیدہ، اپنے پیغام اور اپنے تشخص کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے یا نہیں؟ تو میرا مطالعہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ محاذ متعین اور واضح نہیں تھے، لیکن اس میں سیاسی تبدیلیوں، انقلابِ سلطنت اور اسلام کے خلاف موجودہ مہم اور علمی تجربوں نے اس کو بالکل ایک حقیقت بنا دیا ہے، انہیں چار محاذ کا ذکر آپ سے کروں گا جن کے لیے بلند عزائم سپاہیوں، اور دینی درسگاہ کے فضلاء، اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ علماء اور مخلصین کی ضرورت ہے، اور ان کے لیے اس سے بڑی سعادت نہیں ہو سکتی کہ وہ ان محاذ جنگ میں اپنی صلاحیتوں اپنی توانائیوں اور سرگرمیوں کا اظہار کریں۔

نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت

ان میں سب سے بڑا محاذ یہ ہے کہ ہماری ملّتِ اسلامیہ کی آئندہ نسل مسلمان رہ جائے، اور وہ صرف ذہنی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے نہیں، بلکہ اعتقادی ارتداد سے بچ سکے۔ اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے مدارس سے فارغ ہوں، وہ اس محاذ کو سنبھالیں، اس محاذ کا چارج لیں، اور اپنے کو اس محاذ کے لیے وقف کر دیں، اور یہ کوشش کریں کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل جو ابھی آٹھ دس برس کے بچے یا بارہ پندرہ برس کے نوجوان کی شکل میں ہیں اسلام کی اصولی، فقہی اور کلامی تعریف پر صادق ہوں، اس کے لیے ضرورت ہے اس بات کی کہ قصبے قصبے، شہر شہر اور گاؤں گاؤں مدارس و مکاتب اور مساجد کی بنیاد ڈالی جائے، اور جہاں ایسا ممکن ہو وہاں صباحی و مسائی درجات ہوں، اور جو لوگ جدید تعلیم یافتہ ہیں، اور اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کے لیے مجبور ہیں، ان کو غذا پہنچائیں، اگر ان کو ابھی سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو ڈر ہے کہ اس میں نوخیز نسل کو آگے چل کر کلامی اور فقہی اعتبار سے مسلمان کہنا صحیح ہوگا یا نہیں؟ وہ توحید و شرک اور کفر و ایمان کا فرق کر سکے گی یا نہیں؟

رسالت، منصب رسالت اور رسول اللہ (ﷺ) کو نبی آخر الزماں اور آپ ؐ کی شفاعت کو مانے گی یا نہیں؟ ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ اور ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ پر اس کا ایمان ہوگا یا نہیں؟

آپ کے بلند عزائم اور بلند خیالات، آپ کے مطالعے اور پختہ صلاحیتوں پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اور اس پر آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ کون کس محاذ کو سنبھالتا ہے، آپ ابھی سے نیت کیجیے کہ ہم اس خطرناک اور نازک محاذ کے لیے سینہ سپر رہیں گے، پھر اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا، اور اسباب مہیا کرے گا، اور آئندہ نسل جو ہماری اور آپ کی اولاد ہوگی، اس کو مسلمان رکھنے کے لیے جو بھی کوشش کی جا سکے کی جائے، جو ہاتھ پیر مارے جا سکیں مارے جائیں، اور جو آبِ دیدہ و خونِ جگر بہایا جا سکے بہایا جائے، یہ سب سے بڑا محاذ ہے۔

امت اسلامیہ کے ملی تشخص کی حفاظت

دوسرا محاذ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہے، یعنی اپنے عائلی قانون، قرآن مجید کے نصوص قطعیہ اور احکام قطعیہ، نکاح وطلاق کے احکام، ترکہ وتعلقات کے احکام پر عمل کر سکے، اگر وہ اس پر عمل نہ کر سکے تو بعض وقت وہ ناجائز اور حرام ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:- ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَآئِكَةُ ظَالِمِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ قَالُوْا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَأُولٰٓئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْراً﴾ (۱)

بہت سخت الفاظ ہیں، اگر خدانخواستہ یہ وقت آ گیا کہ مسلمان یہاں نماز تو پڑھ سکے، کلمہ تو پڑھ سکے، قرآن شریف کی تلاوت کر سکے، لیکن وہ قرآن مجید کے عائلی احکام پر عمل نہ کر سکے، پھر اس وقت علماء کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ ہجرت کا فتویٰ دیں، خدا کرے وہ وقت نہ آئے، ہم اس زمین پر اپنا حق سمجھتے ہیں، یہاں کے اہلِ بصیرت، عارفین، مُلہَم مِنَ اللہ اور

(۱) سورۃ النساء:۹۷

اپنے عہد کے مخلص ترین بندوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس ملک سے اسلام مٹنے والا نہیں ہے، اور اس ملک کی قسمت میں اسلام لکھ دیا گیا ہے، اور اس ملک کے لیے اسلام اَلاٹ ہو گیا ہے، اور تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہے کہ اسلام اس ملک میں رہے، اسلام اس کی قیادت بھی کر سکتا ہے اور بچا بھی سکتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر دوبارہ اس کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے، اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، مگر ہمیں واقعات وحقائق کو دیکھ کر اپنی کوششوں کا رخ متعین کرنا چاہیے، کیوں کہ مسلمانوں کا ملی تشخص روز بروز خطرے میں پڑتا جا رہا ہے، اس کی بے حد ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے شاہ بانو کیس سے گویا ایک غیبی مدد فرمائی ہے جس نے سارے مسلمانوں میں اس خطرے کے احساس کو پیدا کر دیا تھا، جس کے لیے ایک مہم چلائی گئی اور وہ ایک مرحلہ پر کامیاب ہوئی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمہوری اور اجتماعی طریقہ پر اتحاد اور اتفاق کے ساتھ اور خلوص کے ساتھ جو مہم چلائی جائے وہ ضرور کامیاب ہوگی، حالانکہ فیصلہ سے پہلے یہ پیشین گوئی کرنا بہت مشکل تھا کہ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہوگا یا نہیں، اور ان کا مطالبہ پورا ہوگا یا نہیں؟ لیکن اللہ کے چند مخلص بندوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ورہنمائی سے، قرآن مجید کی روشنی اور تاریخ کے تجربے میں صحیح طریقہ اختیار کیا تو انہیں کامیابی ہوئی۔

پیامِ انسانیت

تیسرا محاذ پیامِ انسانیت کا ہے، ہم اس ملک میں اس طرح رہیں کہ اپنے دین کو باقی رکھنے کے لیے بھی، اپنے دین پر عمل کرنے کے لیے، اپنے اداروں اور مرکزوں کو محفوظ رکھنے کے لیے بھی، دعوت کا کام کرنے کے لیے بھی، تعلیم وتالیف کا کام انجام دینے کے لیے بھی، با مقصد اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے، اپنے مخصوص عقائد کے ساتھ، اپنے پیغام ومقام کے ساتھ اس ملک میں زندگی گزار سکیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ فضا معتدل ہو، مشتعل اور آتش گیر نہ ہو، ورنہ کسی وقت بھی ساری کوششوں پر پانی پھر سکتا ہے، بہت کم لوگ اس کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چند آدمیوں کے ذہن کی اپج ہے، یا

ان کا ذاتی رجحان ہے، جو کسی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔

آپ یقین مانیے کہ حالات کے حقیقت پسندانہ اور علمی مطالعہ نے میری رہنمائی کی ہے، ہم جیسے اور رفقاء کو اسی مطالعہ نے مجبور کیا کہ وہ کوشش کریں، حالانکہ اس کوشش کا تناسب واقعات کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں، اگرچہ یہ وہ مجمع نہیں ہے جس کے سامنے کہنے سے یہ سمجھوں کہ بات تحریک کی شکل اختیار کرے گی، لیکن کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے وہ کام لے لے، لہٰذا آپ اس کو بھی یاد رکھیے، اور باہمی اعتماد، ایک دوسرے کا احترام ہمارے اندر پیدا ہونا چاہیے۔

اسپین کا المیہ جو پیش آیا، اس پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اس میں ایک بات بہت نازک یہ ہے کہ وہاں علوم دینیہ کی بھی خدمت کی گئی، اور وہاں خدا تک پہنچنے کے لیے ایسے ایسے مجاہدے ہوئے جن سے چوٹی کے اولیاء پیدا ہوئے، بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مشرق اگر انبیاء کی سرزمین ہے تو مغرب اولیاء کی سرزمین ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ جیسے جلیل القدر مشائخ پیدا ہوئے، اسی طریقہ سے فنونِ لطیفہ کو بھی وہاں بہت ترقی ہوئی، اندلس کا ایک مستقل ادبی دبستان ہے، اس کو المدرسة الأندلسية کہتے ہیں، اسی طرح چوٹی کے مصنفین پیدا ہوئے، 'موافقات' کے مصنف علامہ شاطبیؒ پیدا ہوئے، ابن عبد البرؒ پیدا ہوئے، ایسے ہی بہت سی کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے، اور موطا کی ایسی شرحیں لکھی گئیں، لیکن ایک چیز سے اغماض برتا گیا، وہ یہ کہ وہاں کی اصل آبادی جو آٹے میں نمک کے برابر تھی، اپنی پوری سلطنت واقتدار کے باوجود سنجیدگی کے ساتھ اس کو اسلام سے مانوس کرنے اور اسلام کے دائرے میں داخل کوشش نہیں کی گئی، اس لیے کہ اقتدار میں اکثر یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے نام اس زمین کا پٹہ لکھ دیا گیا ہے، مغلیہ سلطنت کے فرامین میں یہ لفظ ملتا ہے کہ ''دولتِ ابد قرار''، یعنی ہم براہِ راست حضرت اسرافیلؑ کو اس ملک کا چارج دیں گے، اور اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں ہے، یہ اس کا غلط خیال تھا، اس پھیلی ہوئی آبادی کو اپنے حال پر چھوڑ دینا، اور اس کے جذبات کو غلط تعلیم کے ذریعہ، غلط تاریخ کے ذریعہ، اپنی اخلاقی

کمزوریوں کے ذریعہ، اس سے بڑھ کر مقابل سیاسی تحریکوں کے ذریعہ نشو ونما پانے کا موقع دینا بہت خطرناک ہے۔

ہندوستان میں تو یہ عنصر زیادہ واضح طور پر ہے، مسلمانوں نے ہندوستان پر آٹھ سو سالوں تک علی الرغم حکومت کی ہے، اور جب اخیر میں تصادم اور متضاد سیاسی تحریکیں چلی ہیں، اور انھوں نے غیر مسلموں کے دل میں بڑے بڑے ناسور پیدا کر دیے ہیں، اب اس کو 'پیام انسانیت' کے ذریعہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے، اس کو میں نے بہت اختصار سے بیان کیا ہے، اس پر پورا لٹریچر تیار ہو گیا ہے، آپ اس کا مطالعہ کریں۔

علوم دینیہ کی بقا کی کوشش اور زمانہ کے ساتھ ان کی تطبیق

چوتھا اور آخری محاذ علوم دینیہ کے بقا کی کوشش کرنا اور زمانے کے ساتھ ان کو تطبیق دینا، اس طرح نہیں کہ زمانہ کے تابع ہوں، بلکہ زمانہ کے جائز اور واجب تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، اور اس کی زبان وادب کی رعایت کے ساتھ علوم دینیہ کو زندہ رہنے اور اپنا کام کرنے، اور زمانہ کا نہ صرف ساتھ دینے، بلکہ اس کی قیادت کرنے کے قابل بنائیں، اس کے لیے عربی مدارس تو ریڑھ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو ترقی دیں، اور ان کے لیے اساتذہ تیار ہوں، ندوۃ العلماء کے ملحق مدارس کو اپنی پچاس ساٹھ سے متجاوز تعداد ہونے کے باوجود اساتذہ نہیں ملتے، آپ اس کے لیے بھی تیار ہوں، نئے مدارس قائم کریں، علوم دینیہ میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کریں، صرف یہ نہیں کہ آپ فرسودہ چیزوں کو فرسودہ اور بوسیدہ چیزیں سمجھ کر پڑھائیں، بلکہ ان میں نئی روح، نئی توانائی پیدا کریں، تصنیفات نئی ہوں، تشریحات نئی ہوں، نئی ترجمانی ہو، نئی قوّتِ تدریس ہو، نیا ذوقِ تعلیم ہو اور نئی ذہنی صلاحیت، اور اس کے ساتھ ذکاوت، حافظہ اور مطالعہ کی وسعت ہو۔

یہ چار چیزیں جو میں نے اختصار سے بیان کی ہیں، ان کی طرف توجہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

طلبہ سے متعلق چار باتیں

اور اب وہ چار چیزیں بیان کرتا ہوں جو آپ کی ذات سے متعلق ہیں، انہیں آپ سرسری نہ سمجھئے گا، یہ ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہے، اگر چہ خودستائی ہے، اور اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے، محض اپنی بات میں اہمیت پیدا کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ بہت کم لوگوں کو علمائے سلف اور علمائے معاصرین اور درمیانی دور کے علماء، خاص طور پر ہندوستان کے علماء کے تراجم پڑھنے کا موقع ملا ہوگا جتنا مجھے ملا ہو، اور اس کے خاص اسباب تھے، کیونکہ میں ایک تاریخی ماحول اور مؤرخین کے گھرانے میں پیدا ہوا، اور گھر میں سارا خزانہ موجود تھا۔

"نزھۃ الخواطر" جس میں ساڑھے چار ہزار سے زائد علمائے ہند کے تراجم ہیں، اس کو میں نے کئی بار پڑھا، مسودہ کے مرحلہ سے لے کر طباعت کے بعد تک ہر مرحلہ میں کئی بار پڑھتا رہا، اسی طرح 'وفیات الاعیان' اور طبقات کی جو کتابیں ہیں پڑھیں، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا موقع بھی نصیب فرمایا۔

اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھیے!

ا:- سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست ہو، کسی درجہ میں تقویٰ، دیانت داری اور تعلق مع اللہ ہو، یا اس کی فکر ہو، یہ ایسی بنیادی بات ہے کہ جس کے بغیر نہ کسی کام میں برکت ہوتی ہے نہ حرکت، اور ایسا حقیقی نفع اسی وقت ہوگا جب خدا اور رسولؐ کے ساتھ معاملہ درست ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سب کے سب شب بیدار بن جائیں، صوفی اور عارف باللہ ہو جائیں، یہ ہر شخص کے لیے ضروری نہیں، لیکن جو ضروری حصہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک حد تک تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صحیح ہو اور اس کی فکر ہو، اور اپنی نمازوں کی فکر ہو، دعا کا ذوق ہو، اور اوراد انابت الی اللہ کسی نہ کسی درجہ میں ضرور ہو، یہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے، اسے کبھی بھولنا نہیں چاہیے، اور اس کے حصول کے بہت سے ذرائع ہیں، ان میں سے ایک تو

یہی ہے کہ کتاب وسنت اور فقہ کا مطالعہ کریں، اور اس کے مطابق اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

بزرگانِ دین کے حالات پڑھیں!

اس کے علاوہ سب سے مؤثر چیز یہ ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات پڑھیں، اور اگر اللہ تعالیٰ نصیب کرے تو کسی بزرگ کی صحبت اختیار کریں، میں تو بے تکلف کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور مفید حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی کتابیں، خاص طور سے ان کے ملفوظات ومواعظ ایک اچھا اثر رکھتے ہیں، میں نے الحمد للہ ساری ندویت، اپنے تمام ادبی ذوق اور تاریخی بلکہ انتقادی ذوق کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھایا ہے، اور آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے آپ کو اپنی جاہ طلبی، حبِّ مال اور معاملات میں کوتاہی کا علم ہوگا، اور خاص طور پر اخلاق کی اصلاح، اجتماعی کاموں کی اہمیت پر ان کے یہاں بڑا زور دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان سے یہ کام لیا ہے، آپ اس کی طرف ضرور توجہ دیں، آپ کے اندر اس کی کوئی مقدار ضرور ہونی چاہیے۔

زہد وایثار

دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں، خاص طور پر اس کی دعوت وعزیمت کی تاریخ اور اس کی اصلاحی تحریکوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک علم اور نفعِ خلائق کا، اصلاح وانقلابِ حال کا اور زہد وایثار کا ساتھ رہا ہے، یہ دونوں بالکل ہم سفر ہیں، آپ اسلام کی پوری تاریخ کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کا کہیں ساتھ نہیں چھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے ذریعہ امت کو نفع پہنچایا، اور کسی بڑے فتنہ سے محفوظ فرمایا، ان میں سب سے بڑا فتنہ 'ردّت' کا فتنہ تھا، اور دوسرا فتنہ خلقِ قرآن کا تھا، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے:- نَصَرَ اللّٰهُ هَذِهِ الْأُمَّةَ - یا - أَعَانَ اللّٰهُ هَذِهِ الْأُمَّةَ بِأَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ يَوْمَ الرِّدَّةِ وَبِأَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ يَوْمَ الْفِتْنَةِ، اور اس کے بعد جو فلسفے کے حملے تھے، جن کے مقابلہ

کے لیے جو لوگ آئے، امام غزالیؒ ہوں یا امام ابوالحسن اشعریؒ ہوں، پھر اس کے بعد جو فتنے تھے ان کے مقابلہ کے لیے امام ابن تیمیہؒ وغیرہ آئے، پھر ہندوستان میں صوفیائے کرام جنھوں نے مادیت وغفلت اور سلطنت کے اثر سے جو جاہ پرستی، دولت پرستی اور نفس پرستی پیدا ہو رہی تھی، اس کو روکا، پھر اس کے بعد غیر مسلموں کے اثر سے اسلامی معاشرے میں جو بدعات، مشرکانہ عقائد داخل ہو گئے تھے، اور وحدۃ الوجود کا جو اثر فلاسفہ اور صوفیوں سے لے کر ادباء اور شعراء تک کے دماغوں میں سرایت کر گیا تھا، اس کے مقابلے کے لیے حضرت مجدّد الف ثانیؒ آئے، پھر اس کے قرآن مجید کے براہِ راست مطالعہ اور حدیث سے اشتغال نہ ہونے کی وجہ سے جو ایک جاہلیتِ ہندیہ اور مقامی اثرات تھے، اور اتباعِ سنّت کا جو ذوق کم ہو گیا تھا، اور عقیدہ میں رخنہ پڑ گیا تھا، اس کے سدّ باب کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف وخلفاء کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔

غرض کہ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ اصلاح کا کام، عزیمت کا کام اور سطح سے بلند ہو کر امت کے نفع کا کام اور زہد وایثار، دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فطری اور طبعی رشتہ قائم کر دیا ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں ٹوٹنے نہیں پایا، اس لیے میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس کے لیے بھی آپ اپنے کو تیار کریں، کیوں کہ دوسری قوموں میں بھی کوئی کام زہد وایثار کے بغیر نہیں ہوا ہے، اگر چہ ان کے مزاج الگ، ان کے نتائج مختلف اور ان کے احکام بھی دوسرے ہیں، اس لیے اپنے آپ کو ارزاں فروشی سے بچائیں، صرف دولتِ دنیا کو اور عہدوں کو اپنا مطمحِ نظر نہ بنائیں، جہاں سے کام آجائے، مانگ آجائے، اور امید ہو جائے، بس آپ آنکھ بند کر کے چلے نہ جائیں اور زہد وایثار سے کام لیں، اسی زہد وایثار کے وعدے سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے، اس وقت نہ میں استیعاب کر سکتا ہوں اور نہ آپ کو ضرورت ہے۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ زہد وایثار سے جو حقیقی آسودگی اور صحیح عزت حاصل ہوتی ہے وہ کہیں نہیں حاصل ہوتی ہے، اور یہی اصل مقصد ہے جو لاکھوں کروڑوں روپے کے مالک کو بھی حاصل نہیں ہے، وہ ایک لقمہ کو حلق سے اتارنے کے لیے بعض اوقات ترستے ہیں، ہنری فورڈ کہتا تھا کہ میری ساری دولت لے لو اور میرا ہاضمہ درست کر دو، اور اس قابل بنا دو کہ میں کچھ

کھاپی سکوں، حقیقی ضرورت کا سہولتوں اور عزت کے ساتھ پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتا ہے۔

اگر غیر مناسب بات نہ ہوتی تو میں بتاتا کہ میں اور میرے بعض رفقاء کو محض بزرگوں اور اپنے مربّیوں کے فیض سے اور جو کتابوں میں پڑھا تھا، اس کے اثر سے اللہ تعالیٰ نے بچالیا، تو آج ہم اس قابل ہیں، ورنہ معلوم نہیں کسی یونیورسٹی یا کسی کالج میں رٹائر ہو چکے ہوتے، اور تھوڑی بہت پنشن وغیرہ جو ملتی ہے ملتی ہوتی، اور اپنے قصبہ میں بیٹھے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے، لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر بزرگوں کے واقعات سامنے ہوتے ہیں، ان میں سے مولانا عبدالرحیم صاحب کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، جس کی نظیر شاید مشکل سے ملے گی۔

مولانا عبدالرحیم رامپوریؒ کا واقعہ

والد صاحب مرحوم نے 'نزہۃ الخواطر' میں مولانا نجم الغنی صاحب رام پوری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا عبدالرحیم صاحب معقولات کے اور ریاضیات کے بہت بڑے ماہر تھے، وہ قدیم درس پڑھاتے تھے اور انہیں ریاست رامپور سے دس روپے ماہانہ ملتے تھے، ان کی اپنے فن میں قابلیت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، جب بریلی میں پہلی مرتبہ کالج قائم ہوا ہے تو اس کے پرنسپل مسٹر ہاکنس نے ان کو آفر (پیش کش) کی کہ آپ بریلی کالج میں آیئے اور ڈھائی سو روپے آپ کی تنخواہ ہوگی، تو انھوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ ریاست سے مجھے دس روپے ماہوار ملتے ہیں، وہ بند ہو جائیں گے، ہاکنس نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے پچیس گنا زیادہ پیش کرتا ہوں، اس کے مقابلہ میں اس حقیر رقم کی کیا حیثیت ہے؟ انھوں نے عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے، اس کی بیری بہت میٹھی اور مجھے مرغوب ہے، بریلی میں وہ بیری کھانے کو نہیں ملے گی، اس نے کہا کہ رام پور سے بیری کے آنے کا انتظام ہوسکتا ہے، آپ بریلی میں گھر بیٹھے اپنے درخت کی بیری کھا سکتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رام پور میں درس لیتے ہیں، ان کا درس بند ہو جائے گا، اور میں ان کی خدمت سے محروم ہو جاؤں گا، انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی، اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں تاکہ وہ بریلی میں

آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں، آخر میں انھوں نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے، لیکن آپ یہ بتائیے کہ کل قیامت میں خدا یہ سوال کرے گا کہ تم رامپور چھوڑ کر بریلی اس لیے گئے تھے کہ یہاں دس روپے ملتے تھے اور وہاں ڈھائی سو روپے ملیں گے، تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟ انگریز بہر حال انگریز تھا، اس نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

زہد واستغناء کی مثالیں آج پھر زندہ ہونی چاہئیں!

میرے عزیزو! میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ ایسی مثالیں پھر زندہ ہونی چاہئیں، اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کی سنت ہے، سارے آسمانی صحیفے بتاتے ہیں، انبیاء (علیہم السلام) کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے، اور مصلحین کی تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو عزت، سکونِ قلب اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے، اور اس کے ساتھ جو برکت ہوتی ہے، وہ سب زہد ایثار پر موقوف ہے، اور اب پھر وہ دور آگیا ہے، خاص طور سے ہندستان کے حالات اس زہد وایثار کے طالب ہیں، یہ بہت بری روایت شروع ہوگئی ہے کہ جہاں زیادہ پیسے ملیں، جہاں زیادہ آسودگی حاصل ہو، اور جہاں اپنے خاندان کی آسانی سے پرورش کرسکیں، وہیں جانا چاہیے، یہ بہت بڑی آزمائش ہے، اس سے بچنے کی دعا مانگنی چاہیے۔

جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا!

تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ میں نے بھی کتابیں پڑھیں ہیں، اسلام کے مذاہبِ اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو، ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا۔

اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں، جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیے گا، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے

ساتھ رہی ہے، جس کے شواہد وقرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کو باقی رکھنا تھا، اور باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہے، ورنہ بدھ مذہب کیا باقی ہے، عیسائیت کیا باقی ہے، عیسائیت کے بارے میں قرآن کا "و لا الضّآلین" کہنا ایک معجزہ ہی ہے، یعنی وہ پٹری سے بالکل ہٹ چکی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس دین اسلام کے بارے میں فرمادیا ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾ اور اس کے ساتھ جو تائید ہے، جو قوی دلائل ہیں، جو سلامتِ فکر اور سلامتِ قلب ہے، اس کے ساتھ جو ذہین ترین انسانوں کی محنتیں اور غور وخوض کے نتائج ہیں، اور ان کا جو اخلاص ہے، اور ذہن سوزی ہے، وہ کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے۔

یہ وہ بات ہے جو ہمارے اور آپ کے استاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے بعض شاگردوں سے کہا، جیسا کہ مولانا اویس نگرامی صاحب نقل کرتے تھے، اور سید صاحبؒ سے ان کے استاذ مولانا شبلیؒ نے کہی تھی، بعض لوگ چمک دمک والی تحریر پڑھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلَى مَا فِيْ قَلْبِهٖ﴾ (۱)، اور شہیدوں کا مذاق اڑاتے ہیں، اور کہیں علمائے سلف کا مذاق اڑاتے ہیں، کہیں مفسرین ان کے تیر کا نشانہ بنتے ہیں۔

لہذا مسلک جمہور سے اپنے کو وابستہ رکھیے، اس کا بڑا فائدہ ہوگا، اللہ کی خاص عنایت ہوگی، اس کی نصرت وبرکت ہوگی، اور حسنِ خاتمہ بھی ہوگا۔

یہ باتیں ہیں جن کو شاید زیادہ مؤثر طریقہ سے نہ کہہ سکا، لیکن آپ انھیں حقائق سمجھیں، اور یہ مطالعہ اور تجربہ کا ماحصل ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان باتوں تک پہنچا ہوں، اور آپ تک بطور امانت اور وصیت منتقل کرتا ہوں۔

علم سے ہمیشہ اشتغال رکھیں!

اور آخری بات یہ ہے کہ علم سے اپنا اشتغال رکھیے، اپنے کو کبھی فارغ التحصیل نہ سمجھئے،

(۱) سورة البقرة: ٢٠٤

ہمیشہ نئی اور پرانی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیے، خواہ آپ کہیں رہیں، قرآن مجید کی تفسیریں، حدیث شریف کی شرحیں، تاریخ کی کتابیں، اور جو کتابیں علم کلام پر، اور صحیح عقائد کو پیش کرنے کے لیے صحیح طریقہ پر لکھی گئی ہیں، ان سب سے آپ کا ربط رہے، اور ان کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہیں، اور اپنے مرکز سے برابر تعلق قائم رکھیے۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ (۱)

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے فارغ ہونے والے طلبہ کے الوداعی جلسہ میں بتاریخ ۲۴ر فروری ۱۹۸۸ء بروز چہارشنبہ بعد نماز مغرب بمقام جمالیہ ہال میں کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۸ء)۔

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

رفقائے کرام، برادران عزیز اور دار العلوم کے رشتے سے فرزندان عزیز!

کسی نسبی، حقیقی اور طبعی ماں کے لیے، مادر مشفقہ کے لیے، اور کسی فکری اور تربیتی اور اصلاحی و تعلیمی مادر مشفقہ کے لیے یہ بات کوئی فخر کی اور خوشی کی نہیں ہے کہ وہ اپنے فرزندوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھے، اپنی گود میں بٹھائے رکھے، اور اپنے گھر سے نکلنے نہ دے، کسی حیثیت سے بھی وہ ماں قابل مبارکباد نہیں ہوگی کہ جس نے اپنے بچے کو خون جگر سے پالا، (خواہ وہ مادر نسبی ہو، اور خواہ مادر علمی ہو) وہ اپنے بچوں کو اپنے سے جدا نہ ہونے دے۔

آج کا دن بھی ایسا ہے کہ اس مادر علمی کو اپنے فرزندوں کو الوداع کہنے، معنوی معنی میں الوداع کہنے کا موقع مل رہا ہے، اگر چہ وہ ان شاء اللہ ابھی کچھ دن رہیں گے اور اس کے بعد بھی ان کا تعلق اور ان کا رابطہ یہاں سے قائم رہے گا، جیسا کہ ان ادبی اور انشا پردازانہ مضامین سے، اور ندوۃ العلماء کے سرپرستوں کے اسلوب اور زبان میں جو اظہار خیال کیا گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے۔

میں آپ کے سامنے دو ماؤں کی مثالیں رکھتا ہوں جنھوں نے اپنے فرزندوں کو جدا کیا، اور ان فرزندوں نے حق مادری نہیں، اور حق پدری نہیں، اور حق نسبی نہیں، بلکہ حق بندگی، حق وفاداری، حق شرافت اور حق ایمانی ادا کیا۔

حضرت خنساء کا واقعہ

ایک مثال جس پر بہت کم غور کیا گیا ہے، اس حیثیت سے اس کی اہمیت بہت کم محسوس

کی گئی ہے، تاریخ ادب کے مطالعہ میں اور دنیا کی ادبیات کے تقابلی مطالعہ میں، وہ حضرت خنساء کی ذات ہے، حضرت خنساء کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنے بھائیوں کی وفات پر ایسے دل دوز، جگر خراش مرثیے کہے، کہ جن کا میں اپنی محدود واقفیت کی بنا پر جو صرف تین چار زبانوں سے ہے، اور ان میں بھی مراتب ہیں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے لٹریچر میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، کہ فرزندوں کے مرثیے، اور دل بندوں کے مرثیے، جگر گوشوں کے مرثیے، بادشاہوں کے مرثیے تو بہت ہیں، لیکن بھائیوں کے، ایک ایک بھائی پر اس طرح رونا اور عمر بھر روتے رہنا، یہاں تک کہ یہ ان کا امتیاز بن گیا ہے کہ وہ مراثی کی بہت بڑی شاعرہ ہیں، جنھوں نے اپنی پوری قوت شاعری، ملکۂ شاعری صرف کر دی ہے اپنے بھائیوں کے مرثیہ میں، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

اور آپ سب (اللہ تعالیٰ آپ کے عزیز واقارب سب کو زندہ سلامت رکھے، اور آپ ان کے لیے قابل تسلی اور وہ آپ کے لیے قابل فخر ہوں) آپ بھائیوں اور فرزندوں کا فرق خوب سمجھتے ہیں، اس عمر میں بھی سمجھتے ہیں جو عمر اس کی زیادہ سمجھنے کی نہیں ہے، لیکن پھر بھی آپ اپنی فطرت سلیم سے سمجھتے ہیں، کہ بھائی کیسا ہی عزیز ہو، اور کیسا ہی وہ قابل فخر ہو، اور کیسا ہی وہ سرمایۂ حیات ہو، اور کیسا ہی بڑا محسن ہو، لیکن اس میں اور فرزند میں فرق ہوتا ہے۔

حضرت خنساء کا یہ امتیاز ہے کہ ساری عمر ان کی اپنے بھائیوں کا مرثیہ کہنے میں گزری، لیکن اس کا آپ مقابلہ کیجیے، اور میں اپنے ادنیٰ مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ ایسے مرثیے شاید کسی بھی زبان میں نہیں ملیں گے، جیسے کہ عربی زبان میں یہ مرثیے ہیں، اور وہ تاریخ ادب کا ایک اہم جزو اور عنصر ہے، لیکن یہ بات دیکھنے کی ہے کہ جب بیٹوں کا معاملہ آیا، فرزندوں کا معاملہ آیا، جو اُن کے جسم کے ٹکڑے تھے، آخری بات جو کہی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ اُن کے جسم کے ٹکڑے تھے، کہ ایک غزوہ کے موقع پر اُنھوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ایک ایک بیٹے کو رخصت کیا کہ جاؤ، اللہ کے راستے میں جہاد کرو، اور خبر آئی کہ وہ شہید ہو گیا، دوسرے بیٹے کو رخصت کیا، اور خبر آئی کہ وہ شہید ہو گیا، اور پھر تیسرے بیٹے کو، اور اس توقع نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ بھیجتی تھیں کہ وہ زندہ نہیں آئے گا، اور کہتی تھیں کہ بیٹا کوئی کوتاہی نہ کرنا، اللہ کی راہ

میں جان دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کو کئی فرزند عطا فرمائے تھے، جب سب بیٹوں کی شہادت کی خبر سنی تو یہ تاریخ ادب میں انھیں کے لفظوں میں اس بات کو محفوظ کر دیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَكْرَمَنِيْ بِشَهَادَتِهِمْ" "اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے عزت بخشی ان کی شہادت سے"۔

مادر علمی کی مثال

تو ایک مثال تو میں جسمانی اور طبعی اور فطری ماں کی دیتا ہوں، اور اسی کے ساتھ آپ مادر علمی یعنی مدارس دینیہ اور مربیان، سر پرستان علمی اور سر پرستان روحانی کے واقعات تاریخ میں دیکھیں گے، اور ہماری پوری تاریخ دعوت اس سے بھری ہوئی ہے، شروع سے لے کر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ماں کی شفقت رکھنے والے، بلکہ بعض اوقات ماں کی شفقت سے زیادہ شفقت رکھنے والے بزرگوں نے اپنے فرزندوں کو جدا کیا اور اس وصیت کے ساتھ جدا کیا کہ جو حدیث کے الفاظ ہیں: "أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَ أَمَانَتَكَ وَ خَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ" ، ان کو یہ وصیت کی کہ علم پھیلاؤ، دین کی حفاظت کرو، اور دین کے تقاضے جو ایک داعی کے لیے، اور دین کے ایک عالم و حامل کے لیے، اور ایک غیور مسلمان کے لیے اور ایک ایمان کی قدر و قیمت، اپنے ایمان کی بھی اور امت اسلامیہ کے ایمان کی بھی قدر و قیمت جاننے والے کا جو فریضہ ہے وہ ادا کرو، اس کی اتنی مثالیں ہیں کہ میں سب مثالیں نہیں دے سکتا، میں صرف دو مثالیں دوں گا، ہندوستان میں جن کو اس وقت کے حالات سے بہت زیادہ مطابقت ہے، اور میں ان کی مثالیں دے کر پھر بتاؤں گا کہ آج اس سعادت مندی کا، اس وفاداری کا، اور اس ایمان پروری کا، دین پروری کا، اور حمیت اسلامی کا تقاضا کیا ہے؟

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور فتنۂ اکبری کا مقابلہ

ایک حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی مثال دوں گا، اس جلسہ میں بھی برکت پیدا کرنے کے لیے اور قبولیت پیدا کرنے کے لیے، اور ان کا حق سمجھ کر، کہ حضرت مجدد الف

ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک اکیلی ذات تھی، پورا اکبری دربار تھا اور اس کے وسائل تھے، اس کے ذخائر تھے، اس کے لشکر تھے، اور لشکر صرف فوجوں کے نہیں، سپاہیوں کے نہیں، بلکہ ذہین انسانوں کے لشکر تھے، اور میں اپنے تاریخی مطالعہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس عہد کے بعض ذہین ترین انسان اس کو میسر آ گئے تھے، ملا مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی، اور پھر اس کے بعد ایران سے کئی ذہین لوگ، عبقری، جینئس قسم کے لوگ آ گئے تھے، جنہوں نے اکبر کی اس امیت اور اکبر کی اس عزیمت سے پورا فائدہ اٹھایا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جب اُمیت اور عزیمت دونوں جمع ہو جائیں، تو یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے، اس لیے کہ علم ہے جو جگہ جگہ عنان پکڑتا ہے اور روکتا ہے، اور یا پھر ضعف ارادہ ہے، ارادہ کی، عزم کی کمزوری ہے جو عناں گیر ہوتی ہے اور سدّ راہ ہوتی ہے، لیکن جہاں اُمیت، جہاں لاعلمی اور عزیمت دونوں جمع ہو جائیں اور پھر اس کے ساتھ اس کو ایسے لوگ مل جائیں جو اس کو فکری غذا بھی پہنچاتے ہوں، اور جواز بھی مہیا کرتے ہوں، اس کے جو نتائج ہیں، وہ تصور سے بالاتر ہوتے ہیں، اور یہ نازک ترین گھڑی ہوتی ہے۔

ایک طرف اکبر اپنی ان طاقتوں کے ساتھ تھا، کہ اس کو اس وقت کے جو مابہ الامتیاز اور قابل فخر علوم سمجھے جاتے تھے، ان کے ماہرین یعنی فلسفہ و منطق کے ماہرین اور ادب اور شاعری کے ماہرین کی ایک جماعت مل گئی تھی، اور پھر یہاں کا جو برہمن عنصر تھا، اور یہاں کا ذہین عنصر تھا، وہ بھی اس کے ساتھ تھا، بیربل اور دوسرے جو اس کے ارا کین تھے، یہ سب ایک طرف تھا، اور ایک اللہ کا بندہ جس کا نام احمد بن عبدالاحد السرہندی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہو اُن پر، اُن کی قبر مبارک پر، اُن کی روح مبارک پر، وہ تھے، انھوں نے اپنے فرزندوں کو، اور اپنے خلفاء کو تیار کیا اس فتنے کے مقابلے کے لیے۔

فتنہ کیا تھا؟ یہ وہ فتنہ تھا جس کا سمجھنا اس وقت دوسرے زمانوں کے مقابلے میں بہت آسان ہو گیا ہے، اور یہ بات کوئی خوشی کی نہیں ہے، مسرت کی نہیں ہے، بڑی ہی غم اور فکر کی

بات ہے کہ دور اکبری کا سمجھنا کسی اور زمانے میں اتنا آسان نہیں تھا جتنا اس زمانے میں، کہ جب اقتدار اور انتخاب کے ذریعے سے ملک کی سیاست و طاقت ان جماعتوں کے ہاتھ میں آرہی ہے، اور ان افراد کے ہاتھ میں آرہی ہے جو دور اکبری کا خواب دیکھ رہے ہیں، اور جن کے لیے دور اکبری کا خواب پورا کرنے کے زیادہ امکانات اور وسائل کو حاصل ہیں، مذہب کے رشتے سے بھی، اور ملک کے رشتے سے بھی، اور قدیم تاریخ کے حوالے سے بھی۔

وہ حضرت مجدد سرہندی ایک طرف ہیں، اور پورا اکبر کا دربار ایک طرف، اور اس میں بڑے مسلمان امراء بھی عبدالرحیم خان خاناں، اور سید فرید اور یہ حضرات بھی ہیں، جو بڑے گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں اور شریف ترین اور ذہین ترین انسان ہیں، اس وقت کوئی تقابل نہیں تھا۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے جو ہمارے ندوۃ العلماء کے بانیوں اور سرپرستوں میں ہیں، انھوں نے حیدرآباد کی تقریر میں ایک بات کہی اور بڑا نکتہ بتایا، اور پھر اس کی تشریح مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے اپنے اس مضمون میں کی جو حضرت مجدد صاحب پر لکھا ہے اور ''الفرقان'' میں چھپا ہے، کہ لوگ تاریخ پڑھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اکبر کے بعد جہانگیر آیا، اور جہانگیر اکبر سے بہتر تھا، آپ کو معلوم ہے کہ ایک زنجیر عدل اس نے لٹکائی تھی، اور جب اس نے کانگڑہ کا قلعہ فتح کیا تو وہاں سب سے پہلا کام جو کیا ہے، وہ یہ کہ مسجد بنانے کا حکم دیا، اور گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا، یہ بعد میں معلوم ہوگا کہ یہ بات کہاں سے آئی؟ تو اکبر کے بعد جہانگیر آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر ہے، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو تخت طاؤس پر بیٹھنے پر اتر جاتا ہے اور سجدہ کرتا ہے، اور دو رکعت نماز پڑھ کے کہتا ہے کہ فرعون بڑا اسبک سر اور بہت اوچھا آدمی تھا کہ آبنوس کے تخت پر بیٹھا اور اس نے خدائی کا دعویٰ کیا، لیکن میں امت محمدیہ کا فرد ہوں، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں، تو جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر ہے، اور شاہجہاں کے بعد پھر محی الدین اورنگ زیب آتا ہے جو کہ صحیح معنی میں محی الدین اورنگ زیب ہے، اور آپ تاریخ پڑھ سکتے ہیں۔

تو نواب صدر یار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ بد سے بدتر آتا ہے، اس لیے کہ وہ بد جو ہیں، اس کے اثرات ہوتے ہیں، اور پھر وہ جس حیثیت کا آدمی ہے، اور جو وسائل رکھتا ہے، اس کے مطابق اس کے اثرات پڑتے ہیں، تو اکبر اور اکبر کے اثرات کو، بلکہ اکبر کی جہانگیری کو، اس کی فتوحات کو، اور اس کی شہر کشائی کو، اور لشکر کشی کو دیکھیے کہ اس وقت سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ کے بعد سب سے طاقتور سلطنت اس وقت اکبر کی سلطنت تھی، پورے ایشیا میں نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام میں، اور سمجھئے کہ ایک حیثیت سے متمدن دنیا میں، تو اکبر کے بعد اس سے بدتر آدمی آنا چاہیے تھا، اس لیے کہ عام طور پر زمانہ انحطاط کی طرف چلتا ہے، اور برے اثرات کو قبول کرتا ہے، اور نشیب کی طرف جانا آسان ہوتا ہے، اور بلندی کی طرف جانا مشکل ہوتا ہے، کیا بات ہے کہ اکبر کے بعد جہانگیر آتا ہے جو اس سے بہتر، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں آتا ہے جو اس سے بہتر، اور شاہجہاں کے بعد محیی الدین اورنگ زیب آتا ہے جو اس سے کہیں بہتر، جس کو علی الطنطاوی کہتے ہیں کہ وہ سادس الخلفاء الراشدین ہیں، ان کو چھٹا خلیفۂ راشد ماننا چاہیے، اور پورا مضمون ہے بقیة الخلفاء الراشدین کے عنوان سے، جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ وہ خلفاء راشدین کا ایک نمونہ تھے، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد ایسی مثال ملنی مشکل ہے۔

تو نواب صدر یار جنگ نے کہا کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا یہ فطرت انسانی کے، تجربۂ انسانی کے، تاریخ انسانی کے، نفسیات انسانی کے خلاف ہو رہا ہے، کہ ایک غلط آدمی ہے، اور وہ پورے اپنے غلط ہونے کا سایہ پھیلاتا ہے، اور وہ بالکل ڈھالنا چاہتا ہے اس سانچہ میں، لیکن اس کے برخلاف ہوتا ہے کہ اس سے بہتر آدمی آتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اندر اندر ایسا انقلاب کیا کہ جو بعد میں آتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے، چنانچہ سب کو معلوم ہے محیی الدین اورنگ زیب ان میں سب سے بہتر تھا، اور اس کے حالات بالکل اولیاء اللہ کے سے ہیں، یعنی اس کے حالات کیا بیان کیے جائیں!، انتقال کے وقت اس نے وصیت کی کہ یہ ڈیڑھ روپے دو روپے جو ہیں یہ میرے کفن میں صرف کیے جائیں، اس سے زیادہ

میرے کفن میں صرف نہ کیا جائے، اس لیے کہ ٹوپی سی سی کر میں نے اس کی قیمت جمع کی ہے، اور باقی میرا جو ترکہ ہے اتنے سوا تنے ہزار کا، وہ میں نے قرآن شریف لکھ کر اس کو حاصل کیا تھا، وہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے، پھر روزے کی جو شان لکھی ہے سوانح نگاروں نے، اور میں اپنے والد صاحب کی کتاب کا حوالہ نہیں دوں گا، کہ بہر حال وہ عالم دین تھے، اور ان کے جذبات اور خاندانی اثرات تھے، لیکن منشی ذکاء اللہ صاحب اور پھر فاروقی صاحب کی کتاب جو انگریزی میں ہے، بہرائچ کے ایک وکیل تھے، سب سے بہتر کتاب ہے انگریزی میں، اور اس کے علاوہ ہمارے بشمبر ناتھ پانڈے صاحب، جو کل تک یہاں موجود تھے اور کل کے جلسے میں تھے، انھوں نے اپنی کتاب میں اورنگ زیب کا جو کیریکٹر دکھایا ہے، اس سب سے معلوم ہوتا ہے، یہ کیا بات ہے؟ یہ بالکل خرق عادت ہی ہے یا اس کو اتفاق پہ محمول کیا جائے؟ یہ حضرت مجدد صاحب کا اثر ہے کہ وہ اور ان کے تربیت یافتہ خلفاء اور سب سے بڑھ کر ان کے صاحب زادے حضرت خواجہ محمد معصوم، ان کی روحانیت، ان کا درد دل، ان کا سوز جگر، اور ان کی فکر اور دین سے ان کا عشق کام کر رہا تھا، کہ جو اب آتا تھا وہ پہلے سے بہتر ہوتا تھا، یہ حضرت مجدد صاحب کا میں ایک حوالہ دیتا ہوں۔

جہاں تک اورنگ زیب کا تعلق ہے، تو خیر وہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی سے بیعت تھے، انھوں نے خواجہ محمد معصوم کو بلانا چاہا، تو وہ تو کہاں آتے، انھوں نے اپنے صاحب زادے خواجہ سیف الدین کو بھیج دیا، وہ قصر سلطنت میں رہے، وہاں پہلے جاتے ہی وہاں کے ان منکرات کو دور کیا جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، اور پھر اپنے والد صاحب کو خط لکھا کہ بادشاہ میں آثار ذکر ظاہر ہو چکے ہیں، اور خود حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب دیکھیے جو بادشاہ کو لکھے ہیں، تو اس میں وہ ان کو شہزادۂ دیں پناہ لکھتے ہیں، جب وہ شہزادہ تھے، یہ ان کی فراست ایمانی اور ان کی روحانیت ہے کہ اس وقت جب اس کا کوئی امکان نہیں تھا، وہ لکھتے ہیں شہزادۂ دیں پناہ، وہ شہزادۂ دیں پناہ سلطان دین پناہ بن گیا، تو نواب صدر یار جنگ مرحوم نے فرمایا کہ لوگ نہیں دیکھتے کہ یہ کیوں ہو رہا تھا، یہ انحطاط کے بجائے ترقی کیوں ہو رہی تھی، بہتری کی طرف کیوں جا رہا تھا یہ خاندان مغلیہ؟ یہ اثر تھا حضرت مجدد الف ثانی کا۔

ایک ماں وہ تھی جس نے ایسے فرزند پیدا کیے، اور انھوں نے یہ کرامت دکھائی، اور یہ میں ایک اعجاز نہیں کہتا، معجزہ نہیں کہتا، لیکن یہ بالکل ایک خارق عادت چیز دکھائی، کہ تاریخ انسانی کے دفتر میں ایک نیا تجربہ ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور خدمت حدیث

اس کے بعد میں دوسرا نام لوں گا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا، اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت میں یہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور دوسرے مدارس جن میں دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم، اور اس کے ہم مسلک جتنی درسگاہیں ہیں، وہ سب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مدرسۂ فکر پر قائم ہوئے ہیں، سن لیں فضلاء جو جارہے ہیں کہ آپ اسی خاندان کے نونہال ہیں، آپ اسی شجرۂ طوبی کی شاخیں ہیں، اور پتے ہیں، آپ کو کبھی اس شجرۂ طوبی سے اپنا رشتہ نہیں توڑنا چاہیے، آپ کی سب سے بڑی کامیابی اور سعادت مندی اور آپ کی سعادت فرزندی یہ ہے کہ آپ اس شجرۂ طوبی سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی شاخ ہم سمجھتے ہیں کہ کم سے کم ہندوستان میں ہر صحیح العقیدہ، توحید خالص اور سنت سنیہ کی پیروی کرنے والے کے گھر میں ضرور ہوگی۔

اِس مادرِ علمی نے کیا کیا؟ مجھے معاف کیا جائے، میں یہ لفظ بولتا ہوں کہ اس سے زیادہ شفقت کا لفظ اور فطری تربیت کا لفظ اور جس کے لیے عربی میں بھی اُمومۃ سے بڑھ کر، حنانِ اُم سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے، اس ولی اللّٰہی درسگاہ اور مادر علمی نے کیا کیا، کہ حدیث تقریباً ہندستان سے ناپید ہو چکی تھی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی باہر سے حدیث لے کر آئے، لیکن وہ ان کے فرزندوں کے دائرہ میں محدود تھی، اور آپ اگر پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی کتاب جوان پر ہے، اس کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات کیا پڑے، ان کے اثرات پڑے، اور وہ بہت ہی قابل اعتراف اور قابل شکر ہیں، اور وہ مستحق دعا ہیں۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ حدیث کے درس کی عمومیت، حدیث کی تحقیق، حدیث کی

خدمت، اور صحاح ستہ کا درس، اور اس سے بڑھ کر سنت سنیہ کی اشاعت اور اس کی رغبت پیدا کرنا اور بدعات کے خلاف جہاد، اور بدعت کے خلاف محاذ آرائی، ایک پورا محاذ قائم کرنا، علمی محاذ، فکری محاذ، اعتقادی محاذ، عملی محاذ قائم کرنا، یہ فیض ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی درسگاہ کا۔

انھوں نے دہلی کے ایک محلّہ میں، ہم نے اس محلّہ کی زیارت کی ہے، اور اگر آپ والد ماجد مرحوم (رحمۃ اللہ علیہ) کا سفرنامہ ''دہلی اور اس کے اطراف'' پڑھیں، جو حضرت سید سلیمان ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے حواشی کے ساتھ 'معارف' میں سب سے پہلے شائع کیا، اور پھر اس کے بعد وہ انجمن ترقی اردو (دہلی) کی طرف سے شائع ہوا، اور اس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں، تو (اب تو مکان بھی معلوم نہیں اس کے نشان ہیں یا نہیں) دہلی کے غریبوں کے ایک محلّہ میں، ایک بالکل دُنیا کے سامان آرائش سے خالی، (محروم تو نہیں کہتا) ایک گوشہ میں ایک مکان تھا، وہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، اور وہیں حجة الله البالغة اور یہ کتابیں لکھی گئیں، یا کچھ سفر میں، اور وہاں صحاح ستہ کا درس دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے درس دیا، اس درس سے کیسے لوگ پیدا ہوئے؟ شاہ اسحاق صاحب محدث اور حضرت شاہ محمد یعقوب محدث، شاہ عبدالغنی محدث، جن کے تلمذ کا سلسلہ دیو بند تک پہنچتا ہے، اور حضرت مولانا علامہ حیدر علی رامپوری مقیم ٹونک اور ایسے بڑے محدث اور عالم پیدا ہوئے، پھر اس کے بعد اِن لوگوں نے وہاں حرمین شریفین میں جا کر، حجاز میں جا کر حدیث کا درس دیا، اور حدیث عام ہوئی۔

تو میں نے یہ مثالیں مادرِ علمی، مادرِ روحانی، مادرِ تربیتی کی دیں، ان کے کارنامے کو میں نے بیان کیا، ایسی کئی اور مادرِ علمی کی مثالیں دی جا سکتی ہیں، اور ایک خنساء کا واقعہ بیان کیا جنھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹوں کو میدان جنگ کے لیے رخصت کیا، یہ جانتے ہوئے کہ یہ شہادت زار ہے، یہاں آدمی اسی لیے جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں سر کٹائے، اور ان کی شہادت پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

آج کا فتنہ کیا ہے؟

اب میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کے لیے سعادت مندی کی بات، اور آپ کے لیے انتہائی شرافت کی بات، اور شکر گزاری کی بات، اور بلکہ خوش قسمتی اور بلند طالعی کی بات یہ ہے کہ آپ اس وقت یہاں سے نکلنے کے بعد اس وقت کے فتنے کو آپ سمجھیں، آج کیا ہے؟ میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے استیصال (اور جس کو عربی میں حــرکة الإبــادة کہتے ہیں)، یعنی ان کی معنوی، اعتقادی، تہذیبی، ثقافتی نسل کشی کا پور انقشہ تیار ہے، پورا منصوبہ تیار ہے، اور چونکہ مجھے دینی تعلیمی کونسل کی خدمت کا شرف حاصل ہے، اور شروع سے اس سے تعلق ہے، اور اس کے ذریعے سے بہت سی ایسی چیزوں پر نظر پڑ جاتی ہے جن پر عام لوگوں کی نظر نہیں پڑتی، کہ اس وقت بی جے پی کے پاس بھی، اور جو ہندو فرقہ پرست لیڈر ہیں اور جن کو اپنی قوم میں مقبولیت حاصل ہے، اور وسائل حاصل ہیں، امکانات بھی ان کے لیے آسان ہیں، ان کے پاس پور انقشہ بنا ہوا ہے کہ بہت ہی دل پہ پتھر رکھ کر اور بڑی اذیت کے احساس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اس ملک کو (اس سے زیادہ اور میں نہیں کہہ سکتا)، اس ملک کو اسپین بنا دینا چاہتے ہیں، یہ نقشہ بالکل تیار ہے، اس میں کسی قسم کا تردد اور ابہام نہیں ہے، فیصلہ شدہ بات ہے، اور اسی کے لیے سب یہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ بابری مسجد کی شہادت، اور ان کے اس وقت جو جذبات ہیں، اگر آپ ہندی کے اخبارات پڑھتے ہوں یا کم سے کم انگریزی ہی کے اخبارات پڑھتے ہوں، یا ان کے کسی جلسہ کی روداد آپ کو معلوم ہو، اور ان کی تقریروں کے اگر آپ خلاصے سن لیں، یا وہاں آپ شریک ہو سکیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس پر پورا اتفاق رائے ہو گیا ہے، پورا اجماع جیسے ہوتا ہے، کہ اس ملک میں اب یہ ایک نیا دور شروع ہوگا، اور اب یہاں مسلمانوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں، ان کو باہر چلا جانا چاہیے، اور اگر یہ رہیں تو اپنے ہر قسم کے ملی تشخص سے محروم نہیں، بلکہ بے زار ہو کر رہیں، ہر قسم کا تشخص جو ان کو ممتاز کرتا ہے غیر مسلموں سے، ان لوگوں سے جو مسلمان نہیں، ان سب خود دستبردار ہوں اور بے زار ہوں، اس کی تفصیلات میں میں جانا نہیں

چاہتا اور اس کی طبیعت متحمل بھی نہیں ہے، لیکن اس کی تفصیلات آتی رہتی ہیں، اور اندیشہ ہے کہ اور زیادہ آئیں۔

آج پورا ایک دورِ اکبری شروع ہو رہا ہے

تو اس وقت یہ ایک پورا دورِ اکبری شروع ہو رہا ہے، لیکن دورِ اکبری سے زیادہ اس کے پاس اسلحہ اور سہولتیں اور مقبولیت کے ذرائع ہیں، اور یہاں کی تاریخ اور یہاں کی سرزمین اور یہاں کے جو تاثرات اور جذبات ہیں، ان سے زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے، کہ اکبر نے تو ایک ایسی چیز شروع کی تھی جس کے لیے ملک پورے طور پر تیار نہیں تھا، لیکن اب صحافت کے ذریعے، ایڈمنسٹریشن کے ذریعے، لٹریچر کے ذریعے، اور سب سے بڑھ کر پھر سیاسی انتخابات و الکشن کے ذریعے ملک کو تیار کر دیا گیا ہے کہ یہاں کی اکثریت اس پر تلی ہوئی ہے کہ اس ملک سے اسلام کا اخراج کر دے، یا کم سے کم مسلمان اس ملک کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو جائیں، جن میں ذرا بھی دینی حمیت ہے۔

اب میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں، اور اپنے اوپر حق سمجھتا ہوں کہ آپ سے یہ کہوں کہ اس وقت آپ کے لیے، بغیر کسی معذرت کے کہتا ہوں، اور اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور الحمد للہ اپنے اور اپنے متعدد ساتھیوں کے عمل و کردار کے اعتماد پر بھی کہتا ہوں کہ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں، ایسی بات نہیں جو صرف خیالی ہے، اور جو صرف آپ سے کہی جارہی ہے، اور اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے کہ آپ کی کامیابی اس میں نہیں ہے، آپ کے حق فرزندی ادا کرنے کا یہ مظہر نہیں ہے کہ آپ یونیورسٹیوں میں جائیں، اور وہاں سے گریجویشن کریں، صاف صاف کہتا ہوں، میں انگریزی زبان کا مخالف نہیں، الحمد للہ انگریزی زبان سے واقف ہوں، انگریزی زبان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنی مجلسوں میں کہتا رہتا ہوں کہ تھوڑی سی انگریزی جاننی چاہیے، تا کہ آپ اسلامیات پر ایسا تقابلی مطالعہ پیش کر سکیں اور ان کتابوں کے حوالے دے سکیں، اور یہاں انگریزی نصاب درس میں داخل ہے، لیکن آپ اس کو مقصد بنائیں، آپ اس کو اپنی کامیابی کا معیار سمجھیں کہ آپ یونیورسٹیوں میں جائیں، اور بی.

اے، ایم.اے.کریں، اوراس کے بعد آپ کو کہیں لکچرر شپ مل جائے، کہیں اور آپ کو کوئی جگہ مل جائے، یہ آپ کی سعادت مندی اور حق فرزندی نہیں۔

یہ بھی صفائی سے کہتا ہوں کہ آپ کی سعادت مندی اور حق فرزندی یہ نہیں ہے کہ آپ خلیج عرب میں جائیں اور آپ وہاں نوکریاں تلاش کریں، جو آپ کو آسانی کے ساتھ مل سکتی ہیں اور آپ کے بہت سے بھائی، یہاں کے فضلاء وہاں ہیں، لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک چیز کے ذریعے بھی آپ یہاں کا حق نہیں ادا کرسکیں گے جس حق کا اظہار آپ نے بڑی بلاغت کے ساتھ، اور بڑی ادبیت کے ساتھ، اور بڑے اعادہ اور تکرار کے ساتھ اپنے قابل قدر مضامین میں کیا ہے، اور میں سنتا رہا ہوں کہ آپ نے اس دارالعلوم سے، اس کے اساتذہ سے، اپنے کس شریفانہ تعلق کا، اپنے فرزندانہ تعلق کا اور رابطہ کا اظہار کیا ہے، اس کا حق اس سے نہیں ادا ہوگا۔

اگر یہی کرنا تھا میرے عزیزو، پھر انگریزی پڑھتے اور آپ انگلینڈ اور امریکہ جاتے، اور وہاں بھی نوکریاں مل رہی ہیں اور ہمارے لاکھوں لاکھ پاکستانی ہندوستانی وہاں موجود ہیں، آپ نے عربی پڑھی، آپ نے قرآن، سب سے آخری چیز جو اللہ کا کلام پڑھا، اور پھر اس کو براہ راست اسی زبان میں جس زبان میں اترا تھا، اس میں سمجھنے کی اہلیت پیدا کی، اور آپ نے حدیث پڑھی، اللہ کے رسول کا محفوظ کلام پڑھا، اور پھر آپ نے یہاں رہ کر مجددین کے حالات، مصلحین کے حالات پڑھے، انھوں نے کیسے کیسے نازک زمانے میں ملکوں کو سنبھالا ہے، معاشرے کو سنبھالا ہے، اور بعض اوقات پورے پورے براعظم میں دین پھیلا دیا ہے، حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی کے خلفاء تھے، اس کا انگریز مؤرخین بھی اعتراف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ افریقہ میں جو اسلام پھیلا ہے، زیادہ تر قادری سلسلے کے مشائخ سے پھیلا ہے، ابھی انڈونیشیا، ملیشیا جو آپ کے قریب ہمسایہ ملک ہیں، یہاں اسلام کس کے ذریعے سے پھیلا؟ حضر موت کے سادات، اور حضر موت کے تجار اور یہ عرب کے ساحل کے قریب کے بسنے والے، وہاں گئے، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس کا ایک ثبوت بھی نہیں ہے کہ کوئی اسلامی لشکر انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ گیا ہو، اور وہاں اس کے ذریعہ سے اسلام پھیلا ہو،

نہکوئی اسلامی لشکر نہ چین گیا ہے اور نہ ہی یہاں ان ملکوں میں گیا ہے، جن کا میں نے ابھی نام لیا، جنوبی ایشیا کے یہ ملک ہیں، یہ ان مسلمان تاجروں اور سادات، اور طریقۂ غزالیہ کے شیوخ اور دوسرے شیوخ کے ذریعے سے مسلمان ہوئے۔

تحفظ دین کا عہد کیجیے!

تو آپ کی اس میں جو کچھ کہیے، کہ جیسے برّ بالوالدین ہوتا ہے، برّ بالمدرسۃ، برّ بالاساتذہ اور دین کی نعمت کی قدر دانی اور شکر گزاری یہ ہے کہ آپ یہ بات طے کرلیں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد اسلام کو اس ملک سے مٹنے نہیں دیں گے، اور ملت کو اپنے پورے تشخصات کے ساتھ، یہاں تک کہ آج لوگ کہتے ہیں، یہ کہنے لگے ہیں کہ پرسنل لا کے مسئلہ پر اتنا اڑنے کی کیا ضروت تھی؟ کیا تھا اگر ہوجاتا اور دائمی نفقہ ملتا؟ یہاں تک لوگ کہنے لگے ہیں، بعض ایسے لوگ جو صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن نہیں! اُمتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب تک کہ ان چیزوں پر آدمی نہ جمے جن میں تھوڑی بہت اجازت ہے ہٹنے کی، اس وقت تک ان چیزوں کی بھی حفاظت نہیں ہوسکتی جن کی پوری پوری حفاظت، کلّی حفاظت ضروی ہے۔

تو آپ یہاں سے ارادہ کرکے نکلیں، وقت ہوگیا ہے، میں زیادہ طول بھی نہیں دینا چاہتا، کہ اگر صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے اعتماد پر کہتا ہوں کہ اگر صرف یہ مجمع، یہاں سے نکلنے والے یہ فضلاء یہ طے کرلیں کہ ہم اپنی زندگیاں، اپنی توانائیاں، اپنی ذہانتیں، اپنی محنتیں سب اس پر صرف کردیں گے کہ یہاں سے اسلام باہر جانے پر مجبور نہ ہو، اور یہ اپنے پورے تشخص کے ساتھ رہے، اور اپنے علم دین کے ساتھ رہے، یہاں مدارس ہوں، مکاتب ہوں، اور قرآن وحدیث کی تعلیم ہوتی ہو، تو بالکل ممکن ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حالات میں انقلاب پیدا کردے، اور اس کا سہرا آپ کے سر بندھے، یا اس دارالعلوم کے بانی، اور دارالعلوم دیوبند کے بانی، میں ان سب کو کہتا ہوں، ان سب کو ایک کنبہ اور ایک خاندان سمجھتا ہوں، کہ ان کے بانیوں کو اس کا ثواب ملے گا، اور اب جو کچھ امید ہوسکتی ہے وہ ان مدارس کے فضلاء ہی سے

ہوسکتی ہے، باقی سب کا تجربہ ہو چکا، ہمارا اپنے رہنماؤں کا، اپنے مفکرین کا، اور اخبار نویسوں کا، مضمون نگاروں کا، سب کا تجربہ ہوگیا کہ اس پر ان میں وہ ثابت قدمی، اور وہ استقلال نہیں ہے جو ہونا چاہیے، جس کی اگر امید کی جاسکتی ہے تو مدارس عربیہ کے فضلاء سے۔

آپ اپنے طور پر اللہ سے عہد کریں، یہاں نہ کسی اعلان کی ضرورت ہے، اور نہ کسی اظہار کی ضرورت ہے، آپ اللہ سے دعا بھی کریں، اور اللہ سے عہد و پیمان بھی کریں کہ ہم ان شاء اللہ اس دین کے تحفظ کی پوری کوشش کریں گے، اور اپنی پوری صلاحیتیں اس پر لگادیں گے۔

رزق کا اللہ متکفل ہے

اور یہ میں آپ سے، اذان ہورہی ہے، اس اذان کی برکت وحرمت کے سایہ میں، اس کی آواز کے سایہ میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو فاقے سے نہیں رکھے گا، اور آپ کو دوسروں سے زیادہ عزت کے ساتھ کھلائے گا ان شاء اللہ، اور آپ کے دسترخوان پر وہ لوگ ہوں گے کہ جو رئیسوں کے دسترخوان پر نہیں ہوتے، ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے، مولانا مدنی کا دسترخوان دیکھا ہے، حضرت شیخ الحدیث کا دسترخوان دیکھا ہے، اپنے بزرگوں کے دسترخوان دیکھے ہیں، کیا کسی امیر کو نصیب ہوں گے ایسے معزز مہمان، اور ایسے کثیر التعداد مہمان، اور ایسے کثیر الانواع اطعمہ، کہ جو اُن کو نصیب تھے۔

تو آپ بالکل اطمینان رکھیے کہ رزق کا اللہ تعالیٰ متکفل ہے، اور اس کے لیے آپ اپنی یہ بضاعت، اپنا یہ سرمایہ جس کا آپ نے بڑے تفاخر کے ساتھ اور بڑے تشکر کے جذبہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کو آپ ان چھوٹی چھوٹی نوکریوں پر جو خلیج میں، سعودی عرب میں مل جاتی ہیں، یا یہاں جو آپ انگریزی پڑھ کر کے کہیں کسی کالج میں لگ جائیں، کسی اسکول میں آپ لگ جائیں، اس پر آپ اس کو قربان نہ کریں، اس کی قیمت صرف اللہ ادا کرسکتا ہے، اور اس کی قیمت صرف اللہ کے پاس ہے، اور وہ کیا ہے؟ ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (۱)

(۱) سورة التوبة: ۷۲

بس میں اس پر ختم کرتا ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق دے ہمارے ان عزیزوں کو، کہ ان میں سے جی تو چاہتا ہے کہ کل سو فیصدی، لیکن اس میں سے ان کی بیشتر تعداد، ان کی اکثریت اس بات کا عہد کرے کہ ہم انشاء اللہ اپنی ساری توانائیاں لگادیں گے دین کی حفاظت میں، اور ملت کے تشخص کی حفاظت میں، اور اس ملک کو اسپین نہیں بننے دیں گے، بلکہ ہوسکتا ہے ہم اللہ سے دعا کریں گے کہ یہاں اسلام کے قبول کرنے کا دروازہ کھلے، اور اس کے بھی آثار ہیں، میں آپ کو صاف بتادیتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ بالکل خارق عادت طریقے پر یہ بات ظاہر ہو، اس سلسلے میں اتنا عرض کردوں کہ میرے پاس خطوط آرہے ہیں اور اخبارات بھی کہ جن لوگوں نے بابری مسجد کو شہید کیا، اُن میں بڑی تعداد پاگل ہورہی ہے، اور پھر ان میں سے بہت سے وہ جو دعاؤں کے ذریعے پھر ٹھیک ہوگئے، تو وہ اسلام قبول کررہے ہیں، اس کے لیے اس کی بھی شہادتیں پیدا ہورہی ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے، اور اس کا جو دین سے تعلق ہے، اس کے لحاظ سے یہ بات کوئی بعید از قیاس نہیں ہے، اور ناممکن نہیں ہے، لیکن آپ ارادہ کریں اور اپنی زندگیوں کے متعلق فیصلہ کریں، پھر اللہ تعالیٰ ہر چیز کا متکفل ہے وهو خير الرازقين، و صلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا و نبينا محمد و على آله و صحبه أجمعين۔[1]

---

(۱) تعلیمی سال کے اختتام کے موقع پر ۲۵/ جنوری ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے قلمبند کی گئی۔ (مرتب)

وقت کا جہاد

ایک وصیت

فرزندانِ عزیز! میں اس مجلس کے لیے اور یہاں سے فارغ ہو کر جانے والوں کے لیے اس سے بہتر پیغام اور اپنے مطالعہ و معلومات اور اپنے علمی ذوق و جستجو میں اس سے بڑھ کر کوئی وصیت نہیں پاتا جس میں حضور اکرم (ﷺ) نے سفر پر جانے والے صحابہ کرامؓ سے فرمایہ تھا: ''أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ'' (میں اللہ کے حوالے کرتا ہوں تمہارا دین، اور تمہاری امانت، اور تمہارے خواتیم اعمال)۔

ان الفاظ میں 'امانت' کا لفظ ایسا ہے جس کے مفہوم کو ایک مفرد لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، ضمیر کی بیداری، احساس فرض، فرائض کی ادائیگی، اللہ تعالیٰ کا خوف، انسانوں سے محبت، احکام الٰہی کا احترام اور ان پر عمل، یہ سب مفاہیم اسی ایک لفظ میں شامل ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً﴾ (۱) (ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا)۔

دین، امانت اور حسن خاتمہ

عزیزو! میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان تینوں چیزوں کو گرہ میں باندھ لیجیے، بلکہ لوح

(۱) سورة الأحزاب: ۷۲

دل پر لکھ لیجیے: دین، امانت اور حسن خاتمہ۔ ان میں خواتیم اعمال کی ذمہ داری آپ پر اس طرح کی نہیں ہے جس طرح کی دین وامانت کی ذمہ داری آپ پر ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے کرنے کی چیز ہے، لیکن اس کے لیے بھی کچھ اسباب ہیں، کچھ صفات وخصوصیات ہیں جن کا آپ کے اندر ہونا ضروری ہے، وہ ہے آپ کا طرز عمل، آپ کا عقیدہ اور آپ کا عمل ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسن خاتمہ کا فیصلہ ہوگا، وہی حسن خاتمہ نصیب کرے گا، شرط یہ ہے کہ ان بنیادی صفات سے آپ متصف ہوں جن پر حسن خاتمہ کا انحصار ہے۔

عزیزو! میں صاف صاف آپ سے کہتا ہوں، اور اس میں کسی اشارے کنایے سے کام نہیں لیتا، کہ آپ نماز پنجگانہ کی پابندی کریں، نوافل وتسبیحات کو بھی ترک نہ کریں، تاکہ معلوم ہو کہ آپ کسی دینی درسگاہ سے پڑھ کر آئے ہیں، مسجد کی طرف جانے میں، بلکہ تمام کاموں میں ثواب کی نیت کریں، میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کی جو منزلیں اور جو امتحانات اور آزمائشیں آپ کو پیش آنے والی ہیں، اور یہ ملک، بلکہ ملت اسلامیہ جس راستہ سے گزر رہی ہے، پھر معاشی ذمہ داریاں، خاندان کی پرورش کا مسئلہ ہے، پھر جو اخلاقی بیماریاں اور امراض ہیں، وہ سب نماز کی ادائیگی میں فرق پیدا کر سکتے ہیں، اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا سکتے ہیں۔

مسلک ولی اللہی کو اپنا دستور العمل بنائیں!

مگر اس نماز سے بھی پہلے بنیادی اہمیت عقیدۂ توحید کی ہے کہ آپ کا عقیدہ خالص اور بے آمیز توحید کا عقیدہ ہو، اس سلسلہ میں مسلک ولی اللہی آپ کا معیار اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب 'تقویۃ الایمان' آپ کا دستور العمل ہو، اسی عقیدہ پر ہماری جماعت کی بنیاد پڑی ہے، اس دور میں کم سے کم ہندوستان بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیا اور پورے مشرق میں جو فکر سب سے زیادہ عمیق، اور علمی بنیادوں پر استوار اور اسلام کی کلی تعبیر اور صحیح تعبیر کے لحاظ سے، نیز سب سے زیادہ مفید، قابل عمل اور وقت کے اعتبار سے زندہ اور طاقتور بھی ہے، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی فکر اور ان کا مسلک ہے، شاہ ولی اللہ کے مسلک سے بہتر کوئی مسلک نہیں۔

آپ 'حجۃ اللہ البالغۃ' کا مطالعہ بھی کریں جس میں نظام عبادات کی مربوط تشریح کی

گئی ہے، ہماری کتاب 'تاریخ دعوت وعزیمت' کا وہ حصہ خاص طور پر پڑھیں جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متعلق ہے، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ فکر ولی اللہی سے بڑھ کر ترقی یافتہ، عالمانہ، محققانہ، حقیقت پسندانہ کوئی اور مکتب تجدید واصلاح اور مکتب دعوت نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ پورے عالم اسلام میں نہیں، پورے عالم اسلام میں اس کی نظیر نہیں، آپ اس مسلک کو اپنائیں اور اس کو دستور العمل بنائیں۔

زہد واستغناء

تیسری بات یہ ہے کہ آپ زہد واستغناء کی ایسی مثال قائم کریں کہ بڑی سے بڑی حکومت وسلطنت آپ کو نہ خرید سکے، اس دین کے اب تک باقی رہنے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ربانی وحقانی علماء کو آج تک کوئی خرید نہیں سکا، شیخ سعید حلبی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ جامع اموی میں بیٹھے درس دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں تکلیف تھی جس کی بنا پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھے کہ اتنے میں شام کا گورنر آیا جو بڑا سفاک اور جبار قسم کا حکمراں تھا اور معمولی بات پر گردن اڑا دیا کرتا تھا، شیخ اسی حالت میں درس دے رہے تھے کہ گورنر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا، وہ کچھ دیر تک حلقۂ درس کے پاس کھڑا دیکھتا رہا، شیخ بے نیازی سے اپنے کام میں مصروف تھے، یہ صورت حال دیکھ کر طلبہ نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ کہیں اس مجلس میں ہمارے شیخ کی گردن نہ اڑا دی جائے جس کے خون کے چھینٹے ہمارے کپڑوں پر پڑ جائیں، گورنر تھوڑی دیر کھڑا رہ کر واپس چلا گیا، اس نے وہاں سے اشرفیوں کا توڑا شیخ کو بھیجا کہ یہ قبول کرلیں، شیخ نے یہ توڑا یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ اپنے آقا سے سلام کہنا اور یہ کہنا کہ "جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا"، سَلِّمْ عَلَی مَوْلَاكَ وَ قُلْ لَهُ: مَنْ یَمُدُّ رِجْلَهُ لَا یَمُدُّ یَدَهُ!'۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ

اسی طرح کا ایک قصہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ہے، کہ ان کو سردیوں میں دھوپ

لینے کی ضرورت تھی، سڑک کے کنارے کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! ابھی بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، آپ پاؤں سمیٹ لیتے تو اچھا تھا، آپ نے یہ سن کر بڑا ابلیغ جملہ کہا: ''جو ہاتھ سمیٹ لیتا ہے، اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں''، یعنی بادشاہ کی مدد سے جو ہاتھ سمیٹ لے، اس کی کوئی مدد قبول نہ کرے، تو پھر اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں

آپ اپنے کو پوری طرح آزاد رکھیے، کسی حکومت کی سرپرستی اور کسی مالی سرچشمہ اور سرپرستی سے آزاد رہیے، اس وقت یہ عام ہوا چلی ہوئی ہے کہ عربی پڑھنے والے خلیجی ملکوں میں اور خاص طور پر سعودی عرب جاتے ہیں تاکہ بڑی نوکری تلاش کریں، میں بڑی صفائی سے کہتا ہوں کہ اس ملت کا سب سے بڑا فریضہ اور وقت کا جہاد یہ ہے -جس کی اللہ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہوگی- کہ آپ بلاد عربیہ دعوت دینے کے لیے جائیں، جہاں سے ہمیں ایمان کی دولت ملی، ان عربوں کو ان کا فریضہ یاد دلانے کے لیے جائیں، آپ کے عربی پڑھنے کی یہی قیمت ہے، الحمدللہ یہاں ایسا لٹریچر تیار ہو گیا ہے جس نے وہاں تک ہماری آواز پہنچائی، عرب قوم پرستی کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور آواز ندوۃ العلماء سے بلند ہوئی۔

عزیزو! آپ اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں، اور اپنے جسم کو بھی آزاد رکھیں، اس وقت بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، وہ خطرہ یہ ہے کہ اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہوں کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی جارہی ہے کہ انہیں حکومت کے خزانے سے تنخواہیں اور تمام سہولتیں دی جائیں، اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اماموں سے الیکشن کے موقع پر کام لیا جائے گا، مسلم پرسنل لا بورڈ کے خلاف کام لیا جائے گا، اس لیے کہ جب مساجد محکمۂ اوقاف کے ماتحت ہوں گی، اور وہ سرکاری ملازم قرار پائیں گے، تو ایسے ائمہ مساجد کے منبروں سے آزادی کے ساتھ دین کی بات نہیں کہہ سکیں گے، اس لیے آپ اپنے دین کی حفاظت کیجیے، عقائد کے لحاظ سے بھی، اور اعمال کے لحاظ سے بھی، حقوق کے لحاظ سے بھی، اور فرائض کے اعتبار سے بھی۔

اصلاح معاشرہ اور آپ کی ذمہ داریاں

أَمَـانَتَكَ کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی طرف سے، اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے آپ پر کیا ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، ملت کن خطرات سے گزر رہی ہے، کس وادی پرخار سے وہ گزر رہی ہے، آج مسلم پرسنل لا بورڈ کو مٹانے کی کیسی کیسی کوششیں کی جارہی ہیں، مشرکانہ تعلیم کے ذریعہ، جبری طور پر نئی نسل کو کس طرح نئے سانچے میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش ہورہی ہے، اور یہ منصوبہ ہر جگہ تیار ہے کہ مسلمان صرف نام کے باقی رہیں، باقی ان کی تمام خصوصیتیں ختم ہوجائیں، اس ملک کو اسپین بنانے کی زبردست سازش کی جارہی ہے۔

آپ کو اصلاح معاشرہ کا کام بھی کرنا ہے، کہ یہ بھی (دِيْـنَـكُـمْ) میں شامل ہے، اس وقت جاہلی رسوم ورواج وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ دولت پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ معمولی چیز کی خاطر جانیں لی جارہی ہیں، آپ کو اس کے خلاف بھی مہم چلانی ہے، بلکہ اس مہم کی پوری ذمہ داری آپ کو قبول کرنی ہے، پھر ثقافتی اور فکری لحاظ سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آپ کو حفاظت کرنی ہے، رسم الخط اور کلچر کے لحاظ سے بھی اور زبان کے اعتبار سے بھی، اگر آپ قربانیاں دیں گے، زہد واستغناء سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا، یہ ملت اپنے تشخصات کے ساتھ باقی رہے گی۔

حفاظت دین کا وعدہ

اور یہ دین باقی رہنے ہی کے لیے آیا ہے، اس وقت یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، بودھ ازم، یہ تمام ادیان و مذاہب نہ صرف بدل گئے، بلکہ ان کی اصل شکل ایسی بگڑ گئی کہ ان کو پہچاننا ناممکن ہوگیا ہے، پھر ان مذاہب وادیان میں طویل عرصہ سے اصلاح وتجدید کی کوئی تحریک نہیں اٹھی، اسی وجہ سے یہ سب مٹ گئے، صرف اسلام اپنی اصل شکل میں روح کے ساتھ باقی ہے، عقائد سے لے کر فرائض تک، سنن سے لے کر مستحبات تک، اخلاق سے لے کر معاملات اور اور تہذیب تک سب باقی ہے، قرآن باقی ہے اور اس کی زبان باقی ہے، اس

کے ایک ایک حرف بلکہ حرکات وسکنات تک باقی ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بقا کی ذمہ داری لی ہے اور فرمایا کہ اسلام ایک مکمل اور پسندیدہ دین ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾[1] (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے)، اور ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً﴾[2] (آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مجددین اور مصلحین کا تسلسل ہے جو اس امت کی تاریخ میں کبھی ٹوٹنے نہیں پایا، یہ واحد دین ہے جس میں کوئی صدی اور کوئی ملک خالی نہیں رہا، اگرچہ اس کا پورا استیعاب نہیں کیا گیا لیکن ہندوستان کی حد تک استیعاب سے کام لیا گیا ہے، ہماری کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں دوسرے ملکوں کے مجددین کا بھی ذکر ہے۔

علم کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا

آخر میں آپ سے کہوں گا کہ اپنے ادارے سے تعلق رکھیے، بہت سے لوگ ہیں جو فارغ ہونے کے بعد یہاں آئے بھی نہیں، اس کا منہ نہیں دیکھا، اور نہ معلوم کیا کہ اس پر کیا گزری اور گزر رہی ہے۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اپنا مطالعہ جاری رکھیے، کہ علم کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، علم برابر تازہ ہوتا رہتا ہے، اس میں ترقی بھی ہے، تغیر بھی ہے، پھیلاؤ بھی ہے، یہاں کے ترجمان 'البعث الإسلامي'، 'الرائد' اور 'تعمیر حیات' کا مطالعہ کیجیے، 'دارالمصنفین' اور 'مجلس تحقیقات ونشریات اسلام' نے ماشاء اللہ اچھا خاصا لٹریچر تیار کر دیا ہے، آپ ان کو پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں۔

ندوۃ العلماء کے قیام میں وقت اور نبض شناسی اور ملت کی حاجت جیسے محرکات شامل ہیں، یہی محرکات تھے جنھوں نے عالم ربانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے دل میں تحریک پیدا کی،

(۱) سورۃ آل عمران:۱۹ (۲) سورۃ المائدۃ:۳

چونکہ وہ عیسائیت کے رد میں مناظرے بھی کرتے تھے، اس سے ان کو اندازہ ہوا کہ انگریزی زبان سے اور انگریزی مصنفین کے اسالیب سے واقفیت ضروری ہے، چونکہ مستشرقین ایک خاص مقصد کے لیے کام کر رہے تھے، اور بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کر رہے تھے، اس لیے کہ وہی طبقہ اقتدار میں آتا ہے، بلاد عربیہ میں اس وقت وہی طبقہ برسر اقتدار ہے جو یورپ و امریکہ کا تعلیم یافتہ ہے، اس لیے ایسی صورت میں ہمیں اس کی خاص طور سے تیاری کرنی ہوگی کہ ایسا لٹریچر تیار کریں جو تعلیم یافتہ ذہنوں کو متاثر کرے، اور اسلام کی ہر دور میں انسانی قیادت کی صلاحیت پر ایمان ان کے دل و دماغ میں راسخ کرے، اس طبقہ کو مطمئن کرنے کی تیاری بھی آپ کے ذمہ ہے، حالات اور رجحانات کا برابر محاسبہ کرتے رہنا بھی ندوی فضلاء کی ذمہ داری ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طبقہ کون سی زبان سمجھتا ہے، کون سے دلائل اس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں، کس اسلوب میں اس سے گفتگو کرنی چاہیے۔

اس مجلس میں جن عزیزوں نے اپنے تأثراتی مقالے عربی اور اردو میں پیش کیے اور تقریریں کی گئیں، وہ ہماری توقع سے بڑھ کر تھیں، امید ہے کہ استعداد نہ صرف قائم رہی گی، بلکہ مزید ترقی کرے گی۔ (۱)

---

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے سامنے ۸ دسمبر ۱۹۹۶ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا عبد المقیت قاضیا ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۶ء)۔

فارغین ندوہ کی ذمہ داریاں

برادران گرامی قدر اور عزیز فرزندانِ دارالعلوم ندوۃ العلماء!

عرصہ سے یہ خیال دل میں آرہا تھا کہ آپ سے غائبانہ باتیں کروں، غائبانہ اس لیے کہ آپ اتنے شہروں بلکہ دور دور ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں کہ سب کا جمع ہونا ناممکن ہے، آپ میں کچھ ایسے حضرات ہوں گے جن کو دارالعلوم چھوڑے ہوئے چالیس پچاس سال ہو چکے ہوں گے، کچھ کو دوبارہ دارالعلوم آنے اور دیکھنے کا موقع ملا ہوگا، کچھ کو نہیں، دارالعلوم چھوڑے ہوئے جو مدت بھی گزری ہو، لیکن طالب علمی کے زمانے کی باتیں اور یادیں اب بھی طالب علم ہی بن کر سامنے آتی ہوں گی، اور طالب علمانہ شوخیوں اور شرارتوں، باہمی نوک جھونک، کھیل کود بلکہ اچھل کود، بحث ومباحثہ، مطالعہ و مذاکرہ، 'الاصلاح' کے اسٹیج پر تقریری مقابلے اور ہماہمی، دارالاقامہ کا ایک خاص ماحول اور درجوں میں آنے جانے کے مناظر سبھی کچھ نگاہوں میں اسی طرح پھر رہے ہوں گے جیسے ابھی کل کی بات ہے۔

جو جانے کے بعد اب تک نہ آسکے، ان کے تصور وخیال میں دارالعلوم اپنے ظاہر میں پودہ ہی نظر آرہا ہوگا جو اب تک ایک تناور درخت بن چکا ہے، اور معنوی اعتبار سے عرب وعجم میں اس کا چرچا ہے، اس کا نام ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، آپ جب یہاں رہے ہوں گے تو آپ کو کچھ شکایتیں بھی رہی ہوں گی جو طبعی بات ہے، ایسی کہ گھر اور خاندان کے بہت محدود ماحول میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے، لیکن گھر بہرحال اپنا گھر ہوتا ہے، اس کے نقوش ذہنوں سے محو نہیں ہوتے، اور نہ ہی اپنے گھر سے کسی ذی شعور کو بیر ہوتا ہے، آپ اپنے مادرِ علمی سے نکل کر دنیا کے مختلف ملکوں، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیل گئے ہیں، آپ

امریکہ میں بھی ہیں، برطانیہ میں بھی، آپ ترکی وافریقہ میں بھی ہیں اور مصر وحجاز میں بھی، خلیج و امارات میں بھی ہیں، انڈونیشیا وملیشیا میں اور نیپال و پاکستان میں بھی، آپ یونیورسٹی اور کالجوں میں بھی ہیں اور مدارس ومکاتب میں بھی، آپ میں سے کچھ مختلف ملکوں میں مسجدوں کے خطیب وامام بھی ہیں، آپ میں مصنف ومؤلف بھی ہیں جو ذہنوں کی تشکیل اور اسلام کی وکالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، کسی ادارہ کے لیے یہ بڑے شرف کی بات ہے کہ اس کے ہونہار سپوت زندگی کے مختلف حساس شعبوں میں اس طرح کام کر رہے ہوں۔

آپ نے دار العلوم میں رہ کر ندوۃ العلماء کے معتدل ومتوازن فکر پر بارہا تقریریں کی اور سنی ہوں گی، لیکن اب جبکہ آپ زندگی کے میدان میں ہیں، اس معتدل اور متوازن فکر سے کتنا کام لے رہے ہیں، اس پر غور کرنا چاہیے، اس کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ اس فکر پر حالات اور ماحول کا گرد وغبار تو نہیں پڑ گیا ہے، اور اسی کے ساتھ اس کو تازہ کرنے کے لیے اپنے مادر علمی سے ایک فرزند صالح کی طرح تعلق ورابطہ رکھنا چاہیے، اور یہاں کے پیغام ولٹریچر کو دوسروں تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے، کہ اس کی ضرورت آج کل سے بھی زیادہ ہے، اور جتنا زمانہ آگے بڑھتا جائے گا ندوۃ العلماء کے مسلک اور اسلوبِ دعوت کی ضرورت بڑھتی جائے گی ، ذہن میں تازہ رکھنے کے لیے ندوۃ العلماء کے مسلک کو ہم پھر سے دہراتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کا مسلک

’’دین وعقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کی فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف وشفاف سرچشموں سے استفادہ، اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال اور اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر ومغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے

قائم رہنے، احکام شریعہ پر عمل، حقیقت دین اور روح دین سے زیادہ قربت اور تقوی اور اصلاح پر ہے۔

تصور تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت اور درس گاہِ رسالت میں تربیت پائی، اور قرآن وایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلے، سب سے زیادہ مثالی اور قابلِ تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت ونجات اور فلاح وکامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں، اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم وفلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذاتِ خود ایک اکائی ہے، جو قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی، اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ صحیح اور غلط، مفید اور مضر، اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

استفادہ اور افادہ اور ترک وقبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ ''حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے''، نیز قدیم حکیمانہ اصول ''خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ'' پر، (یعنی جو صاف ونظیف ہو، اس کو لے لو، اور جو آلودہ اور کثیف ہو، اس کو چھوڑ دو)۔

اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی بددین قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے کہ ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾ [1] (ان کے مقابلے کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے، تیار کرو)۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن اور فضائل کی تشریح، اور ذہن وعقل کو اس کی حقانیت و صداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس نبوی حکیمانہ وصیت پر ہے کہ ''كَلِّمُوا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عقولِهِم، أتريدون أن يُكَذَّبَ اللّٰهُ و رسولُهُ؟ '' (لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے؟)۔

عقائد واصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی اور سلف کے آراء اور

---

(۱) سورة الأنفال: ٦٠

تحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی وفقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک واصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے، اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے، اور ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحتِ اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی وفکری اور کلامی وفقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستانِ فکر اور مکتب خیال ہے''۔

آپ کی ذمہ داریاں

ہماری خواہش وتمنا یہ رہتی ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں، اپنے مرکز اصلی اور مادر علمی سے برابر رابطہ قائم رکھیں، اس کے حالات وضرورتوں سے باخبر رہیں، یہاں سے نکلنے والے اخبار ورسائل کا مطالعہ ضرور کرتے رہیں کہ یہ رابطہ کا ایک مناسب ترین ذریعہ بھی ہے، اور اس سے ندوۃ العلماء کا کام وپیغام بھی تازہ ہوتا رہے گا، ندوۃ العلماء حالات وخطرات کا جس طرح مقابلہ کرتا ہے، فکر اسلامی کو نمایاں اور واضح کرتا ہے، اٹھنے والے ہر نئے فتنے کا بلاخوف لومۃ لائم جس طرح مقابلہ کرتا ہے، اس کا نہ صرف یہ کہ آپ کو علم ہوتا رہے گا، بلکہ اس سے آپ کی بجھی اور دبی ہوئی امنگوں میں حرارت وزندگی بھی پیدا ہوگی، جس کو زندگی کی ہنگامہ خیزی متاثر کرتی رہتی ہے۔

اس وقت دنیا میں اسلام ومسلمانوں کے خلاف جو تند وتیز ہوائیں چل رہی ہیں، اس سے آپ بخوبی واقف ہیں، ایسے میں آپ جہاں کہیں بھی رہیں اپنی بساط بھر پور 'ندویت' کی ذمہ داری کو نبھایئے، اور اپنے مادرِ علمی کے دودھ کا حق ادا کیجیے۔

کیا اچھا ہوتا کہ آپ جہاں کہیں بھی ہیں، اور جو کچھ بھی ہیں، اس سے اپنے مادرِ علمی کو باخبر کریں، اور مشورہ کی ضرورت ہو تو مشورہ لیں، خود آپ سے وقت ضرورت پر اس علاقہ سے

متعلق، وہاں کے حالات سے متعلق مشورہ لیا جا سکے، جہاں آپ رہتے ہیں۔

اس امید کے ساتھ آپ کو یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں کہ آپ مادرِ علمی سے ایک عرصۂ دراز سے بے تعلق رہنے کے حجابات کو ختم کر کے اپنے ربط و تعلق کی تجدید کریں گے، اور اس پر خوب غور کریں گے کہ موجودہ حالات میں جہاں صرف مال و جاہ کی ریس ہے، ایک عالمِ دین کی حیثیت سے، اپنے سر پر وراثتِ نبوت کا تاج رکھنے کی حیثیت سے، آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب [1]

---

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیرِ حیات"، لکھنؤ، (شمارہ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۱ء و ۱۰/ جنوری ۱۹۹۴ء)۔

علم کا بھی ایک قانون ہے

صحیح راہ کی ضرورت

میرے عزیزو اور بھائیو! آپ کو شاید معلوم ہو یا نہ معلوم ہو، جو لوگ تفسیر پڑھتے ہیں اور ان کی تفسیر کی کتاب شروع ہو چکی ہے، یا کم سے کم سورہ بقرہ اور اس کا ترجمہ اور تفسیر انہوں نے پڑھی ہے، وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت میں جو لوگ حج کو نکلتے تھے ان کا ایک عرف اور ضابطہ یہ بن گیا تھا جو خود ساختہ تھا، شریعت میں نہیں تھا، لیکن انہوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی تھی کہ جب تک حج سے فارغ نہ ہوں، حج کے ارکان میں مشغول ہوں، اس دوران اگر گھر آنے کی ضرورت ہو، کوئی بات کہنی کی ضرورت ہو تو گھر کے دروازے سے نہ آئیں، کہ ابھی تو اللہ کے گھر سے ہو کر نہیں آئے تو اپنے گھر میں قاعدے سے کیسے داخل ہوں، تو چھتوں پر سے یا دیواروں کی طرف سے، ﴿مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ پشت سے وہ گھر میں آیا کرتے تھے، اور اس کو وہ بڑی نیکی کا کام سمجھتے تھے کہ اس میں بیت اللہ کا ادب واحترام ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ [۱]، یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ، ﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى، وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ گھروں میں گھروں کے دروازوں سے آؤ، یہی قاعدہ ہے، اور یہی عقلِ سلیم اور ذوقِ سلیم کی بات ہے، اور قانونِ قدرت ہے کہ جس چیز کا جو مدخل ہے، اس سے آدمی آئے، قرآن مجید تو پوری زندگی کی کتاب اور پوری زندگی کے لیے کتاب ہدایت ہے، ہر طبقہ کے لیے، ہر مشغلہ، ہر میدان اور ہر مرحلہ کے لیے وہ ایک دستور العمل اور ہدایت نامہ کا کام دیتا ہے۔

(۱) سورة البقرة:۱۸۹

قرآن کے دو بڑے اہم لفظ

قرآن کے یہ دو لفظ بڑے اہم ہیں: ﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ یہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اس میں پوری زندگی کی حکمت بتا دی گئی، یہ صرف گھر کا معاملہ نہیں، ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ جو اس کا دروازہ ہے اس دروازہ سے آنا چاہیے، اگر کوئی شخص پیشہ سیکھنا چاہے، کوئی صنعت سیکھنا چاہے، لیکن صنعت کے استاذوں سے نہ سیکھے، اور صنعت کے آداب کا خیال نہ کرے، اور صنعت کے اوزار مہیا نہ کرے، اور تدریج کے ساتھ درجہ بدرجہ مرحلہ وار اس کو نہ سیکھے، اور یہاں تک کہ ان کی وردی استعمال نہ کرے، لوہاروں کی ایک وردی ہے، اور سقاؤں کی ایک وردی ہے، سپاہیوں کی ایک وردی ہے، اور ڈاکٹروں کی ایک وردی ہے، تو وہ وردی تک بعض اوقات ضروری ہوتی ہے، ورنہ وہ اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہوگا، اس کو پیشہ نہیں آئے گا، تو جب یہ معمولی چیزوں کا حال ہے، اگر کوئی کہتا ہے کہ فضول باتیں ہیں، ہمیں لوہاری کا فن سیکھنا ہے، یا ہمیں فوج میں بھرتی ہونا ہے، لیکن وردی کا جھگڑا ہم مول نہیں لیتے، یہ پہنو وہ نہ پہنو، اور صاحب! لیفٹ رائٹ (Left Right) فضول بات ہے، ہم اپنی ذہانت سے کام لیں گے، ہم دوسرا طرز ایجاد کریں گے، وہ یوں ہی رہ جائے گا، اچھا سپاہی بن نہیں سکتا، نجار (Carpenter) نہیں بن سکتا، اس کے لیے بھی ﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ کی ضرورت ہے، جو اس کا دروازہ ہے ادھر ہی سے آؤ۔

یہ دین و دنیا سب پر حاوی ہے

یہ ﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ ساری زندگی، دین و دنیا سب پر حاوی ہے کہ فطرت انسانی نے سالوں سال کے تجربہ سے جو اصول مقرر کیے ہیں، اور جو اس کے مداخل اور مخارج ہیں، اگر کوئی شخص اس کا پابند نہ ہو، ان کا کوئی احترام نہ کرے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔

ایک شخص کہے کہ حروف تہجی کا جھگڑا عجیب ہے، ا، ب، ت کا کون جھگڑا مول لے کہ پہلے الف، ب، ت پڑھے، ہم براہ راست پڑھنا شروع کردیتے ہیں، تو وہ کتنا ہی ذہین ہو

کبھی اس کو پڑھنا نہیں آئے گا، جو الف، ب، ت نہیں پہچانتا، یا A, B, C, D, نہیں پہچانتا، وہ کبھی ایک سیکنڈ نہیں بول سکتا، آپ کسی وقت بھی تجربہ کرکے دیکھیے کہ آپ کے زمانے کا کوئی بقراط سقراط ہو جو پڑھا ہوا نہ ہو، خواندہ نہ ہو، آپ اس کو ایک کتاب دیجیے، اردو کی دیجیے، یا انگریزی کی دیجیے، یا عربی کی دیجیے، یا یہیں کی کنڑ زبان کی دے دیجیے، اور کہیے کہ رات بھر نہیں، آپ کو ایک مہینہ کی مہلت دی جاتی ہے، آپ کے پاس کوئی دوسرا آدمی نہیں جائے گا، یہ کتاب ہے اور آپ ہیں، ہم آپ کو کمرے میں بند کر دیتے ہیں، تالہ لگا دیتے ہیں، کھانے پینے کا سب سامان کھڑکی سے ہم پہنچاتے ہیں، اور وہاں پہلے سے زندگی کی سب ضروریات موجود ہیں، ایک مہینہ نہیں چھ مہینے آپ اس میں رہیے اور یہ صفحہ حل کر دیجیے، اس صفحہ کو آپ پڑھ دیجیے، اور اس نے حرف تہجی نہیں پڑھی، تو آپ یقین مانیے کہ جب وہ نکلے گا تو ویسے ہی جاہل ہوگا جیسے وہ داخل ہوا تھا، اس لیے کہ ﴿ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ﴾ پر اس نے عمل نہیں کیا۔

ہر علم اور فن کا ایک قانون ہے

حرف تہجی بڑے حقیر ہیں، کیا حقیقت ہے؟ ا، ب، ت بچوں کو پڑھایا جاتا ہے، لیکن بڑے بڑے علامہ امام غزالیؒ، امام رازیؒ بھی محتاج تھے کہ پہلے حروف تہجی پڑھیں پھر احیاء علوم الدین اور تفسیر رازی تک پہنچیں، وہ احیاء علوم الدین اور تفسیر رازی تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے اگر انہوں نے حروف تہجی نہ پڑھے ہوتے، ایسے ہی ہر فن کا، ہر علم کا، ہر شعبہ کا ایک قانون ہے، اس قانون پر چلنا ہوگا، جہاں تک مجرد علم کا تعلق ہے تو بہت سی چیزیں اس میں مشترک ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری دنیا الگ ہے ان کی دنیا الگ، لیکن آپ دیکھیں گے تو زیادہ حصہ دنیاوی اور دینی تعلیم میں مشترک ہے، مثلاً درجہ بدرجہ پڑھنا، استاد سے پڑھنا، محنت کرنا، استاد کا احترام کرنا۔

یورپ میں استاد اور شاگرد

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یورپ وغیرہ میں استادوں کا کوئی احترام کرنا نہیں جانتا، یہ آپ یہاں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں پر قیاس نہ کیجیے گا، یہ نہ تو مشرق کے ہیں اور نہ مغرب

کے، اور نہ دنیا کے اور نہ دین کے، یہ تو کچھ نہیں، یہ تو خودرو ہیں، جنگلی درخت ہیں، میں یورپ گیا ہوں، میں نے وہاں کی یونیورسٹیاں دیکھیں، مجھے تو حیرت ہوگئی کہ میں کیمبرج، آکسفورڈ گیا، ضرورت کے لیے بتاتا ہوں آپ کو کہ وہاں معلوم ہوا کہ وہاں اب تک Tutorial System جاری ہے، ایک استاد کو اتالیق بنا لینا، جب آپ کسی آفس میں چلے جائیں اور آپ داخلہ کرائیں بی.اے. اور ایم.اے. میں، تو آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کس استاذ کا انتخاب کرتے ہیں؟ آپ کا مشیر کون ہوگا؟ تو بتانا پڑتا ہے کہ فلاں استاد، فلاں پروفیسر کی نگرانی میں اور اس کے مشورہ سے علم حاصل کرنا ہے۔

پھر اس پروفیسر سے بالکل ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسے مرید و پیر کا تعلق ہے، یعنی طالب علم اس کے مشورے سے کتابیں پڑھتا ہے، کتابیں پڑھ کر نوٹس اس کو دکھاتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ طالب علم کتاب کی صحیح اہمیت سمجھتا ہے، اور اس کا جو اصل مغز، لب لباب ہے، اس کو لے رہا ہے، پھر اس کے بعد مضمون اس کو تیار کرنا پڑتا ہے، وہ بالکل اس سے ایسا وابستہ ہو جاتا ہے جیسے پہلے ہمارے مدارس میں تھا کہ ہر استاد کے ساتھ چند طلبہ ہوتے تھے کہ جو اساتذہ سے بالکل مربوط ہو جاتے تھے، اور شعراء تک کا یہ حال تھا کہ ان کے راویہ ہوتے تھے، چنانچہ تاریخ ادب میں آتا ہے کہ فلاں فلاں کا راویہ تھا، یعنی اس کے اشعار کو اخذ کرنے والا، یاد کر لینے والا، سنانے والا۔

ویسے ہی ہمارے زمانے تک طالب علم استادوں میں تقسیم ہو جاتے تھے، چار طالب علم ایک استاد کے ساتھ لگ گئے ہیں، خادم بھی ہیں، وہ اس کی خدمت بھی کر رہے ہیں، چائے بنانی ہو تو چائے بنائیں گے، اس کے آرام کا خیال کریں گے، بازار سے اس کی چیزیں لائیں گے، اور ہمارے یہاں تو یہ بھی تھا کہ اس کا حساب کتاب بھی دے دیں گے، وہ اس کے بعد جو کچھ لکھوائے گا اس کو لکھیں گے، وہ جو مواد نکلوائے گا اس کو نکالیں گے، ہم سب لوگوں نے ایسے ہی پڑھا، تو معلوم ہوا کہ یہ سسٹم آج تک وہاں کی اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیوں میں رائج ہے، اس کے بغیر وہ طالب علموں کو گویا قبول نہیں کرتے، پہلے بتانا پڑتا ہے کہ تمہارا Tutor کون ہے؟ یعنی تمہارا خاص استاد کون ہے جس کے ساتھ تم وابستہ ہوگے اور اس کے مشوروں پر چلو گے؟

علم دین کا امتیاز

یہی ہمارے علم کا حال ہے، کچھ چیزیں تو مشترک ہیں، لیکن پھر اس کے بعد ایک سرحد ایسی آتی ہے، ایک ایسی لکیر آتی ہے جہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے، وہ کیا؟ مثلاً اللہ کی رضا کی طلب ہو، اخلاص ہو، خدا سے دعا ہو کہ اے اللہ! ہم سے تو جو محنت ہو سکتی ہے ہم کریں گے، اصل تو دینے والا ہے علم کا، حضرت امام شافعیؒ کا شعر یاد کیجیے:

شَكَوْتُ إِلَى وَكِيعٍ سُوْءَ حِفْظِي

فَأَرْشَدَنِي إِلَى تَرْكِ الْمَعَاصِي

وَأَخْبَرَنِي بِأَنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ

وَنُوْرُ اللّٰهِ لَا يُهْدٰى لِعَاصِي

میں نے اپنے استاد وکیع سے شکایت کی کہ میرا حافظہ کمزور ہے، انھوں نے کہا کہ گناہوں سے اجتناب کرو، بہت زیادہ گناہوں سے دور رہو، اس لیے کہ علم جو اللہ کا نور ہے، اللہ کا نور نافرمان کو نہیں دیا جاتا۔

یہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے، وہ سنیما جائیں اور کسی اخلاقی کمزوری یا کسی بے راہ روی کا شکار ہو جائیں تو بھی فرق نہیں پڑتا، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ فرق پڑتا ہے، لیکن خیر مان لیا کہ فرق نہیں پڑتا، ویسے ہی وہ فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو جائیں گے، فرسٹ آئیں گے تو نوکری مل جائے گی، لیکن ہمارے یہاں تو کھلا ہوا فرق ہے کہ وہ شخص جو استاد کا ادب کرتا ہے، اس کی دعائیں لیتا ہے، اور اس کے ساتھ بالکل گویا بندھ جاتا ہے، اس کا گویا ملازم ہو، آپ تاریخ میں پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات ایک ہی آدمی ایک استاد کے ساتھ مخصوص ہو گیا، وہ بس اس کا مثنی بن گیا، اور بالکل اس کے علم کو ایسا جذب کر گیا جیسے Sponge ہوتا ہے، وہ پی لیتا ہے، اس طرح پی لیا اس کے علم کو، پھر نچوڑ دیا اپنے شاگردوں میں۔

علم کے آداب

تو عزیزو! یہ ہمارا علم جو ہے، جس علم کے طالب علم ہیں، اس کے لیے یہ جامعہ قائم کیا

گیا ہے، یہ علم خاص آداب رکھتا ہے، یہ پہلوانی کا علم نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ کون ہوتا ہے استاد، کیا کتابوں کا ادب، کیا پرانی دقیانوسی باتیں کرتے ہو، اللہ نے ہمیں ذہن دیا ہے، حافظہ دیا ہے، محنت صحت ہماری اچھی ہے، ہم سب کر کے دکھادیں گے، نہیں، ایسا نہیں، بعض لوگ کم صلاحیت کے ساتھ ایسے کامیاب ہو گئے ہیں کہ دنیا میں ان کا ڈنکا بج گیا۔

صرف ذہانت کافی نہیں

مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ایک صاحب تھے، انھوں نے غلط لائن اختیار کی تھی اور کالج میں پڑھاتے تھے، ان کی ذہانت اور معقولات میں ان کی دسترس مسلم تھی، یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبالؒ بھی ان کو مانتے تھے، لیکن جو فیض ان سے پہنچنا چاہیے تھا، جو علوم وسنت کا اجراء ان سے ہونا چاہیے تھا، اور جو اشاعت ہونی چاہیے تھی، جو ان لوگوں میں بیٹھ کر خشیت پیدا ہونی چاہیے تھی، وہ لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی، کہنے لگے کہ مولوی حسین احمد مدنیؒ تو ہمارے ساتھ تھے، ان کا شمار غبی طالب علموں میں تھا، وہ کچھ وہاں نمایاں نہ تھے، یہ بڑے نمایاں تھے، ان سے ذہانت کے باوجود کیا فیض پہنچا؟

ایسے ہی ایک صاحب کہنے لگے: ارے مولوی الیاسؒ تو جب دیکھو نفلیں پڑھتے تھے، پڑھنے کے زمانے میں نفلیں پڑھتے تھے، مولوی الیاس صاحب نے کیا کر دکھلایا؟ دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، یہاں تک کہ امریکہ اور افریقہ میں بھی ان کی دعوت مقبول ہوئی۔

تو بھائی! بڑے تجربے کی بات بتاتا ہوں، تھوڑی صلاحیت سے وہ طریقہ اختیار کر کے ﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ پر عمل کر کے آدمی وہاں پہنچ سکتا ہے جہاں وہ لوگ -جن کو اپنی ذہانت پر، اور اپنے قوت مطالعہ پر اور محنت پر ناز ہے- نہیں پہنچ سکتے، ان کے پڑھنے پڑھانے میں برکت نہیں ہوگی کہ لوگوں کو نفع پہنچے، علم کے ساتھ ساتھ سنتوں کا اجراء ہو، بدعات کا محو ہو، معصیتوں سے نفرت پیدا ہو، طاعت میں رغبت پیدا ہو، نور آئے، یہ بات پیدا نہیں ہوگی، یہ بات جب پیدا ہوگی کہ آدمی اس طریقہ پر عمل کرے جو استاد بتائے۔

شام کے ایک بہت بڑے عالم علامہ بہجۃ البیطار تھے، وہ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا

کہ ہم لوگ اپنے استاد کے پاس نہیں جا سکے، بڑی سخت سردی تھی، سردی شام میں بہت سخت ہوتی ہے، برف پڑتی ہے، کہنے لگے: ہم مجبور ہو گئے، دوسرے وقت گئے تو کہنے لگے: کیوں نہیں آئے؟ ہم نے کہا: سردی بہت تھی، انھوں نے اوپر سے ایک گھڑا پانی اور ڈال دیا اور کہنے لگے: یہ سردی ہے، علامہ بیطار کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے برداشت کیا اور کوئی شکایت نہیں کی، اب وہ علامہ بیطارؒ بن گئے، انھوں نے خود سنایا، ایسے ہی ایک صاحب نے ان کے ہم عصروں میں سے سنایا، تو یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ استاد خدمت بھی لیتے اور پڑھاتے بھی تھے اور پھر استاد استاد نہیں ہوتا تھا، ایک طرح کا پیر ہوتا تھا، اس کے پاس رہتے کہ نماز کیسے پڑھتا ہے؟ کیا خشوع و خضوع ہے؟ سنتوں کا کہاں تک اہتمام کرتا ہے؟ مسجد آتا ہے تو پہلا قدم کون سا رکھتا ہے؟ نکلتا ہے تو کون سا قدم نکالتا ہے؟ یہ باتیں بھی سیکھتے تھے استادوں سے، اور اب یہ باتیں کم ہو گئیں۔

قحط الرجال کا دور

آج دیکھیے، کوئی غیر معمولی شخص، کوئی سطح سے بلند، کوئی علامہ، کوئی کوہ قامت، کوہ پیکر، ایسی کوئی ہستی نہیں پیدا ہو رہی ہے، اس وقت کوئی امام مزنیؒ، امام نوویؒ، شیخ الاسلام ابن عبد السلامؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نہیں بن سکتا، تو کوئی حافظ ابن حجر ہیثمیؒ بن جائے، ان جیسا ان سے دوسرے تیسرے نمبر کا عالم بنے، لیکن نہیں بن رہے ہیں، لوگ یہاں سے مصر تک اور اب تو مصر بھی خالی ہے، اس زمانے میں از ہر بڑے لوگ پیدا کرتا تھا، بڑے فاضل لوگ، راسخ العلم لوگ پیدا کرتا تھا، وہاں بھی خزاں کا دور آ گیا ہے، اور سیاسی اغراض اور سیاسی مقاصد نے اس کو بالکل بے اثر کر کے رکھ دیا ہے، اور وہاں بھی لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں، اور ہر ملک میں یہ احساس کیا جا رہا ہے کہ اب اس پایہ کے عالم پیدا نہیں ہو رہے ہیں، تو اس کے لیے ضروری ہے درس کی پابندی، استاد کا احترام، مطالعہ کرنا، مطالعہ دیکھے بغیر نہ پڑھنا، اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ فرماتے تھے کہ طالب علموں کا شعار یہ ہو گیا ہے کہ نہ دیکھ کر پڑھنا، نہ پڑھ کر دیکھنا، دیکھ کر پڑھنا یہ مطالعہ کر کے پڑھیں گے، اور پڑھ کر اس

کورواں کریں، دیکھیں، بار بار پڑھیں، دونوں چیزیں ختم ہو گئیں۔

بس چند باتیں ہیں، لمبا قصہ نہیں ہے، اگر ان پر عمل کیا جائے تو آج بھی اللہ کا قانون یہی ہے جو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے تھا، الحمد للہ اب بھی ذہین لوگ پیدا ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کھانے کو تو دے رہا ہے، پہلے لوگ کیا کھاتے تھے اور اس سے کیا ذہانت ان کی ترقی کرتی تھی، بیچاروں کو ہفتوں مہینوں نہ گھی ملے، نہ چکنائی ملے، نہ فروٹ ملے، نہ گوشت، سوکھی روٹی کھا کے انھوں نے اتنے بڑے کام کیے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، بعض بعض ایسے گزرے ہیں کہ نان بائی کی دکان پر کھڑے ہو گئے، اور روٹی توے پر ڈالنے کی جو خوشبو ہوتی ہے، اس سے طاقت حاصل کی اور آ کر پھر پڑھنے لگے۔

بیت علم میں باب علم سے داخل ہو

بس وہی بات ہے کہ ﴿ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ﴾ کہ بیت علم میں باب علم سے داخل ہو، باب علم کیا ہے؟ وہی قواعد و ضوابط پر چلنا، احترام کرنا، نظام کے ساتھ رہنا، مطالعہ دیکھنا، محنت کرنا، اور بھائی! اگر تم نے یہ کر لیا تو چمکو گے، انشاء اللہ نام روشن کرو گے اپنے ملک کا بھی اور اپنی ملت کا بھی، اور نہیں تو بس شُدبُد ہو جائے گی، مشکل سے کوئی مسئلہ بتا سکو گے، یا علمی کام کر سکو گے، میں سمجھتا ہوں کہ بس یہ کافی ہے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ شر و رو آفات سے بچائے، اخلاص عطا فرمائے، اپنے کلام کا، حاملین کلام کا، سب کا احترام و ادب نصیب فرمائے۔ (آمین) و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔[1]

(۱) ۱۹۷۱ء میں دوسری دفعہ بھٹکل آمد کے موقع پر کی گئی تقریر، ماخوذ از ''ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام'' (ص ۵۴ تا ۶۲) و ''تحفۂ بھٹکل'' (ص ۵۷ تا ۶۵)۔

مدرسہ کی اصل ضرورت

ایک ہی علمی شجرۂ نسب

اساتذۂ مدرسہ، برادرانِ عزیز! مجھے بڑی خوشی ہے کہ میری توقع اور اندازہ کے خلاف یہاں حاضری کا موقع ملا، یہاں کی حاضری حقیقت میں ایک اخلاقی فرض ہے اور اس کے بہت سے موجبات ومحرکات ہیں، لیکن ایسا اکثر ہوتا ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے یہاں حاضری کا موقع نہیں ملتا، میں شاکی نہیں بلکہ شکرگزار ہوں ان مخلص احباب کا اور مدرسے کے ذمہ داروں کا جنھوں نے ہم لوگوں کو اس کوتاہی اور اس تقصیر سے بچایا، اور یہاں بلا کر اس سفر کو زیادہ مکمل اور ہم لوگوں کے لیے زیادہ مسرت بخش بنا دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح دونوں کا علمی شجرۂ نسب ایک ہی ہے، اور ان کے بانیوں کا جہاں تک تعلق ہے ان میں فکر اور مقاصد کا ایسا اتحاد ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں ایک خاندان کی دو شاخیں ہیں، حقیقت میں ہم لوگ ایک ہی منزل کے مسافر اور ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، ہم انعام پانے میں بھی برابر کے شریک ہیں، اور آزمائشوں میں بھی ایک دوسرے کے برابر کے شریک ہیں۔

دینی نظامِ تعلیم کا قافلہ

اس وقت پورے دینی نظامِ تعلیم کا قافلہ ہی ایک ایسی دشوار گزار منزل سے گزر رہا ہے، ایک ایسے راستہ سے گزر رہا ہے جو مشکلات سے پُر ہے، اور اس میں بڑی بڑی آزمائشیں ہیں، جن کی طرف بڑی خوبی کے ساتھ آپ کے ناظم مولوی ابوالحسن صاحب نے اشارہ کیا

ہے، اور میں اسی سے فائدہ اٹھا کر چند معروضات پیش کروں گا، لیکن اس سے پہلے میں یہاں کے طلبہ سے یہ کہوں گا کہ وہ اپنے کو ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے لیے کوئی کامیابی نہیں ہے اور ہمارے لیے امتحان ہی امتحان ہے۔

ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہمیشہ ایسے ہی گوشوں سے کچھ ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے ایک نئی حرکت، ایک نئی قوت اور ایک نئی حرارت پیدا کر دی ہے، علم میں بھی اور دین میں بھی، عام طور پر جب شہروں کی فضا مضمحل ہو جاتی ہے، وہ حکومتوں کا مرکز ہوتے ہیں اور بہت سی آزمائشوں میں گرفتار ہوتے ہیں، تمدن کی لائی ہوئی بیماریوں اور خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، پوری تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب شہر میں کوئی بیدار دماغ اور کوئی دردمند دل اور کوئی سطح سے بلند شخصیت پیدا نہیں ہوتی، زندگی وہاں تھکی تھکی اور زندگی کی سرگرمیاں بجھی بجھی سی نظر آنے لگتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا کہ سرکار دربار میں جگہ حاصل کی جائے اور اس کے لیے جو معروف طریقے ہیں، ان سب کو آزمایا جائے، اس وقت کسی گاؤں یا کسی قصبے سے ایک نیا آفتاب طلوع ہوتا ہے، تو یہ پیغام دیتا ہے ؎

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

پوری تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہمیشہ علمی تحریک ہی کو نہیں بلکہ دین کے ساتھ جو مسلمانوں کی زندگی کا تعلق ہے اور دین کا جو تقاضا ہے، اس کو نیا خون شہر سے نہیں پہنچا ہے، وہ شہر کہ جہاں بڑے بڑے کتب خانے ہوتے ہیں، جہاں تمام ائمۂ فن جمع ہوتے ہیں، جہاں ہر قسم کے علم وفن کی سرپرستی موجود ہوتی ہے، بلکہ ایک ایسے قصبے سے کہ جہاں تمدن کا کوئی بڑا مظاہرہ نہیں ہوتا ہے، تہذیب کی کوئی چمک دمک نہیں ہوتی ہے، یا کسی گاؤں یا دیہات سے۔

ہماری نگاہیں قصبات اور دیہات پر پڑنی چاہئیں

ہماری نگاہیں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے بھی اور علم کی نئی تحریک کے لیے بھی بڑے بڑے شہروں پر نہیں پڑنی چاہئیں، بلکہ ان قصبات اور دیہاتوں پر پڑنی چاہئیں جہاں سے

ہمیشہ ائمۂ علم وفن پیدا ہوتے رہے، اور جنھوں نے ہمیشہ علمی سرمایہ میں نمایاں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ ان شہروں کو سہارا دیا ہے، اور اس وقت کی برسرِ انحطاط اور روبہ زوال تہذیب کو آخری نیند سو جانے سے روکا ہے، آپ بغداد کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بغداد میں جو لوگ آکر چمکے، وہ بغداد کے ذرات نہیں تھے، بلکہ باہر کے ذرات تھے جو یہاں آفتاب بن کر چمکے، ایران سے یا بغداد کے گرد و پیش کے قصبات اور دیہات سے وہ جب بغداد آئے تو انھوں نے نہ صرف اپنے کو روشناس کیا بلکہ بغداد کو بھی ایک نئی زندگی اور نئی تابانی بخشی، اسی طرح سے دہلی کو لیجیے، دہلی میں ہمیشہ قصبات اور دیہاتوں کا تازہ اور نیا خون آتا رہا اور اس نے دہلی کے معاشرے میں اور دہلی کی اس وقت کی علمی تحریک میں، وہاں کے مدرسوں میں، وہاں کے نظام تعلیم میں، اور یہاں تک کہ وہاں کی ادبیات میں، اور وہاں کے علوم وفنون میں ایک زندگی پیدا کردی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کا تعلق پہلے ضلع رہتک پھر بعد میں ضلع مظفر نگر سے تھا، لکھنؤ کا ملا نظام الدینؒ کا خاندان جس نے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کو اس وقت متاثر کیا، اس کی علمی رہنمائی کی، ایک نیا نصاب دیا، نصاب سے بڑھ کر نیا دماغ دیا، علم کے طالبین میں ایک تازہ ولولہ پیدا کردیا، یہ خاندان سہالی ضلع بارہ بنکی کے ایک چھوٹے سے خاندان کا تھا۔ اسی طرح گجرات کو لیجیے، احمد آباد بیشک علم کا مرکز تھا، لیکن احمد آباد میں آکر جنھوں نے مسند درس قائم کیا اور جنھوں نے پورے ہندوستان میں ہنگامۂ درس وتدریس گرم کردیا، اور بڑے بڑے جلیل القدر عالم تیار کیے، وہ احمد آباد کے نہیں بلکہ گجرات کے دیہات اور قصبات کے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ مدارس جہاں اب بڑی بڑی عمارتیں ہیں، طلبہ کی بہت بڑی تعداد ہے، عظیم الشان کتب خانے ہیں، اور جہاں سارے ملک سے طالب علم کھنچ کھنچ کر آتے ہیں، وہاں جہاں بہت سی سہولتیں ہیں وہیں بڑی مشکلات بھی ہیں، وہ تمدن کے مرکز میں رہتے ہیں، جدید تہذیب وتمدن کی خرابیاں چاروں طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہوتی ہیں، اور اس ظلمت میں ایک چراغ رہبانی جلایا جاتا ہے، تو وہ کہاں تک ان تند و تیز آندھیوں کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ اس لیے وہ مدارس جو اپنے ساتھ بڑی تاریخ رکھتے ہیں، بڑا نام رکھتے ہیں، اور بڑے بلند مقاصد رکھتے ہیں، لیکن کسی گوشے میں ہیں، ان کے لیے کام

کرنے کا بہت بڑا موقع ہے، انہیں مدارس میں سے آپ کا یہ ''مدرسۃ الاصلاح'' بھی ہے۔

اس لیے اس کے جائے وقوع پر بغیر کسی معذرت یا ندامت کے اس کے بانیوں کو فخر کرنا چاہیے اور اپنے انتخاب کی خود داد دینی چاہیے، آپ لوگوں کو بھی اس پر پورا اطمینان ہونا چاہیے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو مطالعہ کے لیے، محنت کرنے کے لیے اور مضامین میں امتیاز پیدا کرنے کے ایسی پرسکون فضا اور ایک ایسا الگ تھلگ گوشہ حاصل ہے، آپ کبھی ان مدارس کو اور ان شہروں کو رشک کی نگاہ سے نہ دیکھیے گا کہ جہاں آمد و رفت کی بڑی سہولتیں ہیں، اور کشش کی بہت سی چیزیں ہیں، وہ مدارس خواہ ان میں سے خود ہمارا دارالعلوم ندوۃ العلماء ہو، خواہ دارالعلوم دیوبند ہو، پورے احترام کے ساتھ جس کے دونوں مستحق ہیں، اس کے باوجود اس سلسلے میں رشک نہ کیجیے گا کہ کاش ہم بھی کبھی کسی شہر میں ہوتے اور وہاں بڑی بڑی عمارتیں ہوتیں، اور طلبہ کی اتنی بڑی تعداد ہوتی، اور ان کی ایسی بین الاقوامی شہرت ہوتی۔

نظام تعلیم موت و زندگی کی کشمکش کا شکار

اللہ کا شکر کیجیے اور اپنے اس گوشۂ عافیت کو بہت غنیمت سمجھئے، اور یہاں رہ کر آپ نہ صرف اپنی اس درس گاہ کی خدمت کا حوصلہ کیجیے، بلکہ اس نظام تعلیم کو سنبھالا دینے کے لیے جو اس وقت موت و زندگی کی ایک بڑی کشمکش سے گزر رہا ہے، اور جس کی طرف آپ کے ناظم صاحب نے اشارہ کیا ہے، اس کو آپ ایک نئی زندگی عطا کرنے کے لیے اور اس کے اندر ایک نیا خون پیدا کرنے کا بھی حوصلہ کیجیے، آپ اپنے آپ کو حقارت کی نظر سے اور اپنی صلاحیتوں کو شک کی نگاہ سے کبھی نہ دیکھیے، یہ نہ سمجھئے کہ ہم اتنا بڑا کام کیسے انجام دے سکتے ہیں؟ آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ درحقیقت تعلیم کی تاریخ کا جو اصل فعال عنصر رہا ہے، جس نے ہمیشہ تعلیم کے نظام میں ایک نئی روح پیدا کی ہے، اس کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے اور اس کو اوج کمال بخشا ہے، اس کا تعلق حکومت اور اس کے جاری کردہ اوقاف سے نہیں ہے، اس کا تعلق لوگوں کی دلچسپی اور ان کی بلند حوصلگی سے بھی نہیں ہے، اس کا تعلق ان اشخاص سے ہے جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے، جو عام سطح سے بلند تھے، جو قدرت کی طرف سے ایک خاص دل و دماغ لے کر آئے تھے،

جن کے اندر وہبی قوتیں تھیں، یقین تھا، ابلتی ہوئی ذہانت تھی، نہایت بیدار دماغ اور ایک بلند حوصلہ تھا، جن کے خیالات میں جدت اور ایک اجتہادی شان تھی۔

نظام تعلیم کی پوری تاریخ درحقیقت اشخاص کی تاریخ ہے، درحقیقت یہ ان علماء کی تاریخ ہے جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے، جو اپنی ذہنی صلاحیتوں، اپنی علمی قابلیت اور اپنے علمی کمالات میں ایک خاص شان رکھتے تھے، اور جو اس سطح سے بلند تھے جو ایک عرصہ سے چلی آرہی تھی، علوم وفنون کی جو روایت مقرر ہوگئی تھی اس روایت سے بالکل ہٹ کر ان کے اندر ایک غیر معمولی ذہانت، غیر معمولی دماغ، غیر معمولی اعتماد اور اپنے نظام تعلیم کی صلاحیت اور اسلام کی ابدیت پر ایک نیا یقین تھا، انھوں نے بالکل رخ بدل دیا، جس طرح کہ ہوا کا رخ بدل جاتا ہے، اسی طرح ہم نے دیکھا کہ جہاں بہت ہی کوتاہ قامت لوگ پیدا ہورہے تھے، جو محض الفاظ وضمائر کے مرجع اور متون کی شرح، شرح کا تحشیہ اور تحشیہ کے منہیات وغیرہ لکھنے پر اکتفا کرتے تھے، اور جن کا مبلغ علم یہ تھا کہ وہ متقدمین کی کتابیں سمجھ لیں، اچانک ایک شخص پیدا ہوتا ہے اور وہ انھیں کتابوں میں جان ڈال دیتا ہے اور ان کے پڑھنے والوں میں ایک نیا اعتماد پیدا کردیتا ہے، اور اس نظام تعلیم کی طرف سے لوگوں کی نگاہیں اور نقطۂ نظر بدل جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیا دور وجود میں آ گیا۔

عام سطح سے بلند انسان

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہوجائے گی کہ ایک ہی طرح کی کتابیں پڑھی پڑھائی جارہی تھیں، کوئی خاص بات ان میں نہیں تھی، لیکن جب سے دلی میں مثلاً مولانا خواجگی کی ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے جو عام سطح سے بلند تھے، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک وہبی طاقت کے مالک تھے، خداداد قابلیت ان کے اندر تھی، انھیں کے زمانہ میں شیخ عبدالمقتدر کندی اور شیخ احمد تھانیسری جیسے باکمال علماء بھی تھے، اور پھر اس کے بعد ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی کے نام سے دہلی میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے، جس وقت تیمور کا حملہ ہوتا ہے اور دہلی لٹتی ہے، اور دہلی سے اہل کمال مشرق کی راہ لیتے ہیں،

پورب کا رخ کرتے ہیں، یہی آپ کے پوربی اضلاع کی طرف ان کا قافلہ رخ کرتا ہے اور بعض مقامات پر ٹھہرتے ہوئے کالپی وغیرہ ہوکر جونپور منتقل ہوتا ہے، اور پھر آخر میں محض ایک آدمی کی وجہ سے جونپور مرکز بن جاتا ہے، ہم یہ سمجھتے تھے کہ سلاطین شرقیہ کی سرپرستی تھی اور تھی، اس میں کوئی شبہ نہیں، اسی طرح ہمارا خیال ہے کہ یہ پورب کی ذہانت تھی، یہ بھی صحیح، میں ان میں سے کسی کا انکار نہیں کرتا، لیکن یہ سارا قصہ، یہ سارا کرشمہ ایک شخص کا ہے، ایک شخص ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی کے نام سے ادھر آتا ہے، اور وہ جونپور سے لے کر دہلی تک بلکہ ملتان اور لاہور تک سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، آپ کو شاید آپ کے اساتذہ بتلاتے ہوں گے کہ ملک العلماء کا کتنا بڑا دور تھا، انھوں نے جب نحو میں ''الارشاد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، یہ ''شرح جامی'' سے پہلے کی ''شرح جامی'' ہے، یعنی جب انھوں نے ''کافیہ'' کی شرح ''الارشاد'' کے نام سے لکھی جو ''شرح ہندی'' کے نام سے مشہور ہے، تو صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ یہاں سے لے کر ایران، ماوراء النہر اور مصر تک اس کا غلغلہ بلند ہو گیا، علامہ بدرالدین زمامینی جیسے امام نحو نے اس ''شرح ہندی'' کی شرح لکھی، اور ''الشرح الہندی'' کے نام سے یہاں سے لے کر عرب تک مشہور ہو گئی، یہ سب صرف ایک شخص کی ذہانت کا نتیجہ ہے۔

اور جب تعلیم وتعلم کے سلسلہ میں پھر اضمحلال پیدا ہونا شروع ہوا، تو دو بھائی ملا عبداللہ اور عزیز اللہ ایران سے پڑھ کر آئے، رہنے والے تُـلَنبہ کے تھے، لیکن ان کا دہلی کی سلطنت اور لودھی حکمرانوں سے تعلق ہوا، انھوں نے ان کی سرپرستی کی، چنانچہ انھوں نے اس میں ایک نئی روح پیدا کر دی، پھر اس کے بعد ملا فتح اللہ شیرازی ایران سے آئے تو یہاں معقولات کا ایک انجکشن دے دیا اور ایک نئی ذہانت نمودار ہوئی، پھر اس کے بعد مولانا شیخ جمال کوڑویؒ نے قاضی ضیاء الدین نیوتنوی سے استفادہ کیا جو ملک العلماء احمد آباد کے مشہور عالم شیخ وجیہ الدین ابن نصر اللہ گجراتی کے شاگرد تھے، اور پھر انھوں نے کوڑہ میں مدرسہ قائم کیا، اور اس درسگاہ سے ملا جیون جیسے لوگ پیدا ہوئے، اور پھر اسی نے درس نظامی کی شکل اختیار کی، اور پھر انھیں کے شاگرد ملا غلام علی اسی ضلع اعظم گڑھ کے ہیں، اور مولانا شاہ پیر

محمد صاحب ٹیلے والے یہ سب آپ کے اسی پورب کے نواح کے تھے۔

سارا کھیل آدمیوں کا

تو یہ سارا کھیل آدمیوں کا ہے، یعنی تاریخ پھیلا دیتی ہے، تاریخ نقطہ کو پھیلا کر لکیر اور لکیر کو پھیلا کر کتاب بنا دیتی ہے، لیکن پھر وہ لکیر اور کتاب سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، یہ سب کھیل صرف آدمیوں کا ہے، ایک آدمی پیدا ہو جاتا ہے اور سارے اندازوں اور قیاسات کو غلط ثابت کر دیتا ہے، مشکلات کے بادل چھٹ کر بالکل کافور ہو جاتے ہیں، ہوا کا رخ بدل جاتا ہے، شکوک وشبہات کا بادل چھٹ جاتا ہے، اور ایک نیا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔

ہمیشہ سے خواہ وہ دنیا کا کام ہو یا دین کا کام ہو اس میں طاقت ہمیشہ اس وقت آئی ہے جب اس کی ذمہ داری ذہین آدمیوں نے اور ان افراد نے سنبھالی جن کی پشت پر موروثی طور پر ذہانت کے بڑے بڑے خزانے تھے، ہم تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ماننے پر مجبور ہیں کہ ایک فرد واحد نے پورے ماحول کو متاثر کیا، تو خواہ وہ دین کا کام ہو جس میں ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (۱) کا اصول چلتا ہے، یا دنیا کا کام ہو جس میں نوک شمشیر اور زور بازو فیصلہ کرتے ہیں، دونوں میں فرد واحد اپنے راستہ بناتے ہیں اور پوری دنیا بدل دیتے ہیں، ایسا لگتا ہے ایک نیا دور وجود میں آ گیا۔

دینی نظام تعلیم کی آزمائش

اب اس وقت ہمارے دینی نظام تعلیم کے لیے جو سب سے بڑی آزمائش ہے، وہ یہ ہے کہ وہ خاندان جس میں پشت در پشت ذہانت چلی آ رہی تھی، علم سے مناسبت تھی اور جن کے اندر اعتماد تھا، جو احساس کہتری سے پاک اور محفوظ تھے، جن کے اندر جرأت تھی، جرأت کے ساتھ وہ آنکھوں سے آنکھیں ملا سکتے تھے، اپنے اوپر بھی ان کو اعتماد تھا اور اپنی صلاحیتوں پر بھی اعتماد تھا، اس طرح کے خاندان کے لوگوں نے یہ راستہ بالکل چھوڑ دیا ہے، اور جیسا کہ ناظم

---

(۱) سورة الحجرات:۱۳

صاحب نے کہا کہ ان میں جو ذہین بچہ ہوتا ہے، اور جو تندرست بچہ ہوتا ہے، اس کو اسکول میں داخل کیا جاتا ہے، ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک باپ کے دو بچے ہیں، ایک بچہ تندرست اور بالکل صحیح الاعضاء ہے، اس کو تو انگریزی تعلیم میں داخل کیا جاتا ہے، اور ایک بچہ جو جسمانی طور پر معذور ہے، یا جس کو بری عادتیں پڑ گئیں ہیں، چوری کرنے لگا ہے، ماں باپ اس سے عاجز آگئے ہیں، اس کو عربی مدرسے میں داخل کرتے ہیں، اور حد یہ ہے کہ خط میں اس مدرسہ کے ناظم کو لکھتے ہیں کہ میں اس بچہ کو بھیج رہا ہوں جس سے میں عاجز آچکا ہوں، یا جو پاؤں سے معذور ہے یا ہاتھ سے معذور ہے، یا جس کو فلاں قسم کی بیماری ہے، اور ان کو اس میں حیا نہیں آتی، یہ ان کی اخلاقی جرأت کہیے یا بے تکلفی کہیے کہ خط میں بھی اس کی تصریح کردیتے ہیں کہ میں اپنے ایک معذور بچے کو آپ کے حوالے کرتا ہوں، اور صحیح و توانا اور تندرست بچے کو وہ کسی کالج کی راہ دکھاتے ہیں، یا اسکول میں بھیجتے ہیں، ایسی بہت سی مثالیں ہیں، آپ کو بھی تجربے ہوئے ہوں گے، ہم کو بکثرت ایسے تجربے ہوئے ہیں، مولانا عمران خاں صاحب ندوی کو اپنے دور اہتمام میں اس کے بارہا تجربے ہوئے ہوں گے، آج ہمارے بڑے بڑے دیندار خاندان بھی اپنی اولاد کے معاملے میں یہی کررہے ہیں کہ جو از کار رفتہ ہوں، جن سے کوئی امید نہ ہو، جس سے وہ عاجز آچکے ہوں، اس کو وہ مدرسہ میں بھیجتے ہیں، اور جو ذہین ہو اور جس کے اندر وہ تمام خصوصیات پائی جائیں جو ایک ذہین وفطین طالب علم میں ہونی چاہئیں، اس کو وہ انگریزی تعلیم دلاتے ہیں، اس کا دینی نظام تعلیم پر بڑا اثر پڑ رہا ہے۔

عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہسار

لیکن میں پھر آپ سے کہوں گا کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں، صرف اشخاص کا معاملہ ہے، اور حالات ان کے منتظر ہیں، ہمیں ہر جگہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے، عام تاریخ سے بھی اور اسلامی تاریخ سے بھی، اور اگر غور کیا جائے تو دینی ہدایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ حالات ہمیشہ اشخاص کے، اشخاص کی قوت ارادی کے، ان کے جذبۂ قربانی کے، اور ان کی غیر معمولی ذہانت کے تابع ہوتے ہیں، مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ جیسا ایک ذہین آدمی پیدا ہو جائے، دیکھیے ایک شخص نے کتنا بڑا کام کیا ؎

عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

آپ ہی کے ضلع کے مولانا اسلم صاحب جیراج پوری کا یہ مصرع ہے، آج جو کچھ آپ اس جنگل میں منگل دیکھ رہے ہیں، یہ صرف ایک آدمی حضرت مولانا حمید الدین صاحب فراہیؒ کے عشق کا نتیجہ ہے، آپ دیوبند میں جا کر جو کچھ دیکھیں وہ مولانا قاسم صاحبؒ اور مولانا عابد حسین صاحبؒ کے عشق کا، عزم کا اور یقین کا نتیجہ ہے، آپ کو ندوہ جا کر جو کچھ منظر نظر آئے گا وہ ایک دو شخصوں کے عشق کا نتیجہ ہے، اس وقت جو سب سے بڑی مصیبت ہے، میں بھی اسی جرم کا مجرم ہوں، میں اپنے کو اور اپنے رفقاء کو بھی بری نہیں کرتا، وہ یہ کہ ہماری نگاہیں تعمیرات پر جاتی ہیں، مالیات پر جاتی ہیں، ہم سب اس میں مبتلا ہیں، اور اس سے ہم صرف نظر نہیں کر سکتے، لیکن اصل معاملہ آدمی کا ہے، ایک مدرسہ اگر ایک آدمی ایسا پیدا کر دے جو اپنی ذہانت میں فائق ہو، اور جس کو اسلام کی صلاحیت پر، پھر اپنے علم کی صلاحیت پر، اپنی شریعت کی صلاحیت پر پورا اعتماد ہو، اور اس کی تشریح میں جو چیزیں لکھی گئی ہیں، ان کی افادیت پر اور ان کی نافعیت پر یقین ہو، اور اس پر یقین ہو کہ ہم اس دور کی رہنمائی کر سکتے ہیں، اور اس کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ یہ دور ایک مرض جذام میں مبتلا ہے، ہماری پوری تہذیب جذام میں مبتلا ہے، اور ہمارے پاس ایک آب حیات ہے، اور ہم ہی اس کی چارہ سازی کر سکتے ہیں، تو پھر تمام محنت وصول۔

ندوہ اور دیوبند در و دیوار اور عمارتوں کا نام نہیں، ان اداروں نے جو افراد پیدا کیے اور جنھوں نے دنیا سے اپنا اور اپنی درس گاہ کا لوہا منوالیا، ان کا نام ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نہ ہوتے تو ندوہ کیا ہوتا؟ وہ درخت جس نے کوئی پھل نہیں دیا، وہ درخت کہلانے کے قابل کہاں؟

میرے عزیزو! اگر تم میں پھر کوئی اختر احسن، امین احسن یا ابو اللیث (۱) پیدا ہوتا ہے، میں نے نمونے کے طور پر جو نام یاد آئے ہیں وہ آپ کے سامنے لیے، اگر مدرسہ پھر ان لوگوں کو پیدا کرتا ہے تو پھر سب صحیح اور تمام محنت وصول۔ (۲)

---

(۱) مدرسۃ الاصلاح کے فارغین میں ممتاز فضلاء جنہوں نے بڑی شہرت پائی۔

(۲) مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (اعظم گڑھ) میں طلبہ کی انجمن دار المعلومات کے زیر اہتمام ۱۹۷۴ء میں کی گئی تقریر، یہ تقریر شکیل احمد اعظمی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' لکھنؤ، (شمارہ ۲۵ مئی ۱۹۷۴ء)۔

علوم دینیہ کے طلبہ وفضلاء کی کامیابی کی تین لازوال شرطیں

مفتی محمد شفیع صاحب اور پاکستان کے علمائے کبار کی یاد

حضرات اساتذۂ دارالعلوم اور عزیز طلبہ!

میں اس دور کے جن علماء کے رُسوخ فی العلم اور تبحر کا معتقد وقائل ہوں، ان میں اس دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا خاص مقام ہے، علمی تبحر، فقہ وفتاویٰ پر وسیع اور گہری نظر، قوت تدریس، یہ سب چیزیں بھی قابل قدر اور قابل احترام اوصاف و کمالات ہیں، لیکن ایک دوسری چیز ہے جس کی بنا پر کسی فقیہ یا مفتی کو ''فقیہ النفس'' کہتے ہیں، یہ امتیاز علمائے زمانہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کو حاصل تھا، وہ میرے اساتذہ کی عمر اور صف کے بزرگ تھے، یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے براہ راست ان سے درسی طور پر استفادہ کا موقع نہیں ملا، جب میں دیوبند پہنچا تو حضرت مفتی صاحب وہاں درس دیتے تھے، لیکن میں چونکہ صرف دورہ کے اسباق میں شریک ہوتا تھا، اس لیے مجھے ان سے تلمذ کا شرف حاصل نہ ہوا، میں نے بائیس برس کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھا ہے، ۱۹۵٦ء میں ایک بیرونی سفر سے آتے ہوئے دو تین دن کے لیے کراچی ٹھہرا تھا، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج اس نے ان کی اس بہترین یادگار دارالعلوم میں پہنچایا۔

اس وقت پاکستان کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب،

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جیسے راسخ فی العلم والدین علماء کی ضرورت تھی، واقعہ تو یہ ہے کہ حالات و مسائل ایسے ہیں کہ اس وقت اس ملک اور اس عہد کو حجۃ الاسلام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ کی ضرورت تھی، لیکن اگر اس پایہ کے علماء اور دینی رہنما نہ ہوتے تو کم سے کم ان حضرات کے پایہ کے علماء تو ہوتے جن کا میں نے ذکر کیا، مگر افسوس کہ اس وقت وہ بھی ہم میں موجود نہیں۔

انقلابِ زمانہ کا شکوہ

عزیز طلبہ! چونکہ میں اس وقت دارالعلوم میں خطاب کر رہا ہوں، اس لیے جو کچھ کہوں گا وہ علم کے تعلق سے کہوں گا، اور طلبہ و اساتذہ کے مستقبل، ان کے فرائض، ذمہ داریوں، وقت کی نزاکت اور زمانے کے فتنوں کے متعلق عرض کروں گا۔

آپ کے کان میں بار بار یہ بات پڑی ہوگی کہ زمانہ بدل گیا ہے، دنیا بدل گئی ہے. زمین آسمان بدل گئے ہیں، سوچنے کے طور طریقے بدل گئے ہیں، اس زمانہ میں علوم دینیہ کی تحصیل میں عمر صرف کرنا، ان میں کمال پیدا کرنا، ان کے دقائق اور جزئیات میں جانا، ایک بے وقت کی شہنائی اور ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' نہیں تو کیا ہے؟

صرف یہی زمانہ نہیں بلکہ ہر زمانہ میں زمانے کی تبدیلی کا شکوہ کیا گیا ہے، آپ کسی زمانہ کے ادب و شاعری یا تاریخ کا مطالعہ کریں، آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ یہی رونا رویا گیا ہے کہ زمانہ بڑا خراب ہے، علم کی قدر نہیں، اہل کمال کی قدر نہیں، بے کمالی اور بے کمالوں کا دور دورہ ہے، عربی شاعری اور ادب کو دیکھیں گے تو ابوالعلاء معری کو کہتے ہوئے سنیں گے:

وَطَاوَلَتِ الْأَرْضُ السَّمَاءَ سَفَاهَةً
وَفَاخَرَتِ الشُّهْبَ الْحَصَى وَالْجَنَادِلُ
وَقَالَ السُّهَى لِلشَّمْسِ: أَنْتِ خَفِيَّةٌ
وَقَالَ الدُّجَى: يَاصُبْحُ! لَوْنُكَ حَائِلُ
إِذَا وَصَفَ الطَّائِيَّ، بِالْبُخْلِ، مَادِرٌ
وَعَيَّرَ قُسًّا، بِالْفَهَامَةِ، بَاقِلُ

پھر اس کے بعد کہتا ہے:

فَيَــا مَــوْتُ! زُرْ، إِنَّ الْـحَيَــاةَ ذَمِيْمَةٌ

وَيَــا نَــفْــسُ! جِـدِّيْ،إِنَّ دَهْـرَكِ هَــازِلُ

یعنی اے موت! تیرا آنا ہی اچھا ہے، اس لیے کہ زندگی کا کوئی مزہ نہیں رہا، اور اے نفس! تو ہی سنجیدگی اور وقار کے راستے پر چل، تیرا زمانہ تو دل لگی اور مذاق کر رہا ہے۔

دوسری طرف حافظ شیرازی اس طرح شکوہ سنج ہیں۔

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم

ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

آگے زمانہ اور اہل زمانہ کی سفلہ پروری و ناقدری کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں

طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

اُردو کی طرف آیئے گا تو آپ کو ''آب حیات'' اور دوسرے تذکروں میں شہر آشوب ملیں گے، جن میں شعراء نے اپنے زمانہ اور اپنے ملک کی خستہ حالت اور انقلاب روزگار پر آنسو بہائے ہیں، اس سلسلہ میں استاد ذوقؔ کا ایک ہی شعر کافی ہے۔

پھرتے ہیں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

یہ چند اشعار ہیں جو مجھے اس وقت برجستہ یاد آئے، ورنہ ایسے اشعار اور زمانہ کے شکوہ شکایت سے دیوان کے دیوان بھرے ہوئے نظر آئیں گے، جو کتاب دیکھیے گا زمانہ کا ماتم ہوگا اور شکوہ کا دفتر، اپنی جنسِ کمال کس کے سامنے پیش کی جائے؟ جوہری کہاں ہیں؟ اہل نظر کہاں ہیں؟ یہ بے کمالی اور بے ہنری کا دور ہے، کس کے لیے انسان محنت کرے؟ کس کے لیے اپنا پتّا پانی کرے؟ کس کے لیے اپنا خونِ جگر بہائے؟ اگر آپ ان باتوں پر اعتبار کر لیں گے تو آپ کا نہ مدرسہ میں جی لگے گا، نہ پڑھنے میں، نہ محنت کرنے میں۔

سننِ الٰہیہ نا قابل تبدیل ہیں

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زمانہ کا انقلاب ایک حقیقت ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، سو برس پہلے کا زمانہ دیکھیے، کیا خیر و برکت کا زمانہ تھا، خواص تو خواص اس وقت کے عوام بھی اس زمانہ کے خواص سے بہتر تھے، کیا قوتِ ایمانی تھی، کیا دینی حمیت و غیرت تھی، دین کا علم، قرآن کا حفظ مرد تو مرد، عورتوں میں کتنا عام تھا، اِس وقت غفلت و مادیت کا دور دورہ ہے، دین و علم دین کے محرکات و دواعی بہت کمزور پڑ گئے ہیں، لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان تمام انقلابات کے باوجود جو پہلے ہو چکے اور ان تمام کے باوجود جو اَب ہو رہے ہیں اور ہوں گے، اور جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ کی سنن نا قابل تبدیل ہیں، اور ان پر ان انقلابات کا کوئی اثر نہیں، جہاں اس حقیقت کا قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے وہاں اس کو قرآن مجید کے عام اسلوب کے خلاف زور دینے کے لیے دہرایا گیا ہے، اور مکرر فرمایا گیا ہے: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا﴾ (۱) اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور علم کامل کی بنا پر اس کائنات اور فطرت انسانی کے متعلق جو آئین و قوانین بنا دیے ہیں، اور جو اصول طے کر دیے ہیں، ان میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اب یہ قرآن مجید کے استقراء اور حدیث وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ قوانین کیا ہیں؟ ان قوانین کی فہرست بہت طویل ہے، اور مجھ جیسے طالب علم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ پوری فہرست مرتب کر سکے، نہ وقت میں اس کی گنجائش ہے، لیکن میں اپنے علمِ ناقص کی بنا پر ان سننِ کونیہ میں سے تین سنتوں کا ذکر کروں گا، جن کا ہماری زندگی اور ہمارے مدارس و مقاصد سے خالص تعلق ہے۔

نافعیت کا احترام واعتراف

ان میں سے ایک سنّت اللہ لوگوں کا نافعیت و افادیت کے سامنے جھکنا، اس کی قدر کرنا اور اس کو تسلیم کرنا ہے، نافعیت اور اس کے محل و مرکز کے ساتھ محبت کا ہونا، ''نافع'' کو

---

(۱) سورة فاطر: ٤٣

تلاش کرنا، اس کی طرف رجوع کرنا، اور وہ مل جائے تو اس کی قدر کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے، نافعیت کی بقا اور اس کی زندگی اور سرسبزی کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت کی ہے، اور جو اس سے خالی ہے، اس کے لیے یہ ضمانت نہیں، سورۂ رعد میں صاف فرمایا گیا ہے:

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ﴾ (۱)

''سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے، اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے، اسی طرح خدا (صحیح اور غلط) کی مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ تم سمجھو)۔''

''بقائے اَصلح'' نہیں بلکہ قرآنی زبان و اصطلاح میں ''بقائے اَنفع'' کا یہ قانون ہزاروں لاکھوں برس سے چل رہا ہے، اور ہزار تبدیلیوں کے باوجود چلتا رہے گا، نافعیت کے لیے پنپنا، پھلنا پھولنا اور اور اپنی قیمت اور اہمیت تسلیم کرالینا مقدر ہو چکا ہے، نافع بن جانا ہزار مخالفتوں اور فتنوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے، اس کے لیے پروپیگنڈہ اور پبلسٹی کی ضرورت نہیں، نافع کے اندر محبوبیت کی صفت ہے، اس میں رنگ و مذہب اور قوم و وطن کی بھی تفریق نہیں، ''نافع'' اگر پہاڑ کی چوٹی پر بھی جا کر بیٹھ جائے گا تو دنیا اس کو تلاش کرنے کے لیے وہاں پہنچے گی، اور اس کو ہاتھوں ہاتھ سر پر بٹھا کر، بلکہ آنکھوں میں جگہ دے کر لائے گی، یہ اللہ کی سنت ہے جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلی آ رہی ہے۔

نافع کی تلاش وطلب

عزیز طلبہ! آپ اپنے اندر نافعیت پیدا کرنے کی کوشش کیجیے، آپ سے زندگی کی شب تاریک میں راہ رؤں کو روشنی اور رہنمائی ملتی ہو، آپ کی مدد سے علمی عقدے حل ہوتے ہوں، آپ کی صحبت میں بیٹھ کر ایمان میں طاقت پیدا ہوتی ہو، آپ کے پاس جا کر آدمی کچھ لے کر آتا ہو، اس کے بعد اگر آپ اپنے اور لوگوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیجیے، اپنے

(۱) سورۃ الرعد:۱۷

مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیے، لوگوں کو اگر یہ معلوم ہوگا کہ یہاں ایک ''نافع'' رہتا ہے ،اس سے فلاں قسم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، (روح کا فائدہ اور ایمان کا فائدہ تو بہت بڑی چیز ہے)، تو لوگ دیواریں پھاند کر اور دروازہ توڑ کر آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

اس موقع پر حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کی ایک حکایت یاد آئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑے بڑے حقائق کو آسان و عام فہم تمثیلوں میں بیان کرنے کی بڑی حکمت عطا فرمائی تھی، ان سے ایک مرتبہ نواب صاحب کورواَئی نے شکایت کی کہ حضرت! میں نے بڑے شوق سے ایک مسجد بنوائی، اس پر بڑا روپیہ خرچ کیا، لیکن وہاں کوئی نماز پڑھنے نہیں آتا، حضرت کے سمجھانے کا عجیب طریقہ تھا، بعض مرتبہ وہ امتحان بن جاتا، فرمانے لگے کہ نواب صاحب! اس کا دروازہ چن دیجیے اور بالکل تیغہ کر دیجیے، نواب صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت اُلٹا علاج بتا رہے ہیں، کہنے لگے کہ حضرت! میں نے تو مسجد اس لیے بنوائی ہے کہ لوگ آئیں اور نماز پڑھیں اور وہ آباد ہو، آپ فرماتے ہیں کہ اس کا دروازہ چن دیا جائے؟ حضرت نے فرمایا کہ ابھی میری بات تو پوری نہیں ہوئی، دروازہ چن دیا جائے اور اندر ایک آدمی کو بٹھا دیجیے، جس کے ہاتھ میں پچاس پچاس کے نوٹ ہوں یا دس دس، پانچ پانچ کے ہی نوٹ ہوں، اور باہر اعلان کرا دیجیے کہ اس مسجد میں نوٹ تقسیم ہو رہے ہیں، آپ نے مسجد تو بنا ڈالی، نماز کا جو ثواب اور فائدہ ہے وہ لوگوں کو معلوم نہیں، اب مسجد میں کیسے آئیں؟ ان کو نوٹ کا فائدہ معلوم ہے، ان کو معلوم ہے کہ پانچ روپے کے نوٹ سے کیا کیا چیزیں خریدی جا سکتی ہیں، اور اس سے کیا کیا کام نکالے جا سکتے ہیں، ان کو یہ معلوم نہیں کہ نماز سے کیا کیا چیزیں خریدی جا سکتی ہیں، اور اس سے کیا کیا فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں، اب آپ ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ گرمی یا سردی میں تکلیف اٹھا کر اپنا حرج کر کے اور دور سے چل کر کے آئیں گے، آدمی بٹھانے کے بعد کچھ ڈھنڈھورا پٹانے کی بھی ضرورت نہیں، ذرا سی دیر میں یہ بات پھیل جائے گی کہ نواب صاحب نے خدا جانے کس بنا پر یہ کام کیا ہے کہ مسجد کے دروازے تو چن دیے ہیں اور اندر ایک آدمی ہزار روپے کے نوٹ لیے بیٹھا ہے، اور تقسیم کر رہا ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دروازہ توڑ کر مسجد میں داخل ہو جائیں گے اور

کوئی ہزار روکے گا وہ رُکیں گے نہیں۔

تو نافعیت ہی اصل چیز ہے جس پر لوگ پروانہ وار ہجوم کرتے ہیں، پروانوں کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ شمع جل رہی ہے، کون یہ اعلان کرتا ہے کہ پروانو! شمع پر ہجوم کرو، ان پروانوں اور شمع کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ جہاں پانی کا چشمہ ہوتا ہے وہاں مور وملخ، انسان و چوپائے جمع ہوجاتے ہیں، انقلاب کا شکوہ بے خبری، بے صبری اور کم ہمتی کی دلیل ہے۔

نافعیت کی قوت تسخیر

آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں، ہمارے شہر لکھنؤ میں ایک چوٹی کے مسلمان ڈاکٹر عبدالحمید صاحب مرحوم جن کی حذاقت، وسیع تجربہ اور استادی کا ہندو مسلمان سبھی ڈاکٹر لوہا مانتے تھے، انھوں نے مجھے لطیفہ سنایا کہ بارہ بنکی کے ایک غیر مسلم سرمایہ دار اور کاروباری شخص نے تقسیم کے بعد ایک دن اُن سے طنزاً کہا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ پاکستان نہیں گئے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! میں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ تاجر کسی سخت مرض میں مبتلا ہوا، ہر طرح کے علاج اس نے کیے، کئی بڑے بڑے ڈاکٹروں کو بلایا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، ہار کر اس نے ڈاکٹر صاحب کو تکلیف دی، ڈاکٹر صاحب جب اس کو دیکھنے گئے اور علاج شروع کیا تو کہا کہ دیکھیے! اگر میں پاکستان چلا جاتا تو آپ مجھے کہاں بلاتے اور میں آپ کی خدمت کیسے کرسکتا؟ اللہ کا کرنا انھیں کے علاج سے اس کو فائدہ ہوا اور اس کو شرمندہ ہونا پڑا۔

میں آپ کی ہزار مشکلات کا حل یہ سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے زمانہ سے اپنا نافع اور مفید ہونا تسلیم کرالیجیے، آپ اس سے یہ اقرار کرالیجیے کہ آپ کے پاس جو علم ہے، وہ دنیا کے پاس نہیں ہے، دنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ جو سودا جس دکان پر ملتا ہے آدمی اس کی خریداری کے لیے وہیں جاتا ہے، ایک صاحب کمال بھی اس دوسرے صاحب کمال کی طرف رجوع کرتا ہے، جس کے پاس اپنے دل کا مدعا اور اپنے مرض کی دوا پاتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ حدیث وفقہ میں اپنے زمانے کے امام اور بغداد میں مرجع خلائق تھے،

لیکن اپنے قلب کو غذا اور روح کو تقویت پہنچانے کے لیے اپنے شہر کے ایک ایسے صاحب دل بزرگ کے حلقۂ صحبت میں تشریف لے جاتے تھے جن کو علم میں ان سے کوئی نسبت نہ تھی، ایک مرتبہ ان کے ایک صاحبزادے نے ان سے کہا: ابا جان! آپ کے وہاں جانے سے ہم لوگوں کا سر نیچا ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، فرمایا کہ بیٹے! انسان جہاں اپنا فائدہ دیکھتا ہے، وہاں جاتا ہے، مجھے وہاں اپنے دل کا فائدہ نظر آتا ہے۔

یہ درس نظامی جو آج ساری دنیا میں سکہ کی طرح چل رہا ہے، ملا نظام الدین فرنگی محلی کا مرتب کیا ہوا ہے، جو استاذ الہند اور استاذ العلماء تھے، وہ بایں علم و فضل اودھ کے ایک قصبہ بانسہ کے ایک بزرگ حضرت سید عبد الرزاق بانسوی قادریؒ کے مرید تھے، جو اودھ کی پوربی زبان بولتے تھے، اور انھوں نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں، ملا صاحب نے حضرت کے ملفوظات بھی لکھے ہیں، اور بڑی محبت و عقیدت سے ان کا نام لیتے ہیں، اس لیے کہ ان کو اپنے سارے علم و فضل کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس ہوتا تھا جو وہاں جا کر پُر ہوتا تھا، وہ سب کے استاد تھے، لیکن ان کو ایسے آدمی کی تلاش تھی جہاں جا کر یہ معلوم ہو کہ میں کچھ نہیں ہوں اور ابھی سیکھنے اور پڑھنے کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا عبد الحی بڑھانویؒ اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ۔ جن میں سے اول الذکر کو شاہ عبد العزیز صاحبؒ "شیخ الاسلام" اور ثانی الذکر کو "حجۃ الاسلام" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے دست گرفتہ اور ان کے دامن سے وابستہ تھے، جن کی تعلیم کی تکمیل بھی نہیں ہوئی تھی، دیوبند کے بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ جب سید صاحب یہاں تشریف لائے تو دونوں بزرگوں کا حال یہ تھا کہ سید صاحب آرام فرماتے ہوتے تھے، اور دونوں حضرات چارپائی کے دائیں بائیں بیٹھے ہوتے، جب سید صاحب بیدار ہوتے اور کچھ فرماتے تو یہ حضرات دیر تک اس کا مذاکرہ کرتے اور لطف لیتے۔

استغناء و بے غرضی کی طاقت و تاثیر

دوسری طرف استغناء اور بے غرضی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جو مانگے لوگ

اس سے گھبرائیں، اور جو دامن پھیلائے اس سے بھاگیں، اور جو اپنی مٹھی بند کرلے اور دامن سمیٹ لے، اس کے قدموں میں پڑیں اور خوشامد کریں کہ وہ کچھ قبول کرلے، استغناء میں ازل سے محبوبیت و مقبولیت ہے اور طلب میں ذلت، گویا مستغنی سے احتیاج کا معاملہ ہے، اور طالب سے استغناء کا، یہ بھی ایک ایسی سنت خداوندی ہے جس میں زمانہ کی تبدیلی کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں، چوتھی صدی کے حالات آپ پڑھیں تو یہی نظر آئے گا، آٹھویں صدی کے پڑھیں گے تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے، اور چودھویں صدی میں بھی یہی ہو رہا ہے، میں اس سے زیادہ واقعات نہیں بیان کرتا اور تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، کہ بزرگان دین کے تذکرے اور تصوف کی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے، اور آپ کو خود بھی اس کے تجربے ہوئے ہوں گے، نہیں تو اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے واقعات سنے ہوں گے۔

کسبِ کمال کُن کہ عزیز جہاں شوی

تیسری اور آخری خصوصیت کمال، امتیاز اور کسی چیز میں مہارت تامہ ہے، علوم عالیہ تو بڑی چیز ہیں، علوم آلیہ میں بھی اگر کسی فن میں کمال پیدا ہو جائے، اور اس سے بھی نیچے اتر کر اگر کسی کو خطاطی، وراقی میں کمال حاصل ہو تو اچھے اچھے اہل علم اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں، بڑے بڑے مصنفین، بڑے بڑے ناشر کاتبوں کی ناز برداری کرتے ہیں، ان کے نخرے سہتے ہیں، ان کی خوشامد کرتے ہیں کہ وہ وقت پر لکھ دیں، کم سے کم کتاب کا نام ہی لکھ دیں، جس کا بلاک بنایا جاسکے۔

آپ اگر کسی صاحب کمال کو یا علم کے کسی ماہر خصوصی کو دیکھتے ہیں، اس کے متعلق سنتے ہیں کہ وہ عسرت و بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں، تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اس صاحب کمال کے ساتھ کوئی ایسی کمزوری یا مزاجی خرابی لگی ہوئی ہے جس نے اس کے سارے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے، مثلاً غصہ بہت ہے، مزاج میں تلون ہے، کاہلی ہے، محنت نہیں ہوتی، پڑھانے میں جی نہیں لگتا، بے ضابطگی کی عادت پڑگئی ہے، کسی کی کوئی بات برداشت نہیں ہوتی، اس سے آگے بڑھ کر کچھ مراق ہے، سنک ہے، کسی جگہ ٹھہرنے نہیں پاتے، فوراً اَن بَن

ہو جاتی ہے، ایسی کوئی نہ کوئی بات آپ ضرور پائیں گے جس کی وجہ سے ان کے کمال اور علم سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا، اور گوشۂ گمنامی یا کس مپرسی میں دن گزار رہے ہیں۔

یہ وہ تین لازوال شرطیں اور صفتیں ہیں، جن کے ساتھ سنت اللہ یہ ہے کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے، اور اہل زمانہ کتنے ہی بگڑ جائیں، ان کے اندر تسخیر کا مادہ اور محبوبیت کی صفت ہے، اور آج ہمارے فضلائے مدارس اور طلبۂ علوم دینیہ کو انھیں شرطوں کو پورا کرنے اور انھیں صفات سے متصف ہونے کی ضرورت ہے۔ (۱)

---

(۱) ۱۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو دارالعلوم، کورنگی (کراچی) میں علماء و اساتذۂ دارالعلوم اور طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، ماخوذ از ''دعوت فکر و عمل'' (ص ۱۹۶ تا ۲۰۷)۔

ہلال سے بدرِ کامل

آغاز ہمیشہ ہر چیز کا حقیر ہوتا ہے

محترمی حاجی صاحب، اساتذہ دار التعلیم والصنعت اور عزیز طلبہ! عارف لاہوری علامہ اقبالؒ کا ایک شعر ہے جو انھوں نے ہلال عید کے موقع پر کہا ہے ؎

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

آپ سب جانتے ہیں کہ چاند جب نکلتا ہے بہت باریک ہوتا ہے، بالکل ایک لکیر کی طرح، اور جب انتیس کا ہوتا ہے تو اور بھی باریک ہوتا ہے، اس کے دیکھنے کے لیے بڑے اہتمام کیے جاتے ہیں، خاص نظر والوں ہی کو وہ نظر آتا ہے، اور آسمان پر بال کی لکیر کی طرح چمکتا ہے، پھر وہ چودھویں کا چاند بن جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا قانون ہے جو ہزاروں اور شاید لاکھوں سال سے چلا آرہا ہے، اور اس میں کوئی فرق نہیں ہوا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس کا الٹا ہو، چودھویں کا چاند نکلے، اس کے بعد باریک بنتے بنتے وہ ہلال بن جائے، ایسا تو ہوتا ہے کہ پہلے وہ باریک ہوتا پھر وہ چودھویں کا چاند بنتا ہے، اور پھر وہ باریک ہوجاتا ہے، اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی بہت بڑی حکمت ہے، ایک بڑی حکمت تو یہ ہے کہ آغاز ہمیشہ ہر چیز کا حقیر ہوتا ہے، اور بہت چھوٹا ہوتا ہے، پھر وہ تدریجی طور پر نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ ایک دم میں کچھ سے کچھ کردے، لیکن تدریج کا قانون سب چیزوں میں ہے، آپ دیکھتے ہیں پہلے بچہ پیدا ہوتا ہے، پھر وہ بڑا ہوتا ہے، یہی درختوں کا،

غلے کا، ترکاری کا حال ہے، اللہ کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں کہ وہ ایک نوجوان کو دنیا میں یونہی اور ایک دم سے پیدا کر دے، لیکن تدریج کے قانون کے ذریعے ہم کو تعلیم دی جاتی ہے کہ تم مایوس نہ ہو، ہر چیز کا آغاز بہت چھوٹا، حقیر، بعض اوقات غیر مرئی طریقہ پر ہوتا ہے، نظر بھی نہیں آتا، پھر اس کو نقطۂ عروج تک پہنچایا جاتا ہے، اور نقطۂ عروج سے پھر واپس لایا جاتا ہے کہ انسان میں گھمنڈ نہ پیدا ہو، ﴿وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾۔[1]

وہی چاند جو ایک بال برابر تھا، اس کے بعد چودہویں کا چاند بنا اور پھر بال بنتا ہے، چاند پر سب کی نگاہیں جمتی ہیں، اس سے بہت سی چیزیں متعلق ہیں، حساب بھی متعلق ہے، اور اسلام میں تو رمضان شریف، عید اور بقر عید اور سب سے بڑھ کر حج، سب چاند سے متعلق ہیں: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾[2] تو ایک طرف اللہ تبارک وتعالیٰ یہ حوصلہ دلاتے ہیں کہ کسی چیز کا آغاز کتنا ہی حقیر اور کتنا ہی چھوٹا ہو، اس سے آدمی مایوس نہ ہو، دوسری طرف یہ تعلیم دیتے ہیں کہ کوئی اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ جائے. اخیر میں اس کو زوال ہوتا ہے تاکہ وہاں مایوسی نہ ہو اور یہاں گھمنڈ نہ ہو، ایک چیز سے دو دو سبق اللہ تعالیٰ ہم کو دیتے ہیں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہلال عید پر علامہ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

بر خود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

اے ہلال! اپنے اوپر نظر ڈال اور اپنی تہی دامنی سے رنجیدہ نہ ہو اور ذلت محسوس نہ کر کہ میں کیا میری بساط کیا، میں بال کے برابر باریک ہوں، تیرے اس بال کے اندر اللہ نے چودہویں کا چاند پوشیدہ کر رکھا ہے، تیرے بطن میں چودہویں کا چاند ہے، میں یہ اس پر کہہ رہا ہوں کہ ہمارے دارالتعلیم والصنعت کے طلبہ اس وقت ایک کمرہ میں آ گئے، اگر یہ اس سے بھی کم ہوں تو بھی اپنے جوہر کے اعتبار سے بہت بڑی چیز ہیں، اور بہت بڑا کام اللہ ان سے لے

(۱) سورۃ النحل: ۷۰ (۲) سورۃ البقرۃ: ۱۸۹

سکتا ہے، تعداد تو کوئی چیز نہیں: ﴿كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ ۔(۱)

عزیز طلبہ! اس وقت آپ ہلال کے درجہ میں ہیں، اور پھر آپ بزرگ بن سکتے ہیں، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی، انفرادی طور پر تو یہ کہ آپ میں ایک ایک آدمی کوئی بھی ہو، زید، عمرو، بکر کسی کو لے لیجیے، اس وقت وہ ہلال ہے، کل بدر بن سکتا ہے، یعنی اسلام کے اُفق پر، علم کے اُفق پر وہ بدر کامل بن کر چمک سکتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، اور آج جو بدر کامل بن کر چمکے وہ پہلے ہلال ہی تھے، سنت اللہ یہی ہے، اور یہ چاند ہر مہینہ جو بدر کامل بنتا ہے یہ وہی ہے جو پہلے ہلال ہوتا ہے، یہ تو انفرادی معاملہ ہے، اس لیے آپ میں سے ہر ایک اپنے کو اس کے لیے تیار کرے، ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَ أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ ۔(۲)

آپ یہ سمجھئے کہ آپ بدر کامل بن کر چمک سکتے ہیں، اور اجتماعی طور پر یہ کہ اس مدرسہ میں اتنے ہلال جمع ہیں، یہ مدرسہ بدر کامل بنے گا، انشاء اللہ ایک دن آئے گا یہ جگہ بھی ناکافی ہوگی، جتنے ہمارے بڑے بڑے دارالعلوم ہیں پہلے سب ایسے ہی تھے، میں یہاں پہلے بھی آچکا ہوں، اور ابھی جس وقت میں نماز پڑھنے کے لیے نکلا تو میں نے کہا کہ ایک زمانہ میں ہمارا ندوہ ایسا ہی تھا، ہم نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا ہے کہ میدان بہت بڑا تھا اور عمارتیں دو تین تھیں، صرف دو ہی عمارتیں سمجھئے، ایک دارالعلوم کی مرکزی عمارت اور ایک منزل کا ہوسٹل تھا بس، مسجد بھی نہیں بنی تھی اور نیم خام، نیم پختہ ایک عمارت تھی، اس میں کھانا کھلایا جاتا تھا، لے دے کر یہ تین عمارتیں تھیں، آج دارالعلوم کو دیکھ لیجیے جہاں انشاء اللہ آپ آئیں گے اور پڑھیں گے، اسی طریقہ سے آج ہم اس مدرسہ کو دیکھ رہے ہیں، ہوسکتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ ایک بڑا دارالعلوم اور جامعہ بنے گا، اس لیے بچّو! کبھی خیال نہ کرنا کہ ہم کہاں پڑھتے ہیں، ہم بھی کسی بڑے دارالعلوم میں ہوتے، دیوبند میں ہوتے، ندوہ میں ہوتے، وہ بھی کبھی ایسے ہی تھے، اور جب ایسے تھے تو شاید بہت سی حیثیتوں سے زیادہ اچھے تھے، تعلیم زیادہ پختہ ہوتی تھی اور طلبہ کے اندر زیادہ خوبیاں تھیں اور معلمانہ شان اور روح تھی، اس بڑے اور چھوٹے ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، آپ کبھی اپنے دارالتعلیم پر حقارت کی نظر نہ

(۱) سورۃ البقرۃ:۲۴۹ (۲) سورۃ آل عمران:۱۳۹

ڈالیں، بڑی ناشکری ہوگی اور اللہ کو یہ بات بہت ناپسند ہے، اور کبھی اپنے اوپر بھی حقارت کی نظر نہ ڈالیں، اساتذہ کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنا ہی نہیں چاہیے، ان کو کچھ کہنے کی بات نہیں، لیکن یہاں کی کسی چیز کو چھوٹا اور حقیر نہ سمجھئے، اللہ کے یہاں جس کی نسبت بڑی ہے وہ چھوٹا بھی بڑا ہے، اور جس کی نسبت چھوٹی ہے وہ بڑا بھی چھوٹا ہے، جب نسبت لگ گئی ہماری آپ کی اس بڑی ذات سے جس سے بڑی کوئی ذات نہیں، اور اس کے بعد جس کے متعلق کہا گیا ہے: ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''، اس سے، اس کے علم سے ہماری نسبت قائم ہوگئی تو پھر دنیا میں کوئی چھوٹا چھوٹا نہیں، پھر یہ سب آنکھ کے تارے ہیں، جیسے ذوق کا شعر ہے ؎

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

آنکھ کا تل ہی کیا ہے، لیکن سارا آسمان اس میں نظر آتا ہے، تو آنکھ کا تل ہونا پتھر کے سل ہونے سے بہتر ہے، آپ چشمِ اسلام کے تل بنیں جس سے آسمان دکھائی دے، آسمان کی رفعتیں جس کے اندر آئیں، اور ایک جامد پتھر نہیں جو دیکھنے میں بہت مہیب، بہت عظیم، لیکن کچھ بھی نہیں۔

وقت مختصر ہے، دو تین باتیں جو فوری طور پر ذہن میں آئی ہیں وہ میں بچوں سے کہتا ہوں، طلبہ ہی ہمارے زیادہ تر مخاطب ہیں۔

صرف ونحو میں پختگی پیدا کریں

پہلی بات تو یہ کہ میرے عزیزو! میں اکثر مدرسوں میں جاتا ہوں اور وہاں مجھے خطاب کرنے کا موقع بھی ملتا ہے، میں ہر جگہ یہ کہتا ہوں کہ اس وقت عام طور پر استعدادیں بہت خام ہو رہی ہیں، حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے کہ جب سے دارالعلوم دیوبند کی عمارت پختہ ہوئی استعداد خام ہوگئی، اور جب دارالعلوم کی عمارت خام تھی تو استعداد پختہ تھی، یہ میں نے مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے، تو اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ استعدادیں پختہ ہوں۔

بنیاد کو آپ جانتے ہیں کہ اس میں صرف چند اینٹیں رکھی جاتی ہیں، اور پھر اس پر ایک بلند و بالا عمارت کھڑی ہوتی ہے، ایسے ہی علوم عربیہ کی نیو نحو و صرف ہے، عربی علوم کی پوری عمارت صرف و نحو پر کھڑی ہے، اگر نحو و صرف آپ کی درست ہے تو خوب مزے کیجیے، پھر آپ کی محنت اور اللہ کی توفیق کا مسئلہ ہے، آپ جو چاہیے بن جائیے، فقیہ بن جائیے، محدث بن جائیے، ادیب بن جائیے، اگر صرف و نحو ٹھیک ہے، عبارت درست پڑھتے ہیں، وجوہ اعراب آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں، تو پھر آپ ہر چیز کا مطالعہ بے تکلف کر سکتے ہیں، اس لیے صرف و نحو کی خامی درست کیجیے، اور اس کا بہت اچھا موقع ان مدرسوں میں ہے جہاں طلبہ کی تعداد بہت کم ہے، وہاں مشق کرنے اور کرانے کا موقع ملتا ہے، اور جہاں پچاس پچاس طلبہ ہیں، وہاں مہینوں استاد بہتوں کو پہچان تک نہیں پاتا، دو چار جو سامنے ہوتے ہیں وہی پڑھتے رہتے ہیں، اور استاد انہیں سے پوچھتا رہتا ہے، باقی سب چھپے رہتے ہیں، جیسے کیری آم کی پتیوں میں چھپ جائے، اس لیے بڑے مدارس میں سب پر پوری اور یکساں توجہ نہیں ہو پاتی، اس لیے آپ کے لیے یہاں پر بڑا اچھا موقع ہے کہ آپ اپنی استعداد درست کیجیے، ان استادوں سے فائدہ اٹھایئے، یہ استاد بالکل آپ کے لیے کافی ہیں اور کافی سے زیادہ ہیں، یہ آپ کو پوری تعلیم دے سکتے ہیں، اور پوری رہنمائی کر سکتے ہیں، اور پھر آگے جہاں آپ کو توفیق الٰہی لے جائے، وہاں جائیے، دیوبند جائیے، ندوہ جائیے، آپ انشاء اللہ ہر جگہ اچھے اور ممتاز رہیں گے۔

اس لیے میری ضروری بات یہ ہے کہ ابھی سے صرف و نحو ٹھیک کرو، تھوڑی سی محنت کر ڈالو، اس وقت محنت کرلو گے تو عمر بھر آرام اور چھٹی، اور اس وقت چھٹی مناؤ گے تو عمر بھر محنت، اب تمہیں اختیار ہے، یا یہ اختیار کرلو یا وہ اختیار کرلو، اس وقت محنت نہ کرو گے تو ہر جگہ منہ چھپاتے پھرو گے کہ کہیں کوئی پوچھ نہ لے، کوئی عبارت نہ پڑھوالے، کوئی نماز کے لیے نہ کھڑا کر دے، جمعہ کا خطبہ نہ پڑھوا دے، کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے لوگ چلے جاتے ہیں، اگر اس میں اطمینان ہو گیا تو مجمع میں شیر کی طرح بیٹھو، نہیں تو کہیں پانی پینے کے بہانے، کہیں پیشاب کے بہانہ سے اٹھ کر چلے گئے، کہیں دیکھا کہ مولوی صاحب کے پاس عینک نہیں ہے، شاید ہم

سے عربی کا اخبار پڑھائیں، کھسک گئے، چلے گئے چور کی طرح، ہمیشہ وہ آدمی چور کی طرح رہتا ہے جس میں اصلاحی کمزوری ہوتی ہے، بہت سے ایسے لوگوں سے سابقے پڑتے ہیں، اگر کمزوری نہیں ہے تو بیٹھے ہیں، ضرورت ہوگی پڑھ دیں گے، یقیناً کوئی شخص ہمہ داں نہیں ہوتا، بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اس میں کہہ دو، ہمیں زیادہ معلومات نہیں، موقع نہیں ملا، یہ کوئی عیب کی بات نہیں، بڑے بڑے عالم کہہ دیا کرتے ہیں: لا أدري لا أدري، اور علم اور علماء کی شان یہی ہے، ہم نے تو ایسے لوگوں سے جو اپنے فن کے امام تھے سنا ہے: لا أدري، اس لیے بے تکلف کہہ دیجیے کہ اس میں ہمیں تحقیق نہیں، اور کسی سے پوچھ لیجیے۔

تمنا اور آرزو

دوسری بات یہ ہے کہ ابھی سے کوئی بات دل میں طے کرلو کہ اللہ ہمیں ایسا بنادے، اور اس سے مانگو، اور خوب سوچ سمجھ کر تمنا کرنا، بعض وقت کی تمنا اللہ کے یہاں قبول ہو جاتی ہے، پھر آدمی پچھتاتا ہے کہ اوہو! ہم نے اس سے بڑی کوئی چیز مانگی ہوتی۔

ہم کو بچپن میں مصنف بننے کی بڑی تمنا تھی، ہمارے گھر میں تصنیف وتالیف کا ماحول تھا، عورتیں تک دن رات تصنیف وتالیف کرتی تھیں، شاعری کرتی تھیں، اس لیے ہم نے بھی یہی تمنا کی کہ لکھنے پڑھنے لگیں اور کوئی چیز چھپے، تو ہماری ملاّ کی دوڑ مسجد تک تھی، اب افسوس ہوتا ہے کہ عارف باللہ یا کچھ اور تمنا کرتے تو اللہ ہمیں اس میں کچھ نصیب فرما دیتا اور اللہ ہم سے بھی دین کا کوئی بڑا کام لے لیتا، تو بھئی! تم احتیاط سے کام لینا، کہیں دعا کرو کہ تحصیلدار ہو جائیں، ملازم ہو جائیں، ڈپٹی کلکٹر ہو جائیں، اور وہ گھڑی قبولیت کی ہو اور اس کے بعد تم ہو جاؤ گے، پھر کیا ہوگا؟ اس لیے ابھی سے اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا اور تمنا کرو کہ وہ تمہیں دین کا خادم بنائے، عالم ربانی بنائے، اس کے اندر سب کچھ آجاتا ہے، جب وہ تم کو عالم بنائے گا تو رزق کا پہلے سے انتظام کرے گا، وہ اپنے کہلانے والوں اور اپنا کام کرنے والوں کو ذلیل ورسوا نہیں کرتا کہ تم سے کام بھی لے اور تم کو روٹی بھی نہ دے، دنیا میں بھی کوئی ایسا نہیں کرتا، حاجی صاحب کے یہاں جو نوکر ہے اس کو سب کچھ ملتا ہے، تنخواہ بھی ملتی ہے اور

ضرورت پڑنے پر روٹی بھی ملتی ہوگی، کھانا بھی وقت پر ملتا ہوگا، تو کیا معاذ اللہ، اللہ میاں ہی ایسے ہیں جو کام تو پورا پورا لیں اور کھانے کے وقت کہیں کہ اب دوسرے دروازے پر جاؤ؟ اللہ سے ایسی بدگمانی کہ کام اپنا لے گا، علم دین کی خدمت کرائے گا، اور روٹی جمع کرنے کے لیے، کھانا لانے کے لیے تم کو دنیا داروں کے پاس بھیجے گا؟ ہرگز نہیں، بلکہ انشاء اللہ تمہارے دسترخوان پر لوگ کھائیں گے، کتنے لوگوں کا رزق اللہ تمہارے وہاں رکھے گا، تو اس وقت نیت کرلو، تمنا کرلو، ایک نبی ہونے کی تمنا نہ کرنا بھئی، نبی کوئی نہ ہوگا، جو کہے وہ دجال، کذاب، شیطان ہے، خدا بننے کا تو خیر سوال ہی نہیں، لیکن نبی کے علاوہ سب کچھ آدمی بن سکتا ہے، اگر آدمی سچے دل سے تمنا کرے کہ اللہ ہمیں غوث اور قطب بنادے تو اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں، وہ ہر دور میں بناتا رہا ہے، اس زمانے میں بھی کسی کو بنادے گا، مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ نمازوں کا اہتمام کرو، مسجد میں پہلے سے جانا، دعا میں مشغول رہنا، اللہ کا نام لینا، استادوں کا ادب کرنا، اپنے محسنوں کا، بڑوں کا ادب کرنا، ان کے ساتھ تواضع اور خاکساری سے پیش آنا، کتابوں تک کا ادب کرنا، ہمارے علم میں استادوں کا ادب بھی شرط ہے، اور کتابوں کا ادب بھی شرط ہے، اور ہمارے اسلاف جو گزرے ہیں جنھوں نے ہم تک علم پہنچایا ہے، ان کا احسان ماننا بھی شرط ہے، ان کا ادب کرنا شرط ہے، یہ وہ دنیاوی علم نہیں ہے کہ کتاب چاہے پاؤں کے نیچے رکھو اور کاغذ چاہے جوتے کے اندر، اگر ذہین و محنتی ہو تو کامیاب ہو جاؤ گے، حالانکہ ان لوگوں میں بھی کسی نہ کسی درجہ کا احترام اور تھوڑا بہت خیال ہوتا ہے، اور اب بھی یورپ اور امریکہ میں روشن خیالی کے باوجود کتابوں کا ادب ہے، استادوں کا ادب ہے، محسنوں اور بڑوں کا ادب بہت ہے، وہ بیچارے جنھوں نے اسکولوں اور کالجوں میں تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی ہے اور کم پڑھے لکھے لوگ ہیں، وہ تم سے غلط کہتے ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں کچھ نہیں، نہ کتاب کا ادب ہے اور نہ استاد کا ادب۔

استادوں کا ادب، کتابوں کا ادب، اپنے محسنوں کا ادب اور بزرگوں کا ادب، اور تھوڑی سی محنت، اللہ سے دعا اور عبادت کا اہتمام ابھی سے کرو، ان لوگوں کو اللہ نے چمکایا، اور جو لوگ بھی دنیا میں چمکے ان کے بچپن کے حالات ایسے ہی تھے، امام غزالی کے حالات

پڑھو، ان کے اندر صلاحیت، خدمت کا جذبہ، بزرگوں کا ادب، اپنے کو سب سے کم سمجھنا، دعا میں دل لگنا، نماز اچھی طرح پڑھنا، اور اس طرح کی بہت سی خوبیاں ان کے اندر بچپن ہی سے تھیں، اور بھی بزرگوں کے تفصیلی حالات پڑھیے، وہ بچپن کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے آسمان پر چاند ستارے بن کر چمکے۔

اخلاصِ نیت

تو عزیز طلبہ! یہ تھوڑی سی باتیں ہیں جن کو ذہن میں رکھو گے تو انشاء اللہ بہت فائدہ محسوس کرو گے، اور یاد رہے گا تو کبھی یاد کرو گے کہ ہم نے یہ بات کبھی سنی تھی، اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنی نیت درست کرو، اور اپنے اندر اخلاص پیدا کرو، ہم اپنے طلبہ سے بار بار یہ کہا کرتے ہیں، ہم یہی سمجھ رہے ہیں کہ آپ بھی دارالعلوم ندوہ کے کسی درجہ کے طالب علم ہیں، اور میں ندوہ کے طلبہ کے کسی جلسہ سے مخاطب ہوں۔

بے نیتی اور بد نیتی

بھائیو! دو چیزیں ہیں، ایک بد نیتی اور دوسری بے نیتی۔ بد نیتی کم ہوتی ہے، اور کون بد نیتی کرے گا کہ یہ علم پڑھ کر ہم یہ نقصان پہنچائیں گے اور عربی کے ذریعہ سے مکاری کریں گے، حاشا وکلا یہ بات کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی، لیکن بے نیتی بہت عام ہے، سرے سے کوئی نیت نہیں کرتا، جب ہم ندوہ میں پڑھاتے تھے تو اکثر طلبہ سے پوچھا کرتے تھے کہ بتاؤ کس لیے پڑھ رہے ہو؟ کوئی طالب علم کہتا کہ کوئی نیت نہیں، کچھ طلبہ کہتے: ابھی تک سوچا نہیں، غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، اچانک پہلی بار ہمارے سامنے یہ سوال آیا ہے، اور کچھ سیدھے سادھے لڑکے ہوتے تھے، وہ ویسی ہی سیدھی سادی بات کر دیا کرتے تھے، ان کے گھروں میں جو کام ہوتا تھا اسی کو بتا دیا کرتے تھے، کچھ کہتے ڈاکٹر بننا چاہتا ہیں، وکیل ہونا چاہتے ہیں، جو ذرا ہوشیار اور سیانے ہوتے تھے وہ سوچ کر جواب دیتے تھے، چاہے ان کے دل میں نہ ہو کہ ہمیں عالم بننا ہے، تو ابھی سے اچھی نیت رکھو کہ ہم اللہ کے دین کو پڑھ کر، اس کو سمجھ کر اس کی تبلیغ کریں

گے، دین کی خدمت کریں گے، تعلیم پھیلائیں گے اور اپنی عقل بھی درست رکھیں گے۔

بے دینی اور بے شعوری دو عذاب

ہم مسلمانوں کی حالت موجودہ دور میں بہت ہی گئی گزری ہے، بہت کم زمانے ایسے گزرے ہیں جس میں مسلمانوں کی حالت ایسی گئی گزری اور خطرناک رہی ہو، دور حاضر میں تمام دنیا کے مسلمانوں پر ادبار سوار ہے، ہر جگہ ان کی بازی لگ رہی ہے، ہر جگہ اسلام کے دشمن ان پر کامیابی حاصل کر رہے ہیں، ان کے قلعے کے قلعے فتح کرتے چلے جارہے ہیں، بے عقلی الگ ہے، بے دینی الگ ہے، اس کا بھی نمونہ سامنے آتا رہتا ہے۔

تو بھئی مسلمانوں پر اس وقت دو مصیبتیں ہیں: ایک بے دینی کی، اور دوسری بے دانشی، بے شعوری، بے عقلی کی، بے دینی سب سے بری چیز ہے، لیکن عقل تو کچھ ہوتی، معاملہ کہیں کا آپ یہاں پاگل ہوئے چلے جارہے ہیں، ارے بھائی! تمہیں کیا مطلب؟ تم سے کیا مطلب؟ کیا تم سے پوچھ کر کیا گیا؟ کیا نقصان تمہیں پہنچے گا؟ ایک ملک میں ایک واقعہ ہوا، ان کو خود بھگتنا پڑے گا، تمہیں کیا دیوانے کتے نے کاٹا ہے تم یہاں پاگل ہوئے چلے جارہے ہو؟ اور کسی طرح چھٹی ہی نہیں ملتی، کسی طرح دل ہی نہیں بھرتا، دل ٹھنڈا ہی نہیں ہوتا، یہ بے عقلی ہے، اور یہ دو عذاب بے دینی اور بے عقلی کے جب کسی قوم پر آجائیں تو بس پھر اللہ ہی بچائے تو بچائے، ورنہ ایسی قوم بہت ذلتوں کا شکار ہوتی ہے، بڑی بڑی مصیبتوں کا شکار ہوتی ہے۔

عقل کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا

ہمیں یہ سب کام کرنا ہے، دین بھی پھیلانا ہے اور عقل بھی درست کرنا ہے، عقل بھی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، یہ نہ سمجھنا کہ کچھ نہیں صرف دین ہی دین چاہیے، دین بھی عقل کے بغیر پورے اور مکمل طور پر نہیں آتا، اسی لیے آنحضرت (ﷺ) نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو دعا دی تھی: "اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ" [1] (اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطا فرما)،

---

(۱) رواه البخاري، كتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء، حديث رقم ۱۴۳

قرآن شریف میں ہے: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْراً كَثِيْرًا﴾ (۱)، ''جس کو حکمت ملے اس کو بہت بڑی دولت مل گئی''، حکمت بھی اللہ کی نعمت ہے، عقل بھی نعمت ہے، ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ﴾ (۲) ﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۳)، ہر جگہ تفکر تفکر، غور کرو، غور نہیں کرتے، تم کیسے آدمی ہو، غور کرو، اللہ نے کس لیے بنایا ہے؟

معلوم ہوا دماغ بہت بڑی چیز ہے، دماغ سے کام لینا چاہیے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ دین کی طرف رجحان ہو، عقل کو بالائے طاق رکھ دو، کہتے ہیں عقل کا اب کوئی کام نہیں، حالانکہ عقل کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا، اسی لیے عورتوں کو ناقصات العقل کہا گیا ہے، عقل کی کمی کی وجہ سے نقص دین ہوا ہے، تو ہمیں کامل العقل، کامل الدین ہونا چاہیے، اور تمہارا یہی مشن ہونا چاہیے کہ لوگوں میں اور مسلمانوں میں دینداری پیدا کرو، اور عقل وہوش پیدا کرو، واقعات پر غور کرنا، موازنہ کرنا، جو مناسب اور مفید بات ہو اس کو کرنا، اور ترک مالایعنی کرنا، تمہارے ہندوستان میں لایعنی کام ہوتا ہے، اخبار آگ لگاتے رہے اور عوام جامہ سے باہر ہوتے رہے، کہیں کسی کو پھانسی دی گئی، ہم سے مطلب ہم سے کوئی پوچھنے آیا تھا؟ ہم نے کہا تھا نہ کرو؟ یا ہم سے کوئی رائے لی گئی؟ ہماری رائے کا کوئی وزن ہے؟ پہلے یہاں اپنی فکر کرو، سمجھ لو کہ یہاں کیسے کیسے فسادات ہو رہے ہیں، کیا ہو رہا ہے، اور تم کو لغو بات سے فرصت نہیں، بالکل فضول، احمقانہ، مجنونانہ بات ہے، تمہیں اس کا بھی مقابلہ کرنا چاہیے، یہ ایک ہذیانی کیفیت ہے، ایک فتور دماغی ہے، فاتر العقلی کی بات ہے، بڑی خطرناک بات ہے، تمھیں اس کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے، جو بات غلط ہے غلط ہے، چاہے کوئی راضی ہو یا ناراض ہو۔

دین کے ساتھ صحیح عقل ہوتی ہے

بھائیو! تمہاری عمر اور تمہاری حیثیت سے بہت آگے کی بات ہے، لیکن کیا کہیں جو بات دل میں ہوتی ہے زبان پر آ ہی جاتی ہے، اس لیے یہ بات نکل گئی، باقی مسلمانوں کی حالت دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ دین بھی گیا، عقل بھی گئی، اور پھر دعویٰ دین کا ہے، حالانکہ دین کے ساتھ صحیح عقل

---

(۱) سورۃ البقرۃ:۲۶۹ (۲) سورۃ النساء:۸۲ (۳) سورۃ آل عمران:۱۹۱

ہوتی ہے، صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر صحیح الدماغ اور عالی دماغ کوئی دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا، اسی طریقے سے ہمارے تمام اسلاف، اولیائے کرام، مشائخ عظام اور مبلغین داعیان اسلام سب کے سب اعلیٰ درجہ کے اور اعلیٰ دماغ کے لوگ تھے، ان کی ذہانت کو کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا۔

ایک اپنی حالت ہوگئی ہے کہ کچھ ٹھیک ہی نہیں، ابھی میں گلولی جارہا تھا، میری کار کے آگے آگے ایک موٹر چل رہی تھی، اور موٹر کا قاعدہ ہے کہ آگے ہو تو بہت دور تک ساتھ ہوتا ہے، اس میں پٹرول بھرا ہوا تھا اور لکھا ہوا تھا: Highly Inflammable، بہت جلد اس میں آگ لگتی ہے، ہم نے کہا: ارے یہ تو مسلمانوں کا حال اور ان کا مزاج ہے، یہ موٹر ہمارے سامنے کیا چل رہی ہے، مسلمان اور مسلمان قوم کا نمائندہ چل رہا ہے، بھئی ہم سے ہوشیار رہنا، آگ وآگ چنگاری ہم سے دور رکھنا، ہم بہت جلدی آگ پکڑ لیتے ہیں، ہمارے اندر فوراً شعلے پیدا ہو جاتے ہیں، یہ پٹرول کی تعریف تو ہوسکتی ہے، ہر وقت پٹرول پٹرول، روئی تیل اور بارود ایک ساتھ جمع ہیں، کسی وقت کسی نے ذرا سی چنگاری دکھائی، یا دیا سلائی آس پاس رکھی ہوئی ہے، بس اس میں آگ لگ گئی، قوم اس طرح سے بارود بن کر دنیا میں نہیں رہ سکتی، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، جب جستجو کا موقع ہو تو گرم ہونا، لیکن جب گفتگو کا موقع ہے تو کیوں گرم ہوتے چلے جارہے ہو؟ جو جی میں آیا سنا دیتے ہیں، جس کو ذرا سی بات سمجھ میں نہیں آئی بس ہزار صلواتیں سنا ڈالیں، تبرا کہنا علماء کے خلاف، زہر اگلنا مسلمانوں کی عادت بن گئی ہے، جس سے ذرا ناراض ہوئے بس اس کی خیر نہیں، یہ سب پٹرول کی تعریف ہے، بارود کی تعریف ہے، عاقل بالغ انسانوں اور مسلمانوں کی تعریف نہیں۔

موقع بے موقع یہ چند باتیں نکل گئیں، اللہ ان کو قبول فرمائے، اور ہم سب کو اپنی رضا کے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، خدا اس مدرسہ کو بہت ترقی دے، ہمیں امید ہے وہ بہت ترقی دے گا اور ہم دیکھیں گے، کانپور والوں کا فرض ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم ہوا ہے، اس کی قدر کریں، اس کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں، انہیں کا فائدہ ہے، ملت کا فائدہ ہے، بس ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ (۱)

---

(۱) ۱۹۷۹ء میں دار التعلیم والصنعت (کانپور) میں طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا احمد علی خان قاسمی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ، (شمارہ ۲۵ رجون، ۱۰ رجولائی ۱۹۷۹ء)۔

اصل مسئلہ ترجیح کا ہے

عزیزو! جب کوئی کہیں سے آتا ہے تو پہلے سلام کرتا ہے، ہم آپ کے پاس دور سے آئے ہیں، ہمیں بھی چاہیے آپ کو سلام کریں، اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں اس کی حیثیت محض سلام کی ہے، باقی سلام کے بعد کلام بھی ہوتا ہے، وہ شاید بعد میں ہو، میں تو اس وقت صرف ہدیہ سلام پیش کرتا ہوں، جیسا کہ حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً﴾ [1]، (جب تم گھروں میں داخل ہونے لگو تو اپنے لوگوں کو جو لوگ وہاں موجود ہوں، ان کو سلام کرلیا کرو، جو دعا کے طور پر اللہ کی طرف سے مقرر ہوا ہے، بابرکت اور عمدہ چیز ہے)۔

موقع سے فائدہ اٹھائیے

عزیزو! آج کل عام رواج ہے، جب ادارے ہوتے ہیں تو باہر کے لوگ آتے ہیں، بلائے بھی جاتے ہیں، خود بھی آتے ہیں، لیکن بہت سے آنے والوں کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیوں آئے ہیں؟ اور اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اسی طرح بہت سے رہنے والوں کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ آمد محض ایک رسمی ورواجی آمد ہے یا اس سے کوئی دینی علمی فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ ہماری حیثیت اور ہمارے رفقاء کی حیثیت باہر سے آنے والے مہمانوں یا مشاہیر کی آمد یا لیڈروں کی آمد نہیں، بلکہ اپنوں کی آمد ہے، اس جامعہ کا تعلق شروع سے ندوۃ العلماء اور وہاں کے

---

(۱) سورۃ النور: ٦١

کارکنوں سے رہا ہے، بلکہ حقیقت میں اس کی بنیاد ایک ندوی فاضل مولانا عبد الحمید صاحب ندوی مرحوم نے ڈالی ہے، وہ یہاں آئے، انھوں نے کچھ تعلیمی خدمت شروع کی تو یہ خدمت برگ وبار لائی، جو لوگ آج جامعہ کے روح رواں ہیں، وہ زیادہ تر توان ہی کے فیض یافتہ ہیں، تو گویا اس جامعہ کی بسم اللہ ہی ہوئی ندوہ کے تعلق سے، پھر اس کے بعد جب جامعہ کی بنیاد ڈال دی گئی تو ندوہ ہی کے تعلق والوں کو بلایا گیا، اور اس کے بعد برابر آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہے، یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ندوہ اور غیر ندوہ میں کچھ فرق ہے، بلکہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کم سے کم اس وقت جو لوگ آئے ہیں، یہ سب گھر ہی کے لوگ ہیں، ایسے ہی ہیں جیسے ایک خاندان کی شاخیں ہو جاتی ہیں، کوئی قریب رہتا ہے، کوئی دور رہتا ہے، ایک شاخ کے لوگ دوسری شاخ کے لوگوں سے ملنے جاتے ہیں، وہ ملنا خاندانی قسم کا ہوتا ہے، ویسے ہی خاندانی قسم کا سفر یہ بھی ہے، اور اس میں اپنے ایک عزیز کی تقریب میں شرکت کی نیت بھی شامل ہوگئی ہے، تو آپ ہم لوگوں کو باہر کے اجنبی یا تماشائی کی حیثیت سے نہ دیکھیے کہ آپ کہیں کہ فلاں بھی آیا، فلاں بھی آیا، بلکہ ذہن میں یہ ہونا چاہیے کہ یہ لوگ دو چار دن رہیں گے، ان سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اب جامعہ اس درجہ کو پہنچا کہ دور دور سے لوگ آتے ہیں، اور اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اپنی چیز سمجھتے ہیں۔

اسی کے ساتھ نیت بھی درست کرنا بہت ضروری ہے، اور ہماری بھی نیت یہ ہونی چاہیے کہ ہم اپنے عزیزوں سے اور اپنے خاندان کے بچوں سے ملنے آئے ہیں، آپ کی بھی نیت یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے خاندان میں کچھ بڑے، کچھ ہمارے مشیر یا جن کو خدمت کا جذبہ ہے، شوق ہے، وہ آئے ہیں، ان کے دوران قیام میں جلسے ہوں گے، تقریریں ہوں گی، عمومی خطاب ہوں گے، شاید ہمارے دوست منیری صاحب نے اس کا نظام بنایا ہو، لیکن اس کے علاوہ ہمارے ساتھیوں سے آپ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، ان میں بعض دار العلوم کے استاذ ہیں اور وہ آپ سے عمر میں اور تعلیم میں قریب ہیں، مناسبت رکھتے ہیں، ان میں وہ

تفاوت نہیں ہے جو ہمارے آپ کے درمیان ہے، آپ ان کے ساتھ زیادہ بے تکلفی سے مل بھی سکتے ہیں، بات بھی کر سکتے ہیں، ان کو بتلایئے کہ آپ نے اب تک کیا پڑھا؟ پھر ان سے پوچھیے اور مشورہ لیجیے کہ اس کے بعد کس طرح پڑھیں؟ کس ترتیب سے پڑھیں؟ وہ کتابوں کا انتخاب کر دیں، ان سے کہیے کہ ہمارا فلاں مضمون کچھ کمزور ہے، کچا ہے، یا فلاں مضمون سے زیادہ مناسبت نہیں، کیسے مناسبت پیدا ہو سکے گی؟ اس کے مبادی کیا ہیں؟ کس طرح شروع کریں؟ اس سے کس طرح مناسبت پیدا کریں؟ سب سے پہلے اور سب سے اہم تو تفسیر، حدیث، فقہ اور صرف ونحو وغیرہ کے مضامین ہیں، اس کے بعد جس کو شوق ہو وہ ادب وانشاء کے بارے میں بھی مشورہ کر سکتا ہے، اس وقت جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں، الحمدللہ وہ لکھتے پڑھتے ہیں، ان لوگوں سے پورا فائدہ اٹھایئے، ان کے مضامین چھپتے ہیں، آپ لوگ بھی دیکھتے ہوں گے، تین چار دن وہ لوگ یہاں قیام کریں گے، ان دنوں میں ذہن کو حاضر رکھیے اور اس وقت کو قیمتی سمجھئے، کوشش بھی کیجیے، دعا بھی کیجیے کہ اتنی دور سے جو سفر ہوا ہے، یہ مفید اور کارآمد ہو، یہ نتیجہ خیز ہو، اس لیے کہ یوں ہی کوئی اتنی دور کسی سے ملنے کے لیے نہیں جایا کرتا ہے، جب کوئی ملنے آتا ہے اتنی دور سے تو بہت غنیمت سمجھنا چاہیے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، آپ لوگوں کو اس سے خوش ہونا چاہیے، جیسے سیاسی لوگ خوش ہوتے ہیں بڑے بڑے لیڈروں کے آنے پر، آپ کو خوش ہونا چاہیے اساتذہ اور ماہرین فن کی آمد پر، ایسے مواقع کم ملتے ہیں، اور مل جائیں تو انہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

ہاتھی یا علم حدیث...؟

ایک لطیفہ سناتا ہوں، ایک مرتبہ لکھنؤ سے بارہ بنکی گیا، جو لکھنؤ سے پندرہ سولہ میل دور ہوگا، لکھنؤ سے میں وہاں گیا تو میرا وہاں خطاب ''پیام انسانیت'' کے سلسلہ میں تھا، اور اسی روز وہاں سابق وزیر اعظم مسز گاندھی آئی ہوئی تھیں، لوگ منتشر تھے، تقسیم ہو گئے تھے، اکثر لوگ وہاں سے تماشا ہی دیکھنے کے لیے چلے گئے، کیوں کہ بارہ بنکی چھوٹی جگہ ہے، چھوٹا ضلع

ہے، اس میں وزیر اعظم مسز گاندھی آئیں تو بڑی بات تھی، جتنے مجمع کی توقع تھی اتنا مجمع ہمارے جلسہ میں نہیں تھا، پھر بھی بہت سے لوگ آئے وہ قابل داد تھے، تو میں نے ان سے کہا کہ آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں وہ حسب حال ہے، ایک مرتبہ امام مالکؒ موطا کا درس دے رہے تھے، مدینہ میں ایک ہاتھی آ گیا، اور مدینہ میں ہاتھی ہوتا نہیں، عرب ہی میں ہاتھی نہیں ہوتا، شور مچ گیا، ہاتھی آیا ہاتھی، جاء الفیل، جاء الفیل، وہ ہمیشہ پڑھ رہے تھے: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾ (۱) انھوں نے اور جانور تو دیکھے تھے، گھوڑا تو ان کے گھر کی چیز تھی، اونٹ بھی ان کے گھر کی چیز تھی، ہاتھی نہیں دیکھا تھا، تو بے اختیاری اور غیر ارادی طریقہ پر لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے، یہ امام مالکؒ کا حلقۂ درس تھا، وہاں بہت منتخب لوگ تھے، پھر بھی لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے، لیکن ان کے ایک شاگرد یحییٰ حلقۂ درس سے نہیں اٹھے، وہ امام مالکؒ کی خدمت ہی میں بیٹھے رہے، امام مالکؒ نے کہا کہ اے یحییٰ! تم نہیں گئے، تمہارے ملک میں بھی تو ہاتھی نہیں ہوتا؟ کہا: ہم ہاتھی دیکھنے نہیں آئے ہیں، آپ کو دیکھنے آئے ہیں، انھوں نے غالبًا دعا دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی وجہ سے اس سارے شمالی افریقہ میں امام مالکؒ کا مسلک پھیلا اور اس علاقہ کے سبھی لوگ مالکی ہیں، یہ موجودہ روایت موطاً کی جو ہم تک پہنچی ہے، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت ہے، اور ایسا کم ہوتا ہے کہ علاقہ کا علاقہ، ملک کے ملک ایک مسلک کے ہوں، لیکن آپ تصور کیجیے کہ لیبیا جس میں مالکیہ کی بڑی تعداد ہے، لیبیا سے شروع ہو کر جو شمالی پٹی چلی گئی ہے، مراکش پر بلکہ آبنائے جبل الطارق پر ختم ہوتی ہے، یہ پورا علاقہ سو فیصد مالکی ہے، بے شک اس میں ابن بادیس کا بھی بہت بڑا دخل ہے، جس نے مذہب مالکی کو سرکاری مذہب بنا دیا، لیکن بیج لایا ہوا ہے یحییٰ بن یحییٰ کا، ایک بات تھی، ذرا سی بات اللہ کو پسند آئی، ہاتھی دیکھنے نہیں گئے تو ان کے علم اور ان کی ذات سے اتنی برکت ہوئی، یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے امام مالکؒ کے درس حدیث کو ہاتھی کا تماشا دیکھنے پر ترجیح دی۔

---

(۱) سورۃ الفیل: ۱

ترجیح کی بات

عزیزو! سارا معاملہ ترجیح کا ہے، تم کس کو کس پر ترجیح دیتے ہو؟ سارا قرآن اسی سے بھرا ہوا ہے، اللہ کے حکم کو ترجیح دیتے ہو یا خواہش کو ترجیح دیتے ہو؟ رسول کے کہنے کو ترجیح دیتے ہو، یا رسم ورواج کو ترجیح دیتے ہو؟ مصلحت کو ترجیح دیتے ہو یا حکم الٰہی کو ترجیح دیتے ہو؟ اسلام کا معاملہ شریعت کا معاملہ ہے، یحییٰ بن یحییٰ نے ہاتھی پر امام مالکؒ کو ترجیح دی تو اللہ نے اور بہت سے داعیوں پر، ناشرین علم پر ان کو ترجیح دی، اور جس کتاب کے وہ حامل وشارح بنے اس کو اچھی اچھی کتابوں پر ترجیح دی گئی، سب کتابیں اچھی ہیں، ہدایہ اگر وہاں پہنچتی یا وہاں مسند امام ابوحنیفہؒ ہوتی وہ بھی خیر، سب سراپا نور، لیکن صرف اس ایک عمل کا اثر یہ ہوا کہ اس حامل علم کو دوسرے حاملین علم پر ترجیح دی گئی، سارا معاملہ ترجیح کا ہے، آج بھی اتفاق سے آپ کے شہر میں ایک بڑی شخصیت آئی ہے، آج ہی اللہ نے آپ کو ایک منظر دکھلایا، امتحان میں تو نہیں ڈالا کہ وہی وقت ہوتا ہمارے بھی آنے کا، لیکن منظر آپ کو دکھایا کہ یہاں ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت آئی اور ہم طالب علم بھی آئے، اگر آپ کے دل میں ان طالب علموں کی عزت ہے، ہمارے آنے سے آپ کو زیادہ خوشی ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی یہ خوشی رنگ لائے گی، یقین مانیے، اگر آپ نے کہا: الحمدللہ، آج ہمارے کچھ بزرگ، ہمارے کچھ مشفق، ہمارے کچھ خیر خواہ ہمارے لیے دعا کرنے والے لوگ آئے ہیں، ہم بڑے خوش نصیب ہیں، تو یہ بات اللہ کو پسند آئے گی، کچھ تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے معاملہ میں علم نافع کا فیصلہ فرماوے۔

شعائر اللہ کا احترام

یہ جو کچھ آپ شریعت کو دیکھتے ہیں، یہ سب احترام کی باتیں ہیں، کرنا کرانا تو بعد کا مرحلہ ہے اور ضروری ہے، لیکن پہلا مرحلہ احترام کا معاملہ ہے، اللہ اور رسول کو، اللہ ورسول سے نسبت رکھنے والی چیزوں کو کس نظر سے دیکھا جائے، یہی حقیقت ہے شعائر اللہ کی، اللہ

رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ [1]، تو تعظیم شعائر اللہ دلیل ہے قلوب میں تقوی کی، قلب میں اللہ کی عزت ہے تو جو چیز اللہ کے لیے کہلاتی ہے اس کے لیے بھی عزت ہوگی، ایسے ہی ہم لوگ کوئی چیز نہیں اور کون کیا چیز ہے، سوائے اللہ کے رسول کے اور اللہ کے رسول کے صحابہ کے اور کبار اولیاء اللہ کے، باقی سب برابر ہیں، ایک طرح کے لوگ ہیں، لیکن سارا انحصار جو ہے وہ نظر پر ہے، طریقۂ فکر پر ہے، نقطۂ نظر پر ہے اور ذہنی کیفیت پر ہے، ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ﴾ میں ذہنی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، ایک بزرگ بشر الحافیؒ کو بہت بڑے مدارج عالیہ ملے، کسی نے پوچھا کہ حضرت اتنا بڑا درجہ اللہ نے نصیب فرمایا، کیا بات ہے؟ کہنے لگے بات تو اتنی ہے کہ میں چلا جا رہا تھا، ایک جگہ میں نے ایک کاغذ پڑا دیکھا، اس پر اللہ کا نام لکھا تھا، میں نے اٹھایا، آنکھوں سے لگا یا، اس کو ایک جگہ عزت کے ساتھ کسی دیوار وغیرہ میں حفاظت سے رکھ دیا، اللہ کو یہ ادا پسند آئی اور اللہ نے مجھے یہ مرتبہ عطا کیا۔

اصل میں تعظیم اور محبت جو ہے، اس پر وقعت کا انحصار ہے، اس کی دلیل ہے، یہی علم کا حال ہے۔

بے حرمتی کا انجام

ایک عجیب واقعہ جو بڑا عبرتناک ہے، شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو، حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے شاگردوں میں ایک صاحب تھے، (اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے، ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے) وہ دہریہ ہو گئے تھے، کلکتہ میں رہتے تھے، گورکھپور کے رہنے والے تھے، شاہ اسماعیلؒ کے ساتھ پڑھے ہوئے تھے، بڑا عجیب وغریب واقعہ ہے، جب حضرت شاہ اسماعیل صاحبؒ حج کو جانے لگے تو ٹیپو سلطانؒ، وہ ٹیپو سلطانؒ جو آپ ہی کے علاقہ کے تھے، ان کے پوتوں کے وہ اتالیق تھے، جن کی وجہ سے ٹیپو سلطانؒ کے پوتوں پر کچھ اثر ہو رہا

---

(۱) سورۃ الحج:۳۲

تھا، تو ٹیپو سلطانؒ کی پوتی یا صاحبزادی نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے کہلایا کہ ہمارا خاندان تو آپ ہی کے خاندان کا متوسل ہے، ہمارے اجداد مادری میں شاہ ابواللیث صاحبؒ جو سید صاحبؒ کے حقیقی ماموں تھے، سفرِ حج سے واپسی پر ٹیپو سلطانؒ کی حیات میں کوڑیال بندرگاہ (منگلور) میں اترے، اور مختصر علالت کے بعد وہیں ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی، اور وہیں سپرد خاک ہوئے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان ٹیپوؒ کے اس مجاہد خاندان کے حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی اس شاخ اور سید صاحبؒ کے اجداد مادری سے عقیدت وارادت کے مستحکم تعلقات تھے، تو صاحبزادی نے کہلایا کہ ہمارے بھائی صاحبان پر بڑا اثر پڑ گیا ہے، فلاں مولوی صاحب اور وہ ملحد ہوگئے ہیں، آپ ذرا توجہ فرمائیں اور ان کی اصلاح فرمائیں، الحمدللہ ان کی اصلاح ہوئی، وہ سب بیعت ہوگئے، تو ان مولوی صاحب کے الحاد کی طرف جانے کی وجہ بھی ایک عجیب وغریب معلوم ہوئی، زیادہ کرید کی تو معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بخاری کا درس دے رہے تھے، بڑے زور کی ہوا چلی، بار بار ورق الٹتے تھے، آپ سب جانتے ہیں کہ بخاری کے اوراق جو بڑے ہوتے ہیں، تو اس کے ورق کی آواز سے سبق میں انتشار رہا، شاہ صاحبؒ نے کہا: بھائی! اس پر ہاتھ رکھ لو، یا کوئی چیز رکھ لو، تو کسی نے ہاتھ رکھا، کسی نے کوئی دینی کتاب رکھی، بس اس شخص نے نعوذ باللہ اس پر پاؤں رکھ دیا، یہ کرنا تھا کہ لائن بدل گئی۔

تو سارا معاملہ عزت واحترام کا ہے، سب وہیں سے ہوتا ہے، وہیں سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے، لیکن جو قلبی کیفیت ہے، وہ بڑی چیز ہے، چنانچہ یہی دیکھا کہ جن لوگوں میں استاد و کتاب کا احترام تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت نفع پہنچایا، عالم کون سا بڑا ہے اس کو اللہ جانتا ہے، بلکہ ہمیں بھی کچھ تھوڑا بہت معلوم ہوسکتا ہے، کم علموں کو بھی کہ بعض لوگ ان سے زیادہ ذی علم ہیں، بہت زیادہ ذہین ہیں، لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا، فائدہ ان سے ہوا جن کا علم اتنا نہیں تھا، وجہ کیا تھی؟ وہی اساتذہ کا ادب واحترام اور ان کی دعائیں!

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ ایک مرتبہ دورے پر تھے، تو

سب شاگردوں نے کہا کہ مصنف ہدایہ آئے ہیں، مصنف ہدایہ آئے ہیں، ایک شور مچ گیا، جو جہاں تھے سب کام چھوڑ کر ہر طرف سے طلبہ ملنے آئے، سلام کرنے آئے کہ ہمارے استاد آ گئے ہیں، صرف ایک طالب علم جو اچھے ممتاز تھے، وہ نہیں آئے، تو انھوں نے کہا کہ بھئی! فلاں آدمی نہیں آئے؟ خیر اس کے بعد کسی موقعہ پر وہ ملے تو انھوں نے کہا: ہم تو تمہارے دیار میں آئے تھے، تم ملنے نہیں آئے؟ تو اس نے کہا: حضرت! والدہ بیمار تھیں، چھوڑ کر نہیں آ سکے، تو انھوں نے کہا: انشاء اللہ، تمہاری عمر دراز ہوگی، یہ بڑا اچھا فعل ہے، برکت ہوگی تمہاری عمر میں، لیکن درس میں رونق نہیں آئے گی، تم نے ایک اچھا کام کیا، اس کا اثر عمر درازی میں ظاہر ہوا، چونکہ وجود کا تعلق ماں سے ہے، جب وجود ہے تو عمر بھی ہے، تو وہ جو جسمانی تعلق ماں سے ہے تو جسمانی فیض تم کو پہنچے گا، کہ تمہاری عمر دراز ہوگی، لیکن وجود معنوی جس سے تھا، وجود روحانی جس سے تھا، گویا اس پر تم نے ترجیح دی ہے، ترجیح کا معاملہ ہے تو درس میں رونق نہ ہوگی، یہ زبان سے نکل گیا، تو لکھا ہے لوگوں نے کہ ان کے درس میں سب کچھ تھا لیکن رونق نہیں تھی، یعنی لوگ آئیں اور استفادہ کریں، تلامذہ کی کثرت ہو، بس بھائیو! میں نے سلام کے موقع پر یہ باتیں کیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق عنایت فرمائے، آمین![1]

---

(۱) جامعہ اسلامیہ (بھٹکل) میں ۲ر جنوری ۱۹۸۳ء کو کی گئی تقریر، ماخوذ از ''ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام''، (ص:۱۱۱ تا ۱۱۸) و ''تحفۂ بھٹکل'' (ص:۶۶ تا ۷۵)۔

دور حاضر کے چیلنج کا مقابلہ

ہم اور آپ سب ایک ہی خاندان کے افراد، ایک ہی کشتی کے سوار اور رفیق سفر ہیں، ناسازگار ماحول اصل میدان ہے، ہم سب ایک ہی جیسے مصائب و آلام کا شکار ہیں، اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم برے زمانہ میں پیدا ہوئے، حالات حد درجہ خراب ہیں، مشکلات ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، لیکن میں اس کے برخلاف کہتا ہوں کہ ہم بڑے خوش قسمت ہیں، لائق صد مبارکباد ہیں کہ اس زمانہ میں پیدا ہوئے، کیونکہ ہم کو تھوڑی سی محنت و کوشش کے بعد بڑا ثواب اور بڑا مقام مل سکتا ہے، اگر ہم اس زمانہ میں پیدا ہوئے ہوتے کہ جب بڑی بڑی صلاحیتوں کے لوگ پیدا ہوئے تو ہم کس شمار میں آتے؟ اس وقت ان حضرات کی جوتیاں سیدھی کرنا ہمارے لیے ایک باعث فخر ہوتا، میدان عمل اور میدان کارزار میں ہمارا کچھ مقام نہ ہوتا، لیکن اس دور میں کم صلاحیتوں کے باوجود بہت کچھ کر سکتے ہیں، اور حقیقتاً کام کرنے کا لطف بھی ایسے ہی زمانہ میں ہے، کیونکہ جب باد مخالف کے تھپیڑے اور مخالف موجوں کا زور نہ ہو تو کیا لطف و مزہ ہے۔

ایک مثال

مثلاً ایک تیراک اگر ایسے دریا میں تیرے جس کی سطح ساکن ہو، بہاؤ نہ ہو، بلکہ ٹھیراؤ ہو تو اس کو اس میں کوئی لطف نہ آئے گا، نہ ہی کچھ لذت حاصل ہوگی، بلکہ جلد تھک جائے گا، لیکن اگر یہی تیراک ایسے پانی میں تیرے جہاں اسے موجوں سے لڑنے اور بہاؤ کے خلاف تیرنے کا موقع ملے تو لطف بھی اٹھائے گا، اور فرحت بھی محسوس کرے گا۔

پرسکون زندگی

بالکل اسی طرح اگر زندگی پرسکون ہو، کشمکش وخطرات سے پاک ہوتو کیا مزہ؟ اصل مزہ خطرات سے لڑنے، کشمکش سے دوچار ہونے اور مصائب سے مقابلہ کرنے میں ہے، کسی شاعر کا قول ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اسی پر وحشت شاعر کا شعر یاد آیا کہ ؎

کچھ سمجھ کر ہی ہوا تھا موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا تھا عافیت ساحل میں ہے

آج دنیا میں کچھ ایسے شہر بھی ہیں جہاں کے لوگوں کو ہر طرح کا سکون واطمینان حاصل ہے، کام بھی ان کو صرف پانچ گھنٹے دن بھر میں کرنا پڑتا ہے، لیکن ان میں خودکشی کی وارداتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں، خدا کا شکر واحسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ ملک عطا کیا اور پھر یہ زمانہ دیا۔

عبقری لوگوں کی کمی

آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ مقامات جہاں موسموں کا اعتدال پایا جاتا ہے، وہاں جینئس قسم کے لوگ کم ہی پیدا ہوئے ہیں، عام طور پر قوت ارادی اور قوت عمل کم ہوتی ہے، دوسری طرف عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو آسمان دنیا پر تابندہ ستارہ بن کر چمکے، اور جنھوں نے غیر فانی نقش چھوڑے ہیں، وہ عام طور سے غریب لوگ تھے، اور غریب گھرانوں کے پروردہ تھے، یورپ سے لے کر ایشیا تک یہی ہے، اب اس بات کو محسوس کیا جارہا ہے اور اس پر بڑی تحقیق ہورہی ہے کہ اب ایسے جینئس انسان کیوں پیدا نہیں ہورہے ہیں؟ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ زندگی اتنی آسان ہوگئی ہے کہ قوت ارادہ اور قوت عمل کمزور ہوتی جارہی ہے۔

تعلیم ہی کو لے لیجیے، پہلے تعلیم کس طرح حاصل کی جاتی تھی؟ کتابوں کا ملنا دشوار تھا، چراغ مشکل سے دستیاب ہوتے تھے، اساتذہ کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھاننی پڑتی تھی، ایک کتاب کو دس دس حصوں میں تقسیم کر کے پڑھایا جاتا تھا، علماء نان بائیوں کی دکان پر جا کر صرف خوشبو سونگھ کر اپنی بھوک پر قابو پایا کرتے تھے، اور پھر جینئس علماء وجود میں آتے تھے، اب تعلیم سہل تر ہوگئی ہے اور علماء مفقود، اور ہیں بھی تو نہ ہونے کے برابر۔

عزم کی قوت

جس طرح پتھروں کو ٹکرا کر اگر شعلہ پیدا کیا جا سکتا ہے، اسی طرح انسانی عزم بھی مخالف قوتوں سے ٹکرا کر ہی اُبھرتا ہے، یہ زمانہ، یہ ملک، یہ ماحول ماتم کے لیے نہیں، بلکہ مسرت اور شادمانی کا موقع ہے کہ ہم تھوڑا کریں اور بہت پائیں، ہمارے بہت سے ساتھی یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان یا کسی عرب ملک چلے جائیں، یہ بڑی نادانی ہے، ہمیں اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنا چاہیے، کیونکہ زندگی استحقاق کا نام ہے، عجز و عاجزی کا نام نہیں۔

ہندوستان میں تین باتوں کی اشد ضرورت

اس وقت ہندوستان میں تین باتوں کی اشد ضرورت ہے، اور یہی ایسی ضرورت ہے جس کو انجام دے کر ہم خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل کر کے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں:

(۱) مسلمانوں میں دینی احساس و شعور پیدا کرنا اور خدا سے ان کے تعلق کو جوڑنا، یہی اصل بنیاد ہے، اور یہ اس فیصلہ کے ساتھ کیا جائے کہ ہم کو اسلام پر مرنا اور جینا ہے، ہم کوئی بھی کام کریں، تعلیمی ہو یا اقتصادی، مسلمان ہونے کے احساس اور مسلمان رہنے کے فیصلہ کے ساتھ کریں۔

دولت آفرینی کے جنون سے کوئی جگہ خالی نہیں، ہر جگہ دولت پرستی، دولت آفرینی اور مادیت کا جنون شباب پر ہے، ان حالات میں ضروری ہے کہ ہم مسلمان ہوں، ہم میں خدا

سے تعلق پیدا کرنے کی تڑپ ہو، وہ تڑپ جو ہم سے پہلے مسلمانوں کو دیوانہ وار پھرایا کرتی تھی، اب ہم میں وہ تڑپ نہیں، مثلاً کھانے کی لذت کھانے میں نہیں بلکہ آپ میں قوت ذائقہ ہو، وہ اشتہا جو چاہیے، اگر اشتہا نہ ہو کسی کھانے میں کچھ فرق نہیں، ہمارے اندر جو چیز کم ہے، وہ اشتہا ہے، اگر اشتہا پھر جاگ اٹھے تو ہم ویسے ہی دیوانہ وار گھومیں۔

(۲) دوسرا مسئلہ مسلمانوں کی تعلیم کا ہے، یہ بڑا اہم ہے، اگر مسلمانوں نے اپنی دینی تعلیم کو اپنے اندر برقرار نہ رکھا، تو موجودہ نظام تعلیم مسلمانوں کو علم وہدایت سے محروم کردے گا، اور ہمارے ہاتھوں ہماری مسلم نسل مفقود ہو جائے گی، موجودہ نظام تعلیم خالص برہمنی اور مادیانہ ہے، اس کو پڑھ کر ان بچوں کا کیا ذہن بنے گا جو مستقبل کے رہبر بننے والے ہیں؟ رائے عامہ بہت بڑی طاقت ہے، ہمیں اس کے خلاف احتجاج کرنا ہے، ہندوستان میں اسلام کو باقی رکھنے کے لیے ابتدائی مکاتب اور پرائمری مکاتب کا جال بچھانا ہوگا، دینی تعلیمی کانفرنس اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

(۳) تیسرا مسئلہ ہماری فکری وذہنی تربیت کا ہے، صالح انسانوں سے رابطہ پیدا کر کے بزرگان دین کی مصاحبت سے فکری وذہنی تربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اس تربیت کے اثرات فوری نہیں ہوتے، مثلاً جب زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے تو ابتدائی مراحل میں اس کے کچھ اثرات نہیں ملتے، لیکن بعد میں وہی ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم تاج المساجد (بھوپال) میں طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/اپریل ۱۹۸۵ء)۔

اختصاص کی ضرورت

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴾(۱)

میرے بھائیو اور عزیزو! جلسہ کل بھی تھا، اس سے کئی گنا بڑا بھی تھا، لیکن مجھے آپ سے، مدرسہ کے طالب علموں سے بات کرنے میں جتنا انشراح، جتنی سہولت اور خوشی محسوس ہوتی ہے وہ بڑے جلسوں میں خطاب کرنے سے نہیں ہوتی، اس لیے کہ میں مدرسے ہی کا طالب علم ہوں، اور الحمد للہ آبائی طور پر بھی عالموں کے خاندان کا اور مدارس کے قائم کرنے والوں اور مدارس کی خدمت کرنے والوں کے خاندان کا ہوں، اور پھر اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، اور یہی میری دنیا ہے، کل اور آج کے جلسہ میں مجھے اتنا فرق محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی قوم سے خطاب کرے، شہر والوں سے خطاب کرے، جس میں ہر طبقہ کے لوگ ہوں، اور پھر اپنے گھر والوں سے خطاب کرے، گھر کے بچوں سے خطاب کرے، اپنے خاندان کے احباب اور افراد سے خطاب کرے، اس وقت میرا خطاب خاندان کے افراد اور گھر کے بچوں سے ہے، آپ بھی یہ سمجھیں کہ کوئی اجنبی آدمی نہیں ہے، بلکہ آپ ہی کا ایک آدمی ہے، زیادہ سے زیادہ بہت اعزاز دینا چاہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کے استادوں کی صف کا ایک آدمی ہے۔

---

(۱) سورة التوبة:۱۲۲

دین میں سمجھ حاصل کریں

میں نے آپ کے سامنے سورہ توبہ کی آخری آیتوں میں سے ایک آیت پڑھی ہے، ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن پھر بھی ترجمہ کر دیتا ہوں، شاید ابتدائی درجوں کے بھی طلبہ ہوں: "یہ تو ممکن نہیں اور آسان نہیں کہ مسلمان سب کے سب کھڑے ہوں، سب کام چھوڑ چھاڑ کر پڑھنے میں لگ جائیں، علم حاصل کرنے لگیں، تو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر جماعت میں سے، ہر فریق میں سے اور ہر حلقہ میں سے کچھ لوگ اس کے لیے کمر باندھ لیتے، اس کے لیے کھڑے ہو جاتے، کمر بستہ ہو جاتے، ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾، اللہ تعالیٰ انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے، ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ [1]، انسانوں کی کمزوریوں سے واقف ہے، اسی کی رکھی ہوئی کمزوریاں ہیں انسانی فطرت میں، انسانوں کی ضرورتوں سے واقف ہے، حالات سے واقف ہے، اس لیے وہ ایسی چیز کا مکلّف نہیں کرتا جو انسان کے بس سے باہر ہو، یہ نہیں کہ دکاندار دکانیں چھوڑ کر اور کاشتکار زمین چھوڑ کر، لہلہاتے ہوئے کھیت چھوڑ کر، اور سپاہی حفاظت چھوڑ کر، اور ضعیفوں کی ضعیفی کا خیال کیے بغیر سب کے سب کھڑے ہو جائیں، مدرسوں میں جا کر نام لکھا لیں، یا ہجرت کر جائیں وہاں جہاں علم حاصل ہوتا ہے، اور وہاں علم کی تحصیل میں لگ جائیں، اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلّف نہیں کیا، خود ہی قبل اس کے کہ کوئی عذر کرتا اور کہتا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فرما دیا کہ ہونے والی بات نہیں ہے کہ سب مسلمان کھڑے ہو جائیں ہاتھ جھاڑ کر، دامن جھاڑ کر سب کاموں کو چھوڑ کر طالب علم بن جائیں، ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾، تو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر فریق میں سے یعنی جو انسانی گروہ ہیں، پیشے ہیں، برادریاں ہیں، محلے ہیں، شہر ہیں، ان میں سے ایک ایک جماعت اس کے لیے بالکل وقف ہو گئی کہ

(۱) سورة الملك: ١٤

﴿لِیَتَفَقَّھُوا فِي الدِّیْنِ﴾، دین میں سمجھ حاصل کریں، تفقہ بہت جامع لفظ ہے، اس میں احکام، مسائل، ان کی حکمتیں، مواقع استعمال، ان کے تطبیق کے مواقع، خطاب کے طریقے، یہ سب اس کے اندر آ جاتے ہیں، تفقہ کا لفظ ایسا اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا کہ اس سے جامع لفظ ہو ہی نہیں سکتا ہے، کہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ﴿لِیُنْذِرُوا قَوْمَھُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَیْھِمْ﴾ بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی کہ خود دین حاصل کرلیں، دین کی سمجھ حاصل کرلیں، فقیہ بن جائیں، عالم بن جائیں، محدث بن جائیں، بلکہ اس کے بعد فرمایا: ﴿وَلِیُنْذِرُوا قَوْمَھُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَیْھِمْ﴾، 'اپنی قوم کو جا کر سمجھائیں'، قوم کے معنی یہ نہیں ہیں ہے کہ مسلمان ایک قوم ہے، ہندو ایک قوم ہے، اس کے لیے تو عربی میں ''شعوب'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، قوم کے معنی ہیں انسانوں کا مجموعہ، انسانی جماعتیں، تو اپنی قوم کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستانی ہندوستانیوں کو جا کر سمجھائیں، عرب عربوں کو جا کر سمجھائیں، بنگالی بنگالیوں کو جا کر سمجھائیں، نہیں بلکہ جہاں سے آئے ہیں، اپنے اپنے خاندانوں کو، محلے والوں کو، گاؤں والوں کو، قصبے والوں کو، برادری والوں کو جا کر سمجھائیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا مکلّف کیا ہے، جس کی ترغیب دی، اس آیت میں اس کے مقصد بیان کیے ہیں، ایک خود علم حاصل کریں، سمجھ حاصل کریں، علم یہ نوشت و خواند کا علم نہیں، اس کو علم اور تفقہ نہیں کہا جاتا، مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِهٖ خَیْرًا یُفَقِّھْهُ فِي الدِّیْنِ [1]، تفقہ فی الدین میں دین کے مسائل و احکام اور ان کی علتیں، ان کے مواقع استعمال، ان کی تعمیم و تخصیص کے مواقع سب اس کے اندر آ جاتے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ ہم دعوت دیتے ہیں اس لیے نہیں کہ صرف اپنی اصلاح کرلیں، اپنے لیے سامان نجات و ہدایت مہیا کرلیں، ﴿لِیُنْذِرُوا قَوْمَھُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَیْھِمْ﴾، 'اپنے لوگوں کو جا کر ڈرائیں'، ﴿لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ﴾، 'تاکہ وہ احتیاط کریں'۔

آپ کو معلوم ہے کہ لَعَلَّ کا لفظ قرآن مجید میں شک کے لیے نہیں آتا ہے (کہ شاید

(۱) رواہ البخاري (۷۱)، ومسلم (۲۳۸۹،۲۳۲۹)

ایسا ہو، اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز یقینی ہے) علت اور تعلیل کے طور پر آتا ہے، تاکہ وہ ڈرائیں، تاکہ وہ ڈر وخوف کی زندگی گزارنے لگیں، حرام وحلال کا فرق سمجھنے لگیں، کیا چیزیں مہلک ہیں، اور کیا چیزیں نجات دینے والی ہیں، ان کو جاننے لگیں، اور اس کے مطابق وہ عمل کریں، لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ، اس میں سب آتے ہیں۔

دین کی حفاظت کا راز

میرے عزیزو! پہلے ہمارے علماء جب پڑھتے تھے، مدارس میں تعلیم حاصل کر لیتے تھے، تو ان کا کام یہ تھا کہ جگہ جگہ مدرسے قائم کرتے تھے اور جگہ جگہ بیٹھ جاتے تھے اللہ کے بھروسہ پر، کہ اللہ تعالیٰ رزاق ہے اور سب کا رازق ہے، تو جو اس کے دین کی خدمت کرے گا ان کا رازق کیسے نہیں ہوگا؟ اگر آپ کسی کام پر جائیں تو کیا وہ آپ کو بھول جائے گا؟ وہ تو اگر آپ کو بھیجے گا کسی کام پر، تو آپ اس کا انتظام کرے گا، اس کے لیے سامان تیار رکھے گا، آپ کے آنے پر وہ سب پیش کرے گا، مہیا کرے گا، یہ جو ہمارے ہندوستان میں دین پھیلا، بلکہ تمام ملکوں میں دین پھیلا ہے، اور دین کی جو حفاظت ہوئی ہے، اور بغیر حکومت کی سرپرستی کے اور بعض اوقات حکومت کی مخالفت کے ساتھ، حکومتیں مخالف تھیں، حکومتیں مٹانا چاہتی تھیں دین کو، اور ختم کرنا چاہتی تھیں، بعض مسلم حکومتوں میں کچھ دور ایسے آئے ہیں، تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، کتابوں میں پڑھیے گا، اور جن کو ذوق دیا ہے علم کا اللہ تعالیٰ نے، وہ خاص کر "تاریخ دعوت وعزیمت" کا چوتھا حصہ جو مجدد الف ثانیؒ کے متعلق ہے، اور پانچواں حصہ جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کے متعلق ہے، اس کو دیکھیں، تو کچھ دور ایسے بھی آئے ہندوستان میں کہ حکومتیں درپے ہوگئی ہیں، گذشتہ مسلمانوں میں عوام میں دین کا جو رشتہ تھا، اس رشتہ کو کاٹنے کی فکر میں حکومتیں لگ گئی ہیں، تو جو کچھ بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت تک دین قائم ہے، یہ ان ربانی علماء کی بدولت ہے اور اللہ والے علماء کی، پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنا کام یہ سمجھا اور مامور من اللہ سمجھا اپنے کو کہ دین کا چراغ بجھنے نہ دیں، اور لوگوں کا تعلق اور رشتہ جو اسلام سے ہے، اس کو کمزور نہ ہونے دیں، انھوں نے یہ کام کئی طرح سے

کیا، ایک تو یہ کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے مدرسے قائم کیے، مکتب قائم کیے، اور ان مدرسوں اور مکتبوں میں اس کی فکر نہیں کی جیسا کہ اس زمانہ میں - بہت سے اسباب کی بنا پر جس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے - یہ شوق ہو گیا ہے کہ بڑی بڑی عمارتیں ہوں، بہت بڑا بجٹ ہو، اور بہت شان وشوکت کے مدرسے ہوں، اور وہاں کے پڑھنے والوں کی عزت ہو، ان کی عزت کو تسلیم کیا جائے، اور وہاں کے طلبہ دوسرے ملکوں میں جا کر پڑھیں اور وہاں بڑی بڑی ملازمتیں پائیں، بڑے بڑے مواقع ان کو ملیں کمانے کے لیے، اپنے اپنے گھروں کی خدمت کے لیے اور مکانات بنانے کے لیے، وہ وہاں بیٹھ کر کمائیں، ان کے مکانات یہاں بنتے رہیں، ہندوستان میں، گاؤں میں، قصبے میں یہ ایک دوڑ شروع ہو گئی ہے کہ پڑھتے ہیں یہاں کے مدرسوں میں (جن میں چندہ غریب دیتے ہیں، اور جس طریقہ سے ہو مدد کرتے ہیں) اور یہاں کی روٹیاں کھاتے ہیں، اور اس کے بعد اپنا سارا حاصل کیا ہوا علم اور اپنی ذہانت اور جو توانائی ہے وہ سب صرف کرتے ہیں دور دراز ملکوں میں، نتیجہ اس کا کیا ہوتا ہے کہ وہاں تو خیر کتنے آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور دیکھنے والے تھوڑا بہت جانتے ہیں، جو اتفاق سے کبھی وہاں چلے جاتے ہیں، کہ کوئی صرف یہ مقصد لیے بیٹھا ہے کہ اس کا کام ہے اور خانہ پری ہو رہی ہے، لیکن ان کے مکانات تو بن رہے ہیں، ہندوستان میں بڑے بڑے محل کھڑے ہو رہے ہیں، پہلے رہنے کے لیے جھونپڑا تھا، یا کچا مکان تھا، ان کی کوٹھیاں تیار ہو رہی ہیں، یہ ہمارے علماء کا کام نہیں تھا۔

اگر وہ علماء یہی راستہ اختیار کرتے تو ویسے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے باقی رکھنے کا ذمہ لیا ہے، ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (۱)، یہ قیامت تک رہنے والا دین ہے، لیکن ظاہری اسباب میں ہندوستان سے اسلام نکل چکا ہوتا، یا کم سے کم عوام کی طبیعتوں سے، اور ان کی عملی زندگی سے اسلام خارج ہو چکا ہوتا، لیکن یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت تک سلسلہ باقی ہے، قرآن عظیم کا سلسلہ باقی ہے، اور وعظ وتبلیغ کا سلسلہ باقی ہے، اور تعلیم کا سلسلہ باقی ہے، یہ نتیجہ ہے علماء کی قربانیوں کا کہ انھوں نے مدارس میں پڑھا

(۱) سورۃ الحجر: ۹

اور کہیں جا کر بیٹھ گئے خدا کا نام لے کر، اور پڑھنا پڑھانا شروع کیا، لوگ جمع ہو گئے، انھوں نے مسجد میں دعوت کا کام شروع کر دیا، اور دین کے احکام بیان کرنے لگے اور عقائد صحیح کرنے کی کوشش میں لگ گئے، دیہاتوں میں دورہ کرتے تھے، ایسے ایسے دورے کرتے تھے کہ اگر ہم لوگ ان دوروں کی روئیداد سنیں تو ہمارے ہوش جاتے رہیں کہ اللہ اکبر! یہ ایسے ہمت والے لوگ تھے، پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے اور تھوڑے سے چنے باندھ لیے، اور گھر گھر پھر رہے ہیں، گاؤں گاؤں پھر رہے ہیں، اور ملک کے ملک علاقے کے علاقے مسلمان ہوئے اور ان کے عقائد درست ہوئے، مولانا کرامت علی صاحب جونپوریؒ ایک تن تنہا آدمی تھے، حضرت سید صاحبؒ کے خلفاء میں سے تھے، ان کو جہاد کا بہت بڑا شوق تھا، اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے انھوں نے اس کے فنون سیکھے تھے، تلوار چلانا اور بندوق چلانا اور نشانہ ٹھیک کرنا سیکھا، اور بڑا ارمان تھا ان کے دل میں کہ اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور شہید ہوں، سید صاحبؒ نے عین میدان جنگ سے [(۱)] ان کو بھیجا، ان سے کہا کہ نہیں تم جاؤ، جاہل مسلمانوں کو دین کی تعلیم دو، ان کو مسلمان بناؤ، چنانچہ وہ آئے، ایک بہت بڑے ذمہ دار آدمی جو دنیا دیکھے ہوئے تھے، وہ سمجھ کر بات کرنے کے عادی تھے، نواب بہادر یار جنگ ان کا نام تھا، حیدر آباد کے صف اول کے لوگوں میں سے بڑے اعلیٰ درجہ کے آتش بیاں مقرر، بڑے سیاسی دماغ کے آدمی اور بڑے با اثر، اور میں نے خود براہ راست ان سے سنا، انھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں کہا کہ میری معلومات یہ ہیں کہ مولانا کرامت علی صاحب کے ذریعہ جن لوگوں کو ہدایت ملی ان کی تعداد دو کروڑ ہے، دو کروڑ آدمیوں کو ہدایت ملی، ہم ابھی بنگلہ دیش دیکھ کر آرہے ہیں، گذشتہ سے پیوستہ مارچ میں ہم گئے تھے، کہ کس طرح وہاں دوسرے اسلامی خطوں کے مقابلہ میں شرک کم، بدعت کم، سادگی اور اسلامیت زیادہ ہے، یہ میں نے ایک اللہ کے بندے کے کام کا کچھ نمونہ بیان کیا، ایسی مثالیں ایک نہیں بے شمار ہیں، کچھ کو تاریخ نے محفوظ کر لیا، اور جن کا ذکر نہیں، وہ نہ جانے کتنے ہوں گے، ان اللہ کے بندوں کو اس کی فکر نہیں تھی کہ بڑی شاندار عمارتیں ہوں، بہت زیادہ

(۱) اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں، دوسری روایت یہ ہے کہ رائے بریلی سے بھیجا۔

طلبہ کی تعداد ہو، کہیں بھی بیٹھ جائیں، کتاب پڑھانا شروع کر دیتے تھے، جس کے نتیجہ میں دین محفوظ رہتا تھا، اب اس کی ضرورت ہے کہ آپ جو پڑھ رہے ہیں، ابھی سے یہ نیت کر لیں کہ یہاں سے جا کر مدرسے قائم کریں گے۔

معنوی نسل کشی

آپ لوگوں کو مخاطب و معین کر کے کہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان اور ہندوستانی مسلمان ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکے ہیں جو صدیوں میں آیا کرتا ہے، تاریخ میں صدیوں میں کبھی ایسا موڑ آتا ہے اور وہ بڑا نازک وقت ہوتا ہے، موت و حیات کا موڑ ہوتا ہے، اس وقت ہندوستان میں جو نظام تعلیم چل رہا ہے، اس کا جو نقشہ ہے، بہت سے ذہین لوگوں نے، بڑے سیاست داں لوگوں نے، تجربہ کار لوگوں نے، بڑے سمجھ دار لوگوں نے یہ نقشہ بنایا ہے، تعلیم کا یہ نظام مسلمانوں کے لیے نسل کشی کے مرادف یا قائم مقام ہے، جسمانی نسل کشی نہیں بلکہ معنوی نسل کشی، یعنی ان کا رابطہ اپنی مذہبی تعلیمات سے، اس مذہب کی زبان سے اور رسم الخط سے کاٹ دیا جائے، تعلیم کے ذریعہ سے، اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ سے وہ رابطہ ختم کر دیا جائے تو خود بخود کام ہو جائے گا، نہ نمک لگے گا نہ پھٹکری، پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں، خود بخود اس کا انتظام ہو جائے گا، چنانچہ آپ دیکھیے، ترکی میں مصطفیٰ کمال نے یہ کام کیا کہ سلطنت ترکیہ خلافت کا مرکز تھی، خلافت عثمانیہ خلافت اسلامیہ کا مرکز تھی، اس کا انھوں نے رسم الخط بدل دیا ہے، بجائے عربی رسم الخط میں ترکی زبان لکھنے کے رومن رسم الخط اے بی سی ڈی جس سے انگریزی لکھتے ہیں، سرکاری طور پر قانونی طور پر اس کو لازم قرار دیا، اور عربی رسم الخط میں جس میں ترکی زبان اس سے پہلے لکھی جاتی تھی، اس کے استعمال پر پابندی لگا دی، نتیجہ یہ ہوا کہ پوری تہذیب سے، پوری تاریخ، پوری اسلامی تہذیب، اسلامی ادب سے، کتب خانوں سے اور سب سے رابطہ ختم کر دیا، جب میں ۵۶ء میں پہلی مرتبہ ترکی گیا، تو میں نے دیکھا کہ صحاح کی کتابیں بخاری و مسلم۔ قرآن مجید کے بعد جن کا درجہ ہے۔ وہ کوڑیوں کے مول بک رہی تھیں، اور بازار میں اس طرح پڑی تھیں کہ کوئی خرید کر کیا کرے

گا، سمجھ ہی نہیں سکتا، اس طرح کمال اتاترک نے قلم کی ایک گردش سے سات سو برس کا جو سرمایہ تھا، اس پر پانی پھیر دیا، ایک فلسفی مؤرخ نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں کتب خانہ کو آگ لگانا ایک بالکل وحشیانہ عمل ہے، یہ حماقت ہے، صرف رسم الخط کا بدلنا ہی کافی تھا، ہمارے یہاں ہندوستان میں رسم الخط بدلا جارہا ہے، خدا کا شکر ہے کہ آپ دوسرے ماحول میں ہیں، اسکولوں کالجوں میں یہ حال ہوگیا ہے کہ اس وقت ستر اسی فیصد مسلمان بچے اردو سے ناواقف ہیں، ماں باپ کو ہندی میں خط لکھتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز تھا، اس کا یہ حال ہے کہ ہمارے ڈاکٹر اشتیاق صاحب جو وہیں کے پڑھے ہوئے ہیں، انھوں نے کہا کہ ستر فیصد طلبہ بی.اے.، ایم.اے. پڑھنے والے اپنے ماں باپ کو ہندی میں خط لکھتے ہیں، اردو نہ پڑھ سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں، دینیات کی کتابیں کون پڑھے گا، یہ بہت بڑا موڑ آگیا ہے ہندوستان کی تاریخ میں کہ مذہبی تعلیم جو بنیادی تعلیم ہے، یعنی توحید و رسالت اور معاد، اس سے بے بہرہ ہوتے چلے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ پر بہت بڑا فضل فرمایا ہے، اللہ نے آپ کے والدین کو بہت بڑی توفیق دی کہ آپ یہاں آئے ہیں، اسکولوں اور کالجوں کا تو یہ حال ہوگیا ہے کہ بنیادی معلومات سے بھی بالکل ناواقف ہیں، توحید کیا ہوتی ہے؟ ارے بھئی! توحید جانتے ہو؟ توحید کی حقیقت سے واقف ہو؟ توحید سے اور نبوت سے، نبوت کا مفہوم کیا ہے؟ نبی کا کیا مقام ہوتا ہے؟ نبی کا اللہ کے ساتھ کیا تعلق ہوتا ہے؟ انسانوں کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہوتا ہے؟ کیا کام اس کے سپرد کیا جاتا ہے؟ کس لیے پیغمبر آتے ہیں؟ قیامت کی زندگی کے بعد دوسری زندگی کیا ہے، معاد کا لفظ سمجھ ہی نہیں سکتے، آخرت کا لفظ سمجھ ہی نہیں سکتے، اور بہت ہی خطرناک بات یہ ہے کہ اردو میں خوشخط سے ناواقف ہیں، بات کیا کہ گھر کے سرپرستوں میں دنیا پرستی آگئی ہے خدا پرستی کے بجائے، کہ ہمارے بچے بڑے بڑے امتحانات دیں اور پاس ہوں بڑے امتیاز کے ساتھ اور نوکریاں ملیں، اور بس کام ہوگیا، حالانکہ اس کے نتیجہ میں اولاد خود ان کی خبر نہیں لیتی جن کی تعلیم میں سرپرستوں نے سارے وسائل اور ساری زندگی ختم کردی، اس میں کہیں نہیں ہے کہ ماں باپ کا یہ حق ہے،

اور استاذوں کا یہ حق ہے، اور خدا اور رسول کا یہ حق ہے، ایسی تعلیم پا کر جو اولاد بڑی ہوتی ہے وہ لوگ اپنے والدین سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں، ان سے پوچھتے بھی نہیں تم کس حال میں ہو؟ ﴿خَسِرَ الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةَ﴾ (۱) "نہ دنیا ملی نہ آخرت ملی۔"

اللہ اپنے دین کی خدمت کرنے والوں کو نہیں بھولتا

عزیزو! ہم لوگوں کی یہاں حاضری کا مقصد حاصل ہو جائے گا، اگر صرف اتنی بات ہوگئی کہ تم لوگ ارادہ کرلو کہ یہاں سے جانے کے بعد جو آپ کے یہاں مدارس ہیں، ان میں لگ جاؤ گے، اپنے گاؤں اور اپنے علاقہ میں اسلام کی تعلیم پھیلاؤ گے، میں تم سے کہتا ہوں کہ بڑے بڑے مدارس میں ایک ذوق پیدا ہو گیا ہے کہ باہر جا کر پڑھیں، وہاں کے جامعات میں پڑھیں، اور مہارت حاصل کریں، اور وہاں ہمیں کہیں بھیج دیا جائے اور تنخواہ باہر کی ہمیں ملا کرے، یہ مدارس اور مکاتب پر، والدین کی تمناؤں پر، ملت کی ضرورتوں پر پانی پھیر دینے کے مرادف ہے، مجھے عرب دنیا کی خبر ہے، میں ان سے واقف ہوں، اور میں وہاں کے اداروں کا ممبر بھی ہوں، لیکن اس کے باوجود میں بہت سخت ہوں، باہر جانے کے شوق کو، بیماری کی حد تک بڑھے ہوئے شوق کو مدارس کے لیے، ملت کے لیے اور مسلمانوں کے لیے مضر سمجھ رہا ہوں، کام وہی تھا جو ہمارے بزرگوں نے کیا، کسی بھی گاؤں میں مدرسہ قائم کرنا، کسی بھی قریہ میں مکتب قائم کرنا، دعوت دینا، جو اردو سیکھنا چاہے ہمارے پاس آئے، جو دینیات کی تعلیم سیکھنا چاہے ہمارے پاس آئے، اللہ کے بھروسہ پر بالکل متوکلانہ، اور آپ دیکھیں گے، میں مسجد میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ جب دنیا کے لوگ بھی ان کا جو کام کرے، اس کو کچھ دیتے ہیں، اور اس کی خدمت کرتے ہیں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ جو اکرم الاکرمین ہے، جو رب العالمین ہے، ذوالقوۃ المتین ہے، اپنے دین کی خدمت کرنے والوں کو بھول جائے گا؟

میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، کہیں سے، ہندوستان کے کسی گوشہ سے ہمیں ایک آدمی ایسا لا کر دکھا دیجیے جو خلوص کے ساتھ دین کا کام کرتا ہو، خدمت کرتا ہو، اور فاقہ

(۱) سورۃ الحج: ۱۱

کر رہا ہو، اس کے پاس کھانے کا ٹھکانا نہ ہو، ہم آپ کو کرایہ دیں گے اور اس کو بھی دیں گے، یہ ہم نے کئی مرتبہ اپنے طلبہ میں بھی کہا کہ دیکھو تم خلوص کے ساتھ دین کی خدمت کرو، محنت سے پڑھو، اور خلوص کے ساتھ پڑھاؤ، تمھیں کھانے کو نہ ملے تو یہ میرا گریبان اور تمھارا ہاتھ ہے، اور کہو کہ مولانا! آپ نے کہا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے، محنت کرنے والے، پڑھنے پڑھانے والے بے کار نہیں رہتے، دیکھئے ہم کس حال میں ہیں، کبھی ایسا ہوا تو یہ کسی خاص وجہ سے ہوگا، مثلاً صحیح معنی میں دین داری نہیں ہے یا کوئی سنک ہے کہ سب کچھ ہے، بڑے پڑھے لکھے ہیں، لیکن غصہ اتنا ہے کہ سیدھے منہ بات نہیں کر سکتے، ذرا سی بات میں غصہ ہو گئے، یا یہ کہ محنت نہیں ہوتی سو رہے ہیں، مولوی صاحب بڑے عالم اپنے فن کے ماہر ہیں، لیکن پڑھانے میں جی نہیں لگتا، اور پڑھایا نہیں جاتا، جہاں کہیں ایسی صورت حال ہے، بے روزگاری، فاقہ کشی ہے، تو وہاں کوئی نہ کوئی خرابی آدمی کے اندر ہوتی ہے، مثلاً بعض لوگوں میں ضد ہوتی ہے، بعض لوگوں میں انانیت ہوتی ہے، غرور ہوتا ہے، تکبر ہوتا ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، اور بعض لوگوں میں یہ کمزوریاں ہوتی ہیں، یہ ان کا اپنا قصور ہے، نہ دین کا قصور ہے، نہ علم دین کا قصور ہے، اور نہ توکل کا اور ہمت کا قصور ہے۔

اصل میدان عمل

بھائیو! دیکھو میں آپ سے خلوص کے ساتھ کہتا ہوں، ہندوستان میں بہت سے مدارس ہیں، سب قابل قدر ہیں، میں ان سب کا معترف ہوں، اور دعا گو ہوں، لیکن اگر میں یہ کہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعد مجھے اس سے زیادہ تعلق ہے، تو تعجب نہ ہونا چاہیے، میں تمھیں اپنا طالب علم سمجھ کر عزیز سمجھ کر کہتا ہوں کہ تم اس کا ارادہ کرو، فیصلہ کرو کہ تم ہندوستان میں دین کا سرمایہ بچانے کی کوشش کرو گے، مسلمانوں کا جو رشتہ ابھی دین سے قائم رہا ہے، دین کے ساتھ علم کے ساتھ، جب تم اسے چھوٹنے نہ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو چھوٹنے نہ دیں گے اور ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ (۱) اللہ تعالیٰ تمہارے قدموں کو جما دے گا، اللہ کی

(۱) سورة محمد:۷

صفات اس کی ذات کی طرح ازلی اور قدیم ہیں، اگر وہ کہتا ہے کہ ہم رازق ہیں، تو یہ کسی خاص وقت کے ساتھ خاص نہیں، حضور (ﷺ) کے زمانہ میں وہ رازق تھا، اور اب بھی ہے، اس پر امت کا عقیدہ ہے اور یہ ہمارے عقیدے میں داخل ہے۔

آپ لوگ ارادہ کریں کہ جن جن دیہاتوں سے آئے، جن جن علاقوں سے آئے، جن جن صوبوں سے آئے ہیں، جن جن گاؤں سے آئے ہیں، اگر باہر موقع ہو تو باہر، ورنہ قرب و جوار میں موقع ہو تو قرب و جوار میں کہیں پڑھنے پڑھانے کا انتظام کریں گے، مسلمانوں کو بتائیں گے کہ دین کے عقائد کیا ہیں؟ توحید و شرک میں فرق کیا ہے؟ اردو سکھانا اور گھر گھر جا کر کے گھر کے سرپرستوں کو تلقین کرنا کہ اپنے بچوں کے واسطے دینی تعلیم کا انتظام کیجیے، اور خدانخواستہ اگر کہیں بیس پچیس برس اور گزر گئے، تو ایک نسل تیار ہوگی کہ جس سے بات کرنے کے لیے آپ کو ترجمان کی ضرورت ہوگی، آپ اس ایک نسل کی خلا کو پُر کرنے کے لیے کمر کس لیں اور میدان میں ڈٹ جائیں، اللہ آپ کی مدد کرے گا، یہ یقین رکھیں، اللہ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے، یہ اللہ کا قانون ہے، اس کا مقرر کیا ہوا نظام ہے، یہ قانون اور یہ نظام پہلے بھی تھا، اور آج بھی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾۔ (۱)

حضرت مجدد الف ثانیؒ

حضرت مجدد الف ثانی ایک فقیر بے نوا، ان کے پاس کیا تھا، لیکن اپنے اخلاص کی قوت کے ساتھ سلطنت مغلیہ کے سامنے کھڑے ہو گئے، اللہ نے ان کی مدد کی، حضرت مجدد الف ثانی نے اتنا بڑا مشکل کام کر دکھایا، اس وقت اکبر دنیا کا دوسرے نمبر پر سب سے بڑا بادشاہ تھا، بڑا طاقتور ارادہ و ہمت کا پہاڑ، اس کو ایسے ذہین ترین آدمی مل گئے، (تفصیل میں نہیں جاتا، کتابوں کا مطالعہ کیجیے) اس زمانہ کے اعلیٰ درجہ کے معقول اور ادیب تھے، وہ سب جمع ہو گئے۔ اس میں ایک ایک آدمی ایسا تھا کہ ایران جاتا تو ایران والے اس کی تعظیم کرتے، اس کی مدد کرتے، وہ سب جمع ہو گئے، شاعر، ادیب، معقولی، فلسفی، ایرانی، ہندوستانی، ایک طرف اکبر

(۱) سورة الأحزاب: ٦٢

تھا، اوراس کا دربار تھا، اس کی فوج تھی، اس کا حکم تھا، اس کے وسائل تھے، عوام تھے، اور ایک طرف خدا کا ایک فقیر بندہ درویش جس کا نام مجدد الف ثانی، اللہ ہم سب کو اس کی محبت اور عظمت عطا فرمائے، وہ ایک اللہ کا بندہ اس کے دل کو چوٹ لگی، اوراس کے پیچھے پڑ گیا، نتیجہ کیا ہوا کہ اکبر مرا اوراس کے بعد جہانگیر آیا، اس سے کہیں بہتر اور حضرت کا معتقد یعنی اس کا اتنا فرق ہوا، جہانگیر اکبر کا بیٹا ہے جس نے گائے کی قربانی کو ناجائز اور حرام بتایا کہ جو گائے کو ذبح کرے، اس کی سزا موت ہے، اور شراب کو بالکل جائز کر دیا، اس اکبر کا بیٹا جہانگیر جب کانگڑہ کا قلعہ فتح ہوتا ہے، اور ہندو جرنل کے ہاتھ فتح ہوتا ہے، تو وہ پہلا حکم یہ دیتا ہے کہ یہاں مسجد بناؤ، اور گائے ذبح کرو، یہ کس کی برکت ہے؟ کس کی ہمت تھی؟ یہ خلوص کی برکت ہے، پھر اس کے بعد کون آتا ہے؟ شاہ جہاں آتا ہے، اور تخت طاؤس پر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ فرعون احمق تھا کہ آبنوس کے تخت پر بیٹھا، اور خدائی کا دعویٰ کیا، میں محمد (ﷺ) کی امت ہوں، اور میں شکرانے کی نماز پڑھتا ہوں، پھر شاہجہاں کے بعد کون آیا؟ اورنگ زیب آئے، جن کو سادس الخلفاء الراشدین کہا گیا ہے، یعنی چھٹے خلیفۂ راشد، ایک بہت بڑے عالم شام کے انھوں نے یہ بات لکھی ہے، ان کا مضمون چھپا ہوا موجود ہے، یہ بس اللہ کے بندے کی ہمت کا نتیجہ ہے۔

کرنے کا کام

بھائیو! ارادہ کرو کہ اللہ کے بھروسہ پر تم مسلمانوں کا جو رشتہ دین کے ساتھ، علم کے ساتھ، اردو کے ساتھ قائم ہے، اس کو باقی رکھو گے، اس کا ارادہ کرلو گے تو دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ [1] اللہ کیسی مدد فرماتے ہیں، اور تم خود پھولو پھلو گے، اور یہ رشتہ خود ہی باقی رہے گا، یہ کرنے کا کام ہے، چاہے تمہیں تھوڑا افاقہ کی نوبت آ جائے، اگر آئے گی تو عارضی طور پر آئے گی، اور پھر اس کے بعد جب اللہ کے فتوحات کے دروازے کھل جائیں گے تو کیا ہوگا، دیکھنے والے دیکھیں گے۔

اور سنیے! کہ یہاں پڑھ رہے ہو، رضا کارانہ طریقہ پر دین کی خدمت کرو گے، اور علم دین باقی رکھو گے، اور چھوٹے موٹے مدرسے اور مکتب قائم کرو گے، شرماؤ نہیں، پہلے

(۱) سورۃ الفتح: ٤

ہمارے بزرگ انار کے درخت کے نیچے آ کے بیٹھ گئے، ان میں ایک استاد ملا محمود اور شاگرد محمود حسن شیخ الہندؒ تھے، تعلیم شروع ہوگئی اور بڑھتے بڑھتے دارالعلوم دیوبند اتنا بڑا مدرسہ ہوگیا کہ سارے عالم میں مشہور ہے، اور اسی طریقہ سے مظاہر علوم کی تاریخ پڑھو، ندوہ کی تاریخ پڑھو کہ ندوہ کہاں تھا، چھوٹا سا کمرہ، وہاں ایک مکان ابھی موجود ہے، وہاں جب ہم جاتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ یا اللہ! ندوہ یہاں کیا رہا ہوگا، اور یہاں مولانا شبلی رہتے تھے، اور یہاں مولانا ابوالکلام آزاد ایک طالب علم کی حیثیت سے رہتے تھے، اور سید سلیمان ندوی نے یہیں پڑھا اور مولانا عبدالباری نے یہیں پڑھا، بڑے بڑے مفکر جن کے نام اب تک روشن ہیں اور ہم ان پر فخر کرتے ہیں، ان سب نے یہیں پڑھا، اس وقت یہاں دیکھ رہے ہیں، ایک گاؤں کا گاؤں تیار ہوگیا ہے، آباد ہوگیا ہے، اتنی بڑی عمارتیں ہوگئی ہیں۔

اساتذہ سے تعلق اور ان کا ادب واحترام

شاید تم کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا جو تعلیمی سلسلہ ہے، اس کا مزاج دوسری تعلیموں سے بالکل الگ ہے، وہاں تو صرف ذہانت کافی ہے، حالانکہ یہ بتادوں کہ جو خالص مادی نظام تعلیم ہیں یورپ وغیرہ میں، وہاں استادوں کا بڑا ادب ہے، میں تو اب کی حیران رہ گیا، اب کی بار میں گیا تھا، وہاں کی سب سے اعلیٰ یونیورسٹیوں اور پرانی یونیورسٹیوں میں آکسفورڈ کا جس کا بڑا نام ہے، وہاں ایک اسلامی مرکز قائم ہونے والا تھا، وہاں مجھ کو بلایا گیا، مجھے حیرت ہوئی انھوں نے بتایا کہ یہ راستہ جو ہے اس پر صرف استاذ چل سکتے ہیں، اور طالب علم یہ ضد بھی نہیں کرسکتے کہ ہم نے کیا قصور کیا، ہمارے پاؤں میں کیا لگا ہوا ہے کہ ہم اس پر نہ چلیں، اس قانون کا احترام کرتے ہیں، اس راستہ پر صرف ان طالب علموں کو اجازت ہے جو استاذ کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، ہمارے کالجوں میں جو کچھ ہورہا ہے، ان کی ہم غریبوں کو کچھ خبر نہیں، اور پھر ہم کو دکھایا کہ یہ ہال کھانے کا ہے کہ استاذ اوپر بیٹھ کر کھاتے ہیں، اور طالب علم نیچے، یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھائیں، دنیا کے اتنے بڑے لوگ جن سے ہم نے سیکھا ہے، یہ انگریزی تہذیب جہاں سے آئی، وہاں کا حال بیان کررہا ہوں، ایسے ہی کیمبرج میں دیکھا اس سے پہلے وہاں گیا تھا، وہاں کا حال معلوم ہوا کہ

ہر طالب علم کو وہاں یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ کس استاذ کو اپنا مربی بنارہا ہے، یہ ضروری ہے، درجہ میں صرف نام لکھانا کافی نہیں، یہ بتانا ضروری ہے کہ میں فلاں استاد کی نگرانی میں ہوں، اس کے مشورے سے مطالعہ کرتا ہوں، اور اس کو اپنا کام دکھاتا رہتا ہوں، اور وہی مضامین کا انتخاب کرتا ہے، تم کیا پڑھو، کیا نہ پڑھو، تم کس لکچر میں جاؤ، کس لکچر میں نہ جاؤ۔

پہلے عربی مدارس کا طریقہ تھا کہ ہر طالب علم ایک استاد کو چن لیتا تھا، اور اس کی خدمت کرتے تھے، ہر طریقہ سے جسمانی خدمت بھی کرتے تھے، ان کی جوتیاں بھی سیدھی کرتے تھے، اور ان کے لیے ناشتہ وغیرہ تیار کردیتے تھے، ان سے پڑھتے تھے، اور بالکل انھیں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، لیکن اب ہمارے یہاں عربی مدارس تک میں روشن خیالی آرہی ہے کہ نہ طلبہ کو اپنے استادوں سے تعلق اور نہ اپنے بڑوں سے کچھ تعلق ہے، اور پڑھ لینے کے بعد کچھ سروکار نہیں ہے، اور خاص کر اس مدرسے میں (جس کی بنیاد ہی ان شاء اللہ تواضع پر رکھی گئی ہوگی) اس میں تو خاص طور پر اسلاف کے احترام پر، ان کی عقیدت پر زور ہونا چاہیے، اس پر عمل ہونا چاہیے، اور آپ کو اپنے استادوں کے ساتھ اس سے زائد تعلق ہونا چاہیے جو انگریزی طلبہ کو اپنے ٹیچروں سے ہو، بڑے مدارس کے طلبہ کو اپنے استادوں سے جتنا تعلق ہو، اس سے بھی زائد آپ کو اپنے استادوں سے تعلق رکھنا چاہیے، اس لیے کہ یہ ایک سادہ ماحول ہے، ایک گاؤں میں ایک مدرسہ ہے، اور آپ اچھے جذبہ سے آئے ہیں، اور آپ کے والدین نے بڑے شوق سے ارمان سے بھیجا ہے، استاد بڑی رغبت اور حکمت سے پڑھاتے ہیں، الحمد للہ یہاں وہ فتنے نہیں - خدا کرے بہت دنوں نہ آئیں - جو شہروں میں ہیں، جن سے بچا نہیں جاسکتا، تو استادوں کا ادب کرنا اور کسی کسی خاص استاد کو اپنے لیے نمونہ بنالینا اور اس کی ہر چیز کو غور سے دیکھنا، اور اس سے فائدہ اٹھانا، یہ ضروری ہے۔

اخلاص اور اختصاص

دوسری بات یہ ہے کہ مہارت پیدا کرو، استعداد پیدا کرو، مدرسوں میں کہتا ہوں، دو چیزوں کو میں نے خلاصہ بنایا ہے، اخلاص اور اختصاص، یہ دو چیزیں ہیں جن سے ہمارے

مدرسہ کا طالب علم اڑ سکتا ہے، پرواز کر سکتا ہے، خدا کے ساتھ معاملہ اخلاص کا اور علم کے ساتھ معاملہ اختصاص کا، یعنی خدا کے معاملہ میں مخلص ہو اور علم کے معاملے میں ماہر خصوصی ہو، حدیث کو لے لو، فقہ کو لے لو، کچھ بھی صرف ونحو کو لے لو، خصوصی طور پر پوری مہارت پیدا کرلو، بعض لوگ خطاطی میں مہارت پیدا کر لیتے ہیں تو لوگ ڈھونڈھتے رہتے ہیں، وہ کہیں بھی بیٹھ جائیں تو ان کو سفارش کر کے لاتے ہیں کہ آپ ہماری کتاب کا نام لکھ دیجیے، خود ہم کو سابقہ ہے کہ ایسے کاتبوں کے کیا کیا انداز اور کیا کیا مطالبے ہوتے ہیں، ہمارے لیے ایسی جگہ ہونی چاہیے کہ جہاں دھوپ نکلتی ہو، اس طرف اصحاب کہف کی طرح ﴿وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ (۱)، تو میں نے خود چل کر کے دکھایا کہ دیکھیے، وہ کہنے لگے ایسی جگہ ہونی چاہیے کہ میں کھڑے ہو کر سواریوں کا تماشا بھی دیکھ سکوں کہ موٹریں گزر رہی ہیں، اور ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں جب چاہوں چائے مل جائے، ان کے مطالبات یہ تھے، لیکن کیا کروں ہمیں کتاب لکھانی تھی، ماہر فن تھے، ان سے اچھا لکھنے والا لکھنؤ میں کوئی نہیں تھا، اگر آدمی کو کسی چیز میں مہارت حاصل ہو جائے تو کبھی بھی کوٹھری میں کنڈی بند کر کے بیٹھیں گے، تو لوگ گھر میں گھس کر اور سر پر بٹھا کر لائیں گے، اور کہیں گے تشریف رکھیے، اور جو چاہیے لیجیے اور میرا کام کیجیے۔

مہارت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے، اب تو حالت یہ ہے کہ کسی فن کا کوئی پڑھانے والا دنیا سے چلا جائے، مدرسے سے چلا جائے، دونوں کا نتیجہ ایک ہے، ڈھونڈھیے تو آدمی نہیں، صرف ونحو میں یہ حالت ہے کہ عبارت صحیح پڑھنا مشکل، کہیں سفر میں نماز پڑھنے کی نوبت آ گئی، جامع مسجد چلے گئے تو خطبہ سن رہے ہیں کہ ایک رنگ آ رہا ہے ایک رنگ جا رہا ہے کہ ایسی فحش غلطیاں؟ تو یہ حالت ہو گئی ہے، اس کی اصلاح آسانی کے ساتھ چھوٹے مدارس سے ہو سکتی ہے، چھوٹے مدرسوں میں پڑھ کر بڑے مدرسوں میں جایا کرتے ہیں، اچھی استعداد کے لوگ وہیں سے آتے تھے، دیوبند کا طریقہ، مظاہر علوم کا بھی طریقہ ہوگا، اور ندوہ کا بھی، ہمارے یہاں جن لوگوں نے امتیاز پیدا کیا، بڑا نام پیدا کیا، وہ وہ لوگ تھے جو نچلے درجہ تک کی

---

(۱) سورۃ الکہف: ۱۷

تعلیم کسی ابتدائی مدرسہ سے حاصل کر کے آئے، ہمارے یہاں تو مثلاً ساٹھ طالب علم ستر طالب علم ایک درجہ میں ہوتے ہیں، اور بھی ہو سکتے ہیں، ان کو استاد نہ پہچانتا ہے، نہ ان کی خوبی اور کمزوری کو جانتا ہے، بس ایسے گاڑی چلتی رہتی ہے، لیکن ان مدرسوں میں دس طالب علم پندرہ طالب علم ایک ایک کو استاد پہچانتا ہے، نبض پر ہاتھ رکھتا ہے، کس کی صرف کمزور اور کس کی نحو کمزور، اور کس کی عبارت کمزور ہے، عبارت دیکھ کر نہیں آتا، یہ مطالعہ دیکھ کر کے نہیں آتا، یہ استفادہ نہیں کرتا، ہم کو سب معلوم ہے، تو یہاں زیادہ موقع ہیکسی بڑے مدرسہ کے مقابلہ میں، کہ آپ لوگ کسی علم کو متعین کر کے محنت کریں، یہ ضروری ہے، کسی خاص مرحلے پر جا کر ایک علم کو متعین کرلیں کہ ہمیں اس علم میں خصوصی مہارت حاصل کرنی ہے۔

مدارس کی مخالفت کی اصل وجہ استعداد ناقص ہے

یہ ہمارا نظام تعلیم جو ہے، اس کے نمائندہ ہمارے یہ مدرسے ہیں، یہ خطرہ میں پڑ گئے، اس کی مخالفت کی اصل وجہ استعداد ناقص ہے، جب پڑھانے والے نہ ملیں گے تو پڑھنے والے کہاں ملیں گے؟ آپ دیکھ لیجیے، ہمارے بڑے بڑے علماء جو دنیا سے چلے گئے، ان کی جگہ کس نے لی، حضرت مولانا انور شاہؒ، مولانا مدنیؒ کی جگہ، مولانا فخر الدین صاحب کی جگہ، بڑے بڑے مدرسوں کو شیخ الحدیث نہیں مل رہے ہیں، کسی کو فقہ پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، کس کس سے پڑھیں، کسی کو اصول پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، کسی کو ادب پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، اور ادب پڑھانے والا کوئی مل بھی جائے تو آپ لوگوں کی دعا سے، لیکن قدیم علوم جو ہیں، جن کے پڑھانے والے برابر ختم ہوتے جا رہے ہیں، میرے کہنے کو غیظ وغضب پر محمول نہ کریں، نہ کسی نے مجھ سے شکایت کی ہے، زمانہ کا رنگ دیکھ کر میں کہہ رہا ہوں کہ محبت ہوگی عظمت کی بنا پر، اور اس کو سمجھیں آپ کہ اپنے اساتذہ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، اور بڑا ان سے فیض پہنچ سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ فیض پہنچاتا ہے، یہاں تک کہ اگر ان میں فیض نہ ہو تو اللہ تعالیٰ فیض پہنچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فیض پیدا کر دیتا ہے، تو ان کے تھوڑے علم سے فیض پہنچنے لگتا ہے جو بڑے علم والوں سے بعض اوقات نہیں پہنچتا۔

مکاتب کے قیام کی ضرورت

بہت اچھا ہوا کہ اللہ نے مجھے کل کے جلسہ کے بعد آپ سے خطاب کرنے کا موقع دیا اور آپ سے الگ بات کرر ہا ہوں، آپ ہمارے حلقہ کے لوگ ہیں، لیکن اس بات کو محض تقریر کی بات نہ سمجھئے، یعنی بالکل اس بات کا ارادہ کر لیجیے کہ آپ جا کر اپنے اپنے گاؤں میں، محلے میں دین کا کام کریں، اور جہاں مناسب سمجھیں اگر ایک جگہ نہ موقع ملے دوسری جگہ مدرسہ قائم کریں، مکاتب قائم کریں، میں بڑے بڑے دار العلوموں سے زیادہ مکاتب و مدارس کو ضروری سمجھتا ہوں، دینی تعلیمی کونسل سے میرا تعلق ہے، مجھے معلوم ہے کہ کیا انقلاب آ رہا ہے اس ہندوستان میں، اور کس طرح نئی نسل پیدا ہو رہی ہے، اس نسل کو دین سے وابستہ رکھنے کے لیے بڑے بڑے دار العلوم اتنے مفید نہیں جتنے مکاتب مفید ہیں، اللہ تعالیٰ اس دین کو قائم رکھے گا، کچھ شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی، ولی اللہ پیدا ہوتے رہیں گے، اور خدانخواستہ دین ہی ختم ہو گیا تو پھر آدمی کہاں سے پیدا ہوں گے؟ بس آپ سے امید ہے کہ آپ نے اچھے طریقہ پر سمجھ لیا ہوگا، اس وقت پوری کوشش کرنی ہے، ہاتھ پاؤں مارنے ہیں، جان کی بازی لگا دینی ہے کہ ملت کا، ہماری مسلم قوم، جتنی آبادی ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کی ہے، اس کا تعلق مذہب سے، توحید سے، عقائد سلیمہ سے، سنت سے، فرائض سے، ذات نبوی سے، شریعت اسلامی سے، اسلامی ثقافت سے جن میں اردو شامل ہے، اس سے کسی نہ کسی درجہ میں قائم رہے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس ملک سے کام لے گا، اور اس ملک سے دوسرے ملکوں میں پہنچائے گا، بارہا کیا ہے اور ہر وقت کرنے پر قادر ہے، لیکن پہلے ہم جو کر سکیں وہ کر لیں، پھر اس کے بعد اللہ اپنی قوت کا مظاہرہ کروائے گا، دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے، اسی وقت اللہ تقدیر الٰہی کا انتخاب کر دے اس مجمع میں کہ ان لوگوں سے اپنے دین کی بقا کا کام لیں گے اور ہم ان سے علم کو اور ملت کے تعلق کو ٹوٹنے نہ دیں گے۔ (۱)

---

(۱) جامعہ عربیہ، ہتورا (باندہ) میں ۱۹۸۶ء میں طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا بشیر احمد گونڈوی قاسمی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ جون ۱۹۸۶ء)۔

علم دین کا حصول باعث عزت وسرفرازی ہے

ایک دلچسپ واقعہ

میرے دوستو، اساتذۂ مدرسہ اور طلبائے عزیز! ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے، اسی سے میں اپنی بات شروع کرتا ہوں، اسلام کی اولین تاریخ میں غالباً پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے کہ ایک بڑے کھاتے پیتے مسلمان اور اچھے شریف آدمی تھے، وہ جہاد میں جانے لگے، جہاد میں آدمی جاتا تھا اور خاص طور پر اس زمانہ میں تو نیت کر کے جاتا تھا کہ اللہ شہادت نصیب فرمائے اور قبول فرمالے، اب قیامت میں ملنا ہو تو سب سے اچھا ہے، اور زندگی رہی تو کب واپسی ہوگی اور کس حال میں واپسی ہوگی، اور دو برس میں آئیں، چار برس میں آئیں، کتنے برس میں آئیں، کچھ نہیں کہا جاسکتا، وہ شہادت کو بڑی سعادت سمجھتے تھے، اور بڑی خوش قسمتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے راستہ میں قبول فرمالے، ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾۔[1]

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ایمان والوں میں کچھ لوگ ہیں جنھوں نے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا، پورا کر کے دکھادیا کہ

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اللہ نے جان دی تھی، اللہ کے راستے میں ہم نے جان دی، اگر یہ نہیں تو ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾، کہ اللہ کے کچھ بندے وہ ہیں جو انتظار میں رہتے ہیں جب اللہ بلالے، جب جہاد

---

(۱) سورة الأحزاب:۲۳

کی ضرورت ہو، جان کا نذرانہ پیش کرنے کا موقع ملے، تو فوراً نکل کھڑے ہوں۔

تو وہ جب چلنے لگے گھر سے، ان کا چھوٹا سا بچہ تھا، دو برس کا چار برس کا، یاد نہیں مجھے اس وقت، انھوں نے اپنی اہلیہ صاحبہ کو ایک بڑی رقم دی اور کہا کہ میں تو جاتا ہوں، معلوم نہیں کب آنا ہوتا ہے، آنا ہوتا بھی ہے یا نہیں، تو تم کسی کی محتاج نہ رہو، نہ اپنے میکہ والوں کی اور نہ سسرال والوں کی، نہ بھائیوں کی، اتنی رقم ہے کہ کسی طرح سے گزارا ہو جائے گا، وہ رقم دے کر گئے، اور اللہ کی راہ میں ان کو بہت دن لگ گئے، شاید دس بارہ سال لگ گئے، اور یہاں گھر والے بھی سمجھے ہوں گے کہ شہید ہو گئے، اور ان کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں زندہ سلامت واپس آ جاؤں گا، بہرحال جب وہ عرصۂ دراز کے بعد گھر آئے، اہلیہ صاحبہ ملیں، اور کوئی بچہ نظر نہیں آیا، حساب لگایا ہوگا کہ اتنا بڑا تو ہو گیا ہوگا اگر زندہ ہے، زندگی کا کیا بھروسہ، اس زمانہ میں نہ ڈاک تھی، نہ اخبارات نکلتے تھے، اور اخبار میں بھی بہت بڑی بڑی باتیں نکلتی ہیں، بڑے آدمیوں کے انتقال کی خبر ہوتی ہے، چھوٹے آدمیوں کا کہاں تک ذکر کیا جائے، تو وہ آئے اور دم لیا، رات بھر آرام کیا، صبح انھوں نے پوچھا کہ رقم کم تو نہیں ہوئی تھی اور پھر یہ جاننا چاہا کہ بچی ہے یا نہیں بچی ہے، اور کہاں خرچ ہوئی، اہلیہ صاحبہ بھی ماشاء اللہ بڑی پڑھی لکھی اور عقل مند تھیں، انھوں نے کہا: اس کی اتنی جلدی کیا ہے، مسجد جائیے، نماز پڑھیے، پھر اس کے بعد بیٹھیں گے، اور حساب کتاب لگائیں گے، وہ مسجد میں گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان کا درس ہو رہا ہے، حدیث شریف پڑھا رہا ہے، اور بڑے بڑے علم والے اس کے حلقۂ درس میں بیٹھے ہوئے ہیں، صورت سے آدمی پہچان ہی لیا جاتا ہے، کہ بڑے شریف لوگ ہیں، رئیس لوگ ہیں، مہذب لوگ ہیں، سب بڑے ادب کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چاروں طرف بیٹھے ہیں اور وہ کہہ رہا ہے: عن فلان بن فلانٍ قال حدثنا رسول الله (ﷺ)، عن فلان بن فلان عن رسول الله (ﷺ) قال كذا و كذا، وہ حدیث سنا رہے ہیں اور سب لوگ بڑے ادب کے ساتھ سن رہے ہیں، ان کو بڑا رشک آیا، اور کہا کہ ابھی بالکل نوجوان ہے مگر اتنے بڑے بوڑھے، اتنے بڑے بڑے لوگ چاروں طرف بیٹھے ہیں، کسی امیر کی مجلس میں بھی ایسا ادب نہ دیکھا ہوگا جیسا ادب یہاں ہے کہ کوئی نہ مسکراتا ہے

اور نہ کوئی کسی کو دیکھتا ہے، نہ کوئی بات کرتا ہے اور سب ایسے بیٹھے ہیں کہ گویا نماز میں بیٹھے ہوئے ہوں یا مسجد میں بیٹھے ہوئے ہوں نماز کے انتظار میں، تو بڑا رشک آیا، اور آدمی کا دل تو چاہتا ہی ہے کہ ہمارا بیٹا بھی ایسا ہی ہو، پوچھنے کی نوبت نہیں آئی کہ اس نوجوان کا نام کیا ہے، بس اتنا سمجھ گئے کہ مدینہ کے بڑے عالم ہیں۔

اتفاق سے جب وہ درس سے فارغ ہوکر گھر آنے لگے تو اس نوجوان کا اور ان کا دروازہ پر ساتھ ہو گیا، اور وہ نوجوان عالم اندر جانے لگا تو انھوں نے کہا کہ اتنے بڑے عالم حدیث کا درس دیتے ہو، نامحرم کے گھر میں جا رہے ہو، بغیر اجازت اور بغیر آواز دیے ہوئے، اور یہ چلے، تو انھوں نے کہا کہ آپ غیر کے گھر میں جا رہے ہیں اور پوچھتے نہیں، اس نے کہا: تم کون ہو؟، انھوں نے کہا کہ تم کون ہو؟ معلوم ہوا کہ دونوں باپ بیٹے ہیں، اب وہ بہت خوش ہوئے اور کہا: ابھی تو ہم نے یہ تمنا کی تھی کہ میرا بیٹا ایسا ہوتا، اب باپ بیٹے کا تعارف اس طرح ہوا، بڑے میاں یہ سمجھے کہ یہ میرا بیٹا ہے اور صاحبزادے یہ سمجھے کہ یہ ہمارے مجاہد باپ ہیں، سنتے ہوں گے اپنی والدہ سے کہ تمہارے والد جہاد میں گئے ہیں، دیکھو یہاں ملتے ہیں یا میدان قیامت میں یا جنت میں ملاقات ہوتی ہے، وہاں ملاقات ہوئی تو اب خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا، اب یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی کہ تم نے روپیہ کہاں خرچ کیا تھا، ان روپیوں کا انھوں نے نتیجہ دیکھ لیا، اور بچہ کی والدہ نے کہا کہ آپ کی دی ہوئی امانت، اتنی بڑی رقم میں نے اس بچہ کی تعلیم میں خرچ کر دیا، اور آج اللہ نے اس لڑکے کو اس قابل بنایا۔

تو میرے بھائیو! ایک وہ زمانہ تھا ایمان کی قدر کا اور علم کی قدر کا کہ ان کو ہرگز یہ تمنا نہیں ہوئی ہوگی کہ اس روپیہ کو تجارت میں لگا دیا ہوتا، تو کچھ گھر کی حالت بہتر ہوتی، اور شاندار کوٹھی بنتی، اس طرح کا وہ زمانہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کا قصہ بیان کیا ہے کہ قارون نے جو اس زمانہ کا بہت ہی دولت مند آدمی تھا، اس کے خزانوں کی کنجیاں اٹھانے کے لیے پوری جماعت چاہیے تھی، اور وہ کنجیاں اس سے بھی نہیں اٹھتی تھیں، تھک تھک جاتے تھے، شل ہو جاتے تھے، اتنی کنجیاں تھیں، آپ خیال کیجیے کہ ایک کنجی تو ایک صندوق کے لیے کافی ہوتی ہے، اور صندوق میں ہزاروں ہزاروں روپے رکھے جا سکتے ہیں، کتنی تجوریاں

ہوں گی، کتنے بکس رہے ہوں گے، کتنی کوٹھیاں رہی ہوں گی، اچھے طاقتور لوگ اور ایک جماعت کے بس کی بات بھی نہیں تھی، ان کے لیے بھی بہت بڑا بوجھ کہ وہ کنجیاں اٹھائیں، ایسا آدمی جب جلوس میں نکلا تو لوگوں کے منھ میں پانی بھر آیا، کاش کہ ہم کو بھی وہی دولت ملی ہوتی جو قارون کو ملی ہے، بڑا قسمت کا دھنی ہے، سوچنے کا ایک انداز یہ بھی ہے، موسیٰ کے زمانہ میں بھی لوگ اسی طرح سوچتے تھے اور آج بھی ہیں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں ایک زمانہ تھا عالموں پر رشک کرنے کا اور محدثوں پر رشک کرنے کا، فقہاء اور عابدوں پر رشک کرنے کا، مجاہدوں پر رشک کرنے کا، اور شہیدوں پر رشک کرنے کا، لوگ شہیدوں پر رشک کرتے تھے، ایک کی خواہش ہوتی کہ ہم پہلے چلے جائیں، دوسرا کہتا تھا ہم پہلے جائیں۔

حضور (ﷺ) ایک غزوہ کی تیاری فرمارہے تھے کہ ایک صاحبزادے آئے، انھوں نے کہا کہ ہم بھی چلیں گے، آپ نے فرمایا کہ نہیں تم ابھی اس قابل نہیں ہو، ابھی بچے ہو، ان سے پہلے آپ ایک بچے کو جو اچھی صحت اور اچھے ڈیل ڈول کا تھا (بعض بچے ہوتے ہیں اونچے قد کے) اس کو اجازت دے چکے تھے، ان صاحبزادے نے کہا کہ اللہ کے رسول! میری ان سے کشتی کرادیجیے، کشتی ہوئی، انھوں نے پہلے کو گرادیا، چنانچہ دونوں کو اجازت مل گئی، ایسا ہوتا تھا اس زمانہ میں قرعے ڈالے جاتے تھے۔

ایک بڑے میاں آئے حضور (ﷺ) کے پاس کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں، لیکن میرے بیٹے جانے نہیں دیتے، کہتے ہیں آپ معذور ہیں، بوڑھے ہیں، آپ نہیں جاسکتے، اور میں جاسکتا ہوں، آپ نے سفارش فرمائی لڑکوں سے کہ بھئی اتنا ہی شوق ہے تو ان کو جانے دو، وہ گئے اور شہید ہوگئے، ایسا زمانہ بھی گزرا ہے ہماری آپ کی تاریخ میں۔

میں کہہ رہا تھا کہ جب وہ صاحب آئے اور دیکھا کہ ان کا بیٹا اتنا بڑا محدث ہے، وہ خوش ہوگئے کہ دنیا جہاں کی دولت مل گئی، وہ صاحب ایمان تھے، علم کی قدر تھی، اور اگر وہ صحابی نہیں تو تابعی ضرور ہوں گے، ان کو دین و دنیا کی دولت مل گئی، نہال ہوگئے کہ اللہ اکبر میں جو علم نہ حاصل کرسکا، میرا بیٹا وہاں پہنچ گیا، اس سے زیادہ برکت والی دولت اور کیا ہوسکتی ہے، اس سے زیادہ سمجھدار اور باتوفیق ماں کون ہوسکتی ہے جس نے رقم کا اتنا صحیح استعمال کیا۔

سارا معاملہ قدر کا ہے

میرے بھائیو! سارا معاملہ قدر کا ہے، کہ ماں باپ قدر کریں، اور خود آپ قدر کریں، آپ نے سنا ہوگا کہ سب کچھ پڑھا، بخاری مسلم ہدایہ وغیرہ سبھی پڑھی، لیکن ان کے دل میں قدر نہیں ہے، اس کے بعد انگریزی پڑھنی شروع کی، میں منع نہیں کرتا، میں بھی تھوڑی بہت جانتا ہوں، لیکن یہ خیال کہ عربی مدارس میں پڑھ کر ہم نے وقت ضائع کیا، اس سے ایمان کے سلب ہونے کا اندیشہ ہے، علم تو بعد کی چیز ہے، اگر کسی کے دل میں یہ خیال آیا کہ ہم نے کہاں اپنے کو ضائع کیا، تو ایسا آدمی ضائع ہو جاتا ہے، بالکل پانی پھر جاتا ہے اس کی محنتوں پر اور اس کی صلاحیتوں پر، اس کے بڑے عبرتناک واقعات ہیں، بلکہ یہاں تک واقعات ہیں کہ بے ادبی سے بھی ایسا ہوتا ہے۔

ایک واقعہ میں نے بڑا عبرتناک پڑھا ہے تاریخ کی کتابوں میں، حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا نام آپ نے سنا ہوگا، آپ جب کلکتہ سے گزر رہے تھے حج کو جاتے ہوئے تو وہاں ٹیپو سلطان کا پورا خاندان تھا، انگریزوں نے ان کی سلطنت پر قبضہ کر کے ان کے لڑکوں، لڑکیوں اور پوتوں سب کو گرفتار کر کے جیل میں رکھا کہ یہ پھر کوئی ہنگامہ نہ کر سکیں، وہ لوگ سید صاحب کے خاندان کے معتقد تھے، کسی نے کہا کہ بریلی کے سید صاحب آئے ہوئے ہیں، بڑا شہرہ ہے، پورے شہر میں لوگ توبہ کر رہے ہیں، لوگوں کی حالت کچھ سے کچھ ہوتی چلی جارہی ہے، کہ شراب پینے والے شراب چھوڑ رہے ہیں، اور شریعت کے خلاف چلنے والے شریعت پر عمل کرنے لگے ہیں، ذرا معلوم کرو کہ کس خاندان سے ان کا تعلق ہے، ان سے کہنا کہ آپ سید ابوسعید صاحب کو جانتے ہیں، سید صاحب نے فرمایا کہ وہ تو ہمارے سگے نانا تھے، انھوں نے کہا کہ ہم تو آپ کے خاندان کے خادم ہیں، آپ ہمارے یہاں آئیں اور ہم لوگ توبہ کریں، بیعت ہوں، اور ہمارے بڑے بھائی صاحب ہیں، ان کا حال اچھا نہیں ہے، نماز روزہ تو الگ رہا، وہ تو بالکل دہریہ ہو گئے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گورکھپور کے ایک مولوی صاحب کا نام لیا، میں نام نہیں لیتا، وہ ان کو پڑھاتے تھے، وہ بہت بداعتقاد ہیں، فلسفے وغیرہ کا بڑا اثر ہے، وہ خود بھی ملحد اور دہریے ہو گئے ہیں، بھائی صاحب کو

بھی دہریہ بنادیا ہے، آپ ان کی طرف بھی توجہ فرمائیں، خیر خاندان کے سب لوگ بیعت ہوئے، تو ان کو بھی خیال آیا، ان کو بلایا، تو سید صاحب کے ہاتھ پر توبہ کی اوران کی اصلاح ہوئی، تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب جن کی وجہ سے یہ حالت ہوئی شاہ اسماعیل شہید کے ساتھیوں میں تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے یہاں پڑھتے تھے، ہم نے سراغ لگانا شروع کیا کہ آخر یہ بات کیوں ہوئی، معلوم ہوا کہ ایک دن بخاری شریف کا درس ہورہا تھا، ہوا سے اس کے اوراق اڑ رہے تھے، اور آواز ہوتی تھی، شاہ صاحب نے کہا کہ بھئی کوئی چیز کتاب پر رکھ دو، کہ آواز نہ ہو، کسی نے قلم رکھ دیا، کسی نے کوئی چھوٹی سے کتاب رکھ دی، کسی نے کوئی چیز رکھ دی، انھوں نے اپنا پاؤں رکھ دیا، بس یہ کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل سے گویا ایمان سلب کرلیا، اور آئندہ کے لیے ان کو محروم کردیا، اور اسی حالت میں انتقال بھی ہوا۔

میرے عزیزو! پہلی چیز ہے قدر، اور قدر ماں باپ کو بھی ہو، یہاں تو دس پانچ ہوں گے لیکن میں آپ کے واسطے سے آپ کے والدین کو یہ بات پہنچانا چاہتا ہوں، آپ جاکر کہہ بھی سکتے ہیں، پہلے تو ماں باپ کو قدر ہو کہ ہم اپنے لڑکے کا وقت ضائع نہیں کررہے ہیں، بلکہ ہم کام کا بنارہے ہیں، اپنی نجات اور مغفرت کا بھی ذریعہ بنارہے ہیں، اس لیے کہ قیامت میں دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے، یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جب متقین کام آئیں گے ایک دوسرے کے جن سے کوئی رشتہ نہیں، تو کیا بیٹے کام نہیں آئیں گے ماں باپ کے؟ ماں باپ بیٹے کے بھی کام آتے ہیں، ایک دو یتیم بچوں کا خزانہ تھا، ماں باپ نے چھوڑا تھا، وہ زمین میں دفن تھا، ایک دیوار کھڑی تھی، اس سے حفاظت تھی، دیوار گری جارہی تھی، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حضرت خضر کے ساتھ نکلے اور اس گاؤں میں بھی پہنچے، گاؤں والوں نے کوئی مہمانی نہیں کی، کسی نے پوچھا نہیں کہ باہر کے لوگ آئے ہیں، یہاں ٹھہریے، یہاں رہیے، کھانا کھالیجیے، کوئی خبر نہیں لی، حضرت موسیٰ کو بہت ناگوار ہوا، اور پیغمبرانہ غیرت جوش میں آئی کہ ہر جگہ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے، یہاں ان لوگوں نے کوئی خبر ہی نہیں لی، اور خضر نے یہ کیا کہ دیوار گری جارہی تھی خدا کے واسطے ہاتھ لگا کر مصالحہ وغیرہ لگا کر اسے ٹھیک کردیا، موسیٰ نے کہا کہ آپ جو کام کرتے ہیں وہ سمجھ میں نہیں آتا، کشتی والوں نے احسان کیا تھا، اس میں سوراخ کردیا، ایک لڑکا معصوم تھا،

آپ نے اس کا گلا دبادیا، اور یہ گاؤں والے ایسے تھے کہ انھوں نے ناشتہ تک کی خبر نہیں لی، آپ نے الٹا احسان کیا کہ ان کی دیوار درست کردی، تو جب بتانا شروع کیا، وہاں اس لیے کیا، وہاں اس لیے کیا، وہاں یہ حکمت تھی، ﴿كَانَ أَبُوهُمَا صَالِحاً﴾[1]،ان کا باپ بہت نیک آدمی تھا، اس لیے یہ دیوار سیدھی کردی، اس طرح باپ کا فائدہ بیٹے کو پہنچتا ہے وہ اگر نیک ہو، اور بیٹوں کا فائدہ ماں باپ کو پہنچتا ہے، دونوں طرف یہ فائدہ منتقل ہوتا ہے۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ ماں باپ اللہ کا شکر کریں اور مجبوری نہ سمجھیں، اسکول کی فیس بہت ہوتی ہے، داخلے کے لیے بڑی بڑی سفارشیں لگانا پڑتی ہیں، اور دوڑنا پڑتا ہے، پھر کپڑے بھی اسکول جانے کے لائق ہوں، پھر بچہ کہتا ہے میں کرکٹ کھیلوں گا، یہ چاہیے، وہ چاہیے، ٹینس کھیلوں گا، فٹ بال کھیلوں گا، فیس دیجیے کلب کی یونین کی، یہاں ایک دفعہ مدرسہ میں داخل کردیا، نہ فیس نہ کچھ، اور سواری کے پیسے بھی نہیں دینے پڑتے، اور بلکہ بہت سے بچوں کی وہیں سے خبر گیری ہوتی ہے، تو مدرسہ میں داخل کردو اور چھٹی، یہ نہ سمجھیں بلکہ قصداً اپنی نیت شامل کرکے کہ میں نے اپنے بیٹے کو عربی دینی مدرسہ میں داخل کیا ہے، کہ خود دین سیکھے، اور پھر وہ لوگوں کو بھی سکھائے، اور ہمارے گھر میں بھی دین کا چرچا ہو، توحید اور شرک کا فرق بتائے، کفر اور ایمان کا فرق بتائے، حلال اور حرام میں تمیز کرائے، حلال کمائی سے ہماری بھی خدمت کرے، اپنی بھی، اور اس کی وجہ سے ہدایت ہو لوگوں کی، ہمیں ثواب ملے، اور ہمارے لیے آخرت کا ذخیرہ بنے، ماں باپ کی نیت صحیح ہو تو اس کا بڑا اثر پڑتا ہے، اور آپ کی بھی نیت اچھی ہونی چاہیے، بلکہ اس پر فخر ہونا چاہیے، شکر ادا کرنا چاہیے، اور اگر رشک کیا کہ کالج کے لڑکے جارہے ہیں، ہمارا بھی ایسا ہی لباس ہوتا، ہم بھی ایسے ہی ٹھاٹ سے جاتے، ہم بھی ایسے ہی وردی پہنے ہوئے ہوتے، تو پھر خطرہ ہے کہ آپ کو یہاں بھی فائدہ نہ ہو۔

دین کو عزت کی نگاہ سے دیکھئے

ماں باپ کو قدر کرنی چاہیے بلکہ میں تو کہتا ہوں محلّہ والوں کو محبت و عزت کی نگاہ سے

---

(۱) سورۃ الکہف: ۸۲

دیکھنا چاہیے، اور یہ نگاہ جو عزت سے اٹھتی ہے وہ بھی اللہ کے یہاں بڑا درجہ رکھتی ہے اور ایسے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ محروم نہیں رکھتا، ہوسکتا ہے کہ ان کی اولاد میں بھی علم دین آئے، وہ دیکھ کر کہیں ارے بھائی دیکھو کیسے سعید بچے ہیں، چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نمازی ہیں، قرآن مجید پڑھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کو بھی دین کا کوئی حصہ نصیب فرماتا ہے، دین کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے سے بھی اللہ تعالیٰ نواز دے گا۔

ایک بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں، بشر الحافی نام ہے ان کا، ان سے کسی نے کہا کہ آپ کے حالات تو اچھے نہیں تھے، پہلے بالکل آزاد تھے، آزاد لوگوں میں رہتے تھے، کیا بات ہوگئی، کہنے لگے کہ میں ایک دفعہ گزر رہا تھا، میں نے ایک پرزہ لکھا ہوا دیکھا، اس پر قرآن شریف کی آیت لکھی تھی، تو میں نے اٹھایا اس کو بڑی عزت کے ساتھ اس نیت سے کہ کہیں ایسی جگہ رکھا جائے جہاں بے ادبی نہ ہو، بس اللہ تعالیٰ نے مجھے نواز دیا، اتنی بات پر مجھے نواز دیا، ایسے ہی ایک بزرگ کا واقعہ دیکھا، وہ بہت بڑے پہلوان تھے، اور بالکل آزاد آدمی تھے، کہنے لگے کہ اکھاڑے میں میں ایک مرتبہ اترا، اور تمام لوگ تھے، اس میں یہ تھا کہ بازی کون لے جاتا ہے، اور جو میرے مقابلہ میں تھے وہ ذرا کمزور تھے، میں بہت آسانی کے ساتھ ان کو چت کردیتا، میں جب چت کرنے لیے بڑھا تو انھوں نے کان میں کہا: دیکھو میں سید ہوں، بس میں فوراً ہٹ گیا، ہار گیا، اور زمین پر خود سے گر گیا، غالباً اسی رات حضور اکرم (ﷺ) کی خواب میں زیارت ہوئی، آپ نے رمایا کہ تم نے میری اولاد کی عزت کی، اللہ تعالیٰ تمہیں عزت دے گا۔

بھائیو! یہ باتیں بڑی اہم ہیں، اس میں کچھ لگتا نہیں، نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری، مگر اللہ تعالیٰ نیت دیکھتا ہے: ﴿ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴾(۱)، اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے، یہ دلوں کا ادب ہے، آپ بھی شکر کریں اللہ کا، آپ ابھی بچے ہیں، لیکن آپ بھی شکر کریں اللہ کا اور فخر کریں اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم دین دے رہا ہے، آپ اللہ کی کتاب پڑھنے کی قابل ہو رہے ہیں، اور اللہ کی کتاب سمجھنے کے قابل ہو رہے

(۱) سورۃ الحج: ۳۲

ہیں، مسئلہ مسائل بتانے کے قابل ہو رہے ہیں، یہ چیزیں وہ ہیں جن کا تعلق دل سے ہے۔

استعداد پختہ کریں

اور پھر محنت کرنا، کتاب دیکھ کر سبق پڑھنا، پڑھ کر کتاب دیکھنا، اور رات کو تھوڑا سے جاگنا اور سبق یاد کرنا، امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنا، اور استعداد پختہ کرنا، خاص طور پر صرف ونحو کی کہ مشکل سے مشکل کتاب آپ سمجھ سکیں، آئندہ دارالعلوم ندوۃ العلماء جائیں، دیوبند اور سہارنپور جائیں، کہیں جائیں تو آپ اچھے طالب علموں میں شمار ہوں۔

بھائیو! یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں، مبارکباد دیتا ہوں، مسجد میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ ایک دن آئے گا کہ ان شاء اللہ ایک شاندار عمارت ہوگی، ایک دارالعلوم ہوگا، ایک اچھا مدرسہ ہوگا، اور جو لکھنؤ آئے گا لوگ اس کو بتائیں گے کہ آپ نے ندوہ دیکھا تو ایک اور چھوٹا ندوہ دیکھیے، ان کو عمارت دکھائی جائے گی، لیکن آپ جب تک یہاں پڑھ رہے ہیں، اس کو مبارک سمجھئے، یہ وہ مسجد ہے جہاں بڑے بڑے فاضل لوگ پڑھ کر نکلے جن کو فرنگی محل کے اساتذہ نے تعلیم دی، آخر میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا نعیم صاحب فرنگی محلی جیسے کئی حضرات کے نام تاریخوں میں ہم نے دیکھے ہیں کہ ان کے شاگرد حیدر بخش کی مسجد میں رہتے تھے، حیدر بخش کی مسجد کا نام سب سے پہلے اسی سلسلہ میں ہم نے سنا، وہ پڑھتے تھے وہاں جا کر، اور رہتے تھے یہاں، مطالعہ یہاں دیکھتے تھے، سبق یہاں یاد کرتے تھے، کیسی کیسی نمازیں پڑھی ہوں گی، کیسی کیسی دعائیں کی ہوں گی، جب تک آپ یہاں رہیں، اس کو غنیمت سمجھئے، پھر انشاء اللہ اللہ تعالیٰ سامان کرے گا، اور عمارت اپنی ہوگی، وسیع ہوگی، عمدہ ہوگی، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ آپ مجبوری سے ہیں کہ فلاں صاحب دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے ہیں، دارالتفسیر الگ ہے، دارالحدیث الگ ہے، اور ندوۃ العلماء یہاں سامنے ہے، قریب ہے، ہم ایک مسجد میں پڑے ہوئے ہیں، یہ نہیں، مسجد مسجد ہی ہے، وہ دارالعلوموں سے، سب سے زیادہ افضل ہے، لیکن مجبوری سے عمارت بنائی جاتی ہے، ازہر بھی شروع ہوا مسجد سے، اب شہر کا شہر ہے، جامعۃ القرویین، جامعۃ الزیتونۃ، یہ سب مسجدوں سے نکلے ہیں، اب بھی

ان کے نام کے ساتھ جامع کا لفظ ہے، پھر جب طلبہ کی تعداد بڑھی، دور دور سے لوگ آنے لگے تو پھر ان کے لیے عمارتیں بنیں، ایسا ہی ان شاء اللہ اس مدرسہ کا ہونے والا ہے اور ہوگا، ہر چیز کا وقت مقرر ہے اللہ کے یہاں، اور وہی وقت مناسب ہے۔

میں اساتذہ سے بھی کہوں گا کہ مجبوری نہ سمجھیں بلکہ یہ سمجھیں کہ یہ بھی ایک نعمت ہے کہ اللہ و رسول کا کلام اللہ و رسول کے گھر میں پڑھ اور پڑھا رہے ہیں، بس یہ چند باتیں ہیں، اب نیا تعلیمی سال شروع ہوا ہے، محنت کیجیے، اور محنت ہی سے سب کچھ ملتا ہے، ذہانت سے کم، محنت سے زیادہ، اور اللہ کے فضل سے ذہانت بھی آپ سب میں ہوگی، یا بہت سوں میں ہوگی، لیکن محنت کی بہرحال ضرورت ہے، محنت کیجیے پھر آپ ہی میں سے بڑے عالم، فقیہ، محدث مفسر نکلیں گے، خاندان کا نام اور مدرسہ کا نام روشن کریں گے، اور اخلاق پیدا کیجیے، راستہ میں بھی آپ کے اخلاق سے ظاہر ہو کہ ہاں دیکھو، دینی مدرسے کے طالب علم ایسے ہوتے ہیں، کسی کو چھیڑتے نہیں، اگر تنگ راستہ ہے تو انتظار کرتے ہیں کہ پہلے بڑی عمر کے جو ہیں، وہ نکل جائیں اور مدد کے لیے تیار رہتے ہیں، کوئی گر گیا یا کسی کی چیز گر گئی، اسی طریقے سے راستے سے گزریں تو راستہ شہادت دے کہ ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے، اور راستے میں دائیں بائیں بسنے والے کہیں کہ دینی مدرسے میں پڑھنے والے طالب علم ایسے ہوتے ہیں، بس یہ چند باتیں عرض کر رہا ہوں، اور ان شاء اللہ زندگی ہے تو پھر سنیے گا، خدا تعالیٰ آپ کو توفیق دے کہ آپ محنت سے پڑھیں۔ (۱)

---

(۱) مدرسہ عالیہ عرفانیہ، چوک (لکھنؤ) میں ۱۶/ جولائی ۱۹۸۶ء کو کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/ اگست ۱۹۸۶ء)۔

علم کی اشاعت ایک دینی ذمہ داری

جہاں تک طلبہ کا تعلق ہے، تو ان سے بھی یہ کہنا چاہیے کہ وہ اسلام کا داعی بننے کی کوشش کریں، علم راسخ، ایمان قوی، اور وسیع علمی صلاحیت کے حامل ہوں، کہ اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، یہ بارہا کہہ چکا ہوں اور لکھ چکا ہوں کہ جب پہلی وحی نازل ہوئی اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے قلم جیسی حقیر لکڑی کو فراموش نہیں کیا، بڑے بڑے درخت تھے، خود کھجور کے درخت، شجر طوبیٰ سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی میں قلم کا ذکر کیا، أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ [1] جس وقت یہ وحی نازل ہوئی تو اس وقت فرشتوں نے بھی سمجھ لیا ہوگا کہ اب اسلام اور علم کا ساتھ چھوٹنے والا نہیں ہے، اسلام جہاں ہے وہاں علم ہے، اور جہاں علم صحیح ہے وہاں اسلام ہے۔

قرآن نے علم کے حدود ختم کر دیے

حضرات! یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ایسے ملک اور ایسی سرزمین میں جو امیوں کی سرزمین ہے، لیکن ان سب کے باوجود اس پہلی وحی میں قلم کا ذکر ہے، علم کا بھی ذکر ہے، پہلی وحی میں ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ مَا لَمْ يَعْلَمْ میں علم کے حدود ختم کر دیے، یعنی اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ علم یہاں تک وہاں تک ہے، ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ

(۱) سورۃ العلق: ۱ - ۵

یَعْلَمْ﴾ ''انسان کو سکھایا اللہ نے ہر وہ چیز جو وہ نہیں جانتا تھا'' اس میں علم ریاضیات بھی آ گیا، اس میں علم الافلاک آ گیا، اس میں علم طب آ گیا، اس میں علم ہندسہ آ گیا، اس میں قیامت تک جو کچھ بھی انکشافات ہوں، اور علم جتنی ترقی کرے، سب اس میں آ گیا۔

جیسے مسجدیں ضروری ہیں ویسے مدرسے بھی ضروری ہیں

تو اب اسلام اور مسلمانوں کی کوئی تعداد ہو، مسلمانوں کا کوئی فرد ہو، وہ علم سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا، نہ علم سے استغناء برتا جا سکتا ہے، جیسے مسجدیں ضروری ہیں ویسے سمجھو کہ مسلمانوں کے لیے مدرسے بھی ضروری ہیں، اس لیے کہ جب اللہ نے اپنا کلام عقیدہ کے ساتھ، توحید کے ساتھ، اپنی معرفت کے ساتھ بھیجا، وہاں صرف علم ہی نہیں، علم کے ساتھ تعلیم ہی نہیں بلکہ تعلیم کے ساتھ تعلم کا بھی رشتہ قائم کیا، یعنی اس علم کو متعدی ہونا چاہیے، اگر تعلم ہوتا تو ایک لازمی چیز تھی لیکن ﴿عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ ''انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہیں تھا'' اس میں سلسلہ دراز بھی ہو گیا، اور ذمہ داری بھی عائد ہوئی، جو جانتے ہیں، وہ ان کو بتائیں کہ جو نہیں جانتے۔

عالم کو معلم ہونا چاہیے

اور ہمارے طلبہ جو یہاں زیر تعلیم ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ معلم اور داعی بن کر نکلیں، عالم کو معلم ہونا چاہیے، جس کے متعلق حضور (ﷺ) نے فرمایا: 'إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً'، (۱) ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''، نائبین انبیاء کو بھی معلم ہونا چاہیے، اور یہ علم ''إن الأَنبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَ لَا دِرْهَمًا وَ لَكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ ''(۲) حضور (ﷺ) نے فرمایا کہ انبیاء (علیہم السلام) نے درہم و دینار کے وارث نہیں بنائے، وَ لَكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ، لیکن انھوں نے وارث بنایا علم کو، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ، جس کو یہ ملا وہ بڑا قسمت والا

(۱) ابن ماجه، کتاب المقدمة، باب فضل العلماء و الحث على طلب العلم، رقم:۲۲۹

(۲) أبو داود، كتاب العلم، باب في فضل العلم، رقم:٣٦٤١

ہے، قسمت کا دھنی ہے، تو اس لیے ہمارے طلبہ کو سمجھنا چاہیے کہ اس وقت وہ متعلم ہیں، لیکن کل وہ معلم ہوں گے، اس وقت وہ سیکھنے والے ہیں، لیکن کل وہ داعی ہوں گے، اور مسلمانوں کو روحانی و علمی غذا پہنچانے والے ہوں گے، وہ مسائل اور احکام میں فتوی دیں گے، وہ ان کی نمازوں کو درست کریں گے، ان کو اصلاح معاشرہ کا پیغام دیں گے، شریعت کے متعلق زندگی گزارنے، نکاح و طلاق اور حقوق والدین اور حقوق الزوجین اور ذوی الارحام کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کریں گے۔

ہمارے طلبہ کی ذمہ داریاں

اور یہ جو اس وقت ہمارا معاشرہ فاسد ہو گیا ہے، اور دولت کی لالچ اور دولت کی طمع نے اس کو اتنا متعفن بنا دیا ہے کہ انسانوں کی جانیں جن کو بڑے ارمان اور بڑے لاڈ و پیار سے پروان چڑھایا تھا، ہم اپنے گھروں میں ان کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر رہے ہیں، جلا رہے ہیں، جو اس ملک کی بڑی نحوست ہے، بلکہ لعنت کہنا چاہیے، جس کا کہیں اور دنیا میں کہیں وجود نہیں، اس سب کا مقابلہ کریں گے۔

اسی طریقہ سے مسلمانوں کے جو عائلی قانون ہیں، پرسنل لاء کہتے ہیں، اس میں رسوخ پیدا کریں گے تاکہ وہ دوسروں کو سمجھا سکیں، بڑے بڑے قانون دانوں کو بتا سکیں کہ اسلام نے عورت کو جو مرتبہ دیا ہے، اور عورت کے جن حقوق کا تحفظ کیا ہے، اور اس کی عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کی جو ضمانتیں دی ہیں، اور اس کے جو انتظامات اس نے کیے ہیں، اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی، اس کے لیے طلبہ کو چاہیے کہ وہ زیادہ مطالعہ و محنت کریں، پھر اس کے بعد وہ اس بارے میں صاحب حمیت ہوں گے، یعنی وہ اس پر آنچ نہیں آنے دیں گے، اور کس نقطہ کو بھی اگر مٹانے کی کوشش کی جائے گی، یا مسلمانوں کو اس کی نورانیت سے محروم کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو یہ سینہ سپر ہو جائیں گے، اس مقصد کے لیے ہندوستان کی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تنظیم ہے، اس سلسلہ میں اس نے کچھ کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے توفیق دی، ہمیں اس توفیق الٰہی سے ایک کامیابی ہوئی، ہمارے طلبہ اس

کو سمجھیں گے، اصلاح معاشرہ کا پیغام دیں گے، اصلاح اخلاق ومعاملات کی بھی ضرورت ہے، مسلمانوں کے اخلاق ومعاملات بہت بگڑ رہے ہیں، اس کو بھی درست کرنے کی کوشش کریں گے، معاملات بھی ٹھیک ہوں، اخلاق بھی صحیح ہوں، وہ شیریں گفتار ہوں اور میانہ رفتار ہوں اور وہ دوسروں کے لیے نمونہ بنیں، شہری زندگی میں بھی نمونہ بنیں، یعنی وہ ایسا نمونہ بنیں کہ لوگ دور سے انھیں دیکھ کر کہیں کہ مسلمان ایسا ہوتا ہے، دور سے اس کی روشنی آتی ہے، وہ چمکتا ہے، جس طریقے سے پتھروں میں ہیرا چمکتا ہے، اسی طرح مسلمان دوسری قوموں میں چمکتا ہے، یہ سب ان کی ذمہ داریاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اساتذہ کو ان طلبہ پر اپنی پوری صلاحیتیں، توانائیاں اور جو ہر صرف کر دینے کی توفیق عطا فرمائے، اور قرب وجوار کے لوگوں کو اس کی قدر کی توفیق عطا فرمائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قدر وشکر پر نعمت کو قائم رکھتا ہے، اور نعمت میں اضافہ فرماتا ہے۔[1]

---

(۱) جامعہ اسلامیہ (بھٹکل) میں ۱۹۸۸ء میں کی گئی ایک تقریر سے ماخوذ، ماخوذ از ''ملت اسلامیہ کا مقام وپیغام'' (صفحہ ۱۶۲-۱۶۵)۔

علوم دینیہ میں اخلاص واختصاص کی اہمیت

میرے عزیزو! ایک ہی علمی ودینی وفکری خاندان کے فرزندو اور ذمہ دارو! اس موقع پر مجھے بے اختیار عربی کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو حسب حال ہے، شاعر کہتا ہے۔

قَالُوا خُرَاسَانُ أَقْصىَ مَا يُرَادُ بِنَا
ثُمَّ الْقُفُوْلُ، فَقَدْ جِئْنَا خُرَاسَانَا

شاعر کہتا ہے کہ ہمیں جن سے تعلق تھا، انھوں نے کہا: تم ہمارے یہاں کہاں اور کب آسکو گے؟ ہم خراسان میں رہتے ہیں، تم کہاں رہتے ہو، خراسان بہت دور ہے، دنیا کے آخری سرے پر واقع ہے، پھر واپس جانے کا بھی مسئلہ ہے، تو میں نے کہا: لیجیے ہم خراسان آگئے۔

یہ نیپال کی سرزمین یوں تو اپنی جغرافیائی حیثیت سے اور وسائل کے لحاظ سے کوئی ایسے کوہ قاف پر نہیں واقع ہے، لیکن اپنی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے میرے لیے اس وقت یہاں کا سفر کرنا بہت مشکل تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات مقدر تھی اور اس کا وقت مقرر تھا کہ میں یہاں آؤں۔

مجھے بہت خوشی ہے، میں آپ سے بلا تکلف کہتا ہوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ واساتذہ سے خطاب کررہا ہوں، ایک ہی خاندان ہے، اور جہاں تک آپ کا اور ہمارے یہاں کے رہنے والے مسلمان بھائیوں کا تعلق ہے، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں لکھنؤ میں کھڑا ہوں، یا رائے بریلی اپنے وطن میں ہوں، اور ان سے خطاب کررہا ہوں، مجھے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

تفصیل کے ساتھ خطبۂ استقبالیہ میں یہاں کے حالات پیش کیے گئے ہیں، وہ تفصیل بہت دل کشا ہے، اس کا تقاضا تھا اور ہے کہ میں بھی تفصیل کے ساتھ جواب دوں، لیکن میں

اس وقت اس حال میں نہیں ہوں، میں آپ کے سامنے چند ضروری باتیں رکھتا ہوں۔

آپ کسی ایک فن میں امتیاز پیدا کریں

پہلی بات تو مجھے اپنے طلبہ سے کہنی ہے، دیکھیے دنیا میں ہمیشہ سے، جب سے کہ دنیا قائم ہے، اور دنیا کی جتنی تاریخ ہمارے سامنے محفوظ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں آدمی کی محنت اپنا رنگ دکھاتی ہے، اور کمال نے اپنی قیمت وصول کر لی ہے، اس میں نہ کسی زمانہ کی خصوصیت ہے، اور نہ کسی ملک کی خصوصیت ہے، نہ کسی نسل ونسب کی خصوصیت ہے، نہ خاندان برادری کی، نہ کسی جغرافیائی اختلاف کی، جس طریقہ سے خوشبو پھیلتی ہے، تو وہ اپنا وجود منوا لیتی ہے، پھولوں کا حسن ہے، باغ کی رعنائی اور اس کی دل کشی ہے، ستاروں کی چمک ہے، سورج کی روشنی ہے، چاند کا حسن و جمال ہے، یہ سب چیزیں خود اپنی قیمت وصول کر لیتی ہیں، اور اپنے وجود کو منوا لیتی ہیں، اس کے لیے کسی سند کی بھی حقیقت میں ضرورت نہیں، میں اپنے طالب علموں سے کہوں گا کہ آپ محنت کریں، یوں تو سب میں آپ کو درک ہونا چاہیے، اور استعداد ہونی چاہیے، لیکن کسی ایک فن کو آپ اپنا موضوع بنا لیں، اس میں امتیاز پیدا کریں، اگر آپ نے یہاں امتیاز پیدا کیا، تو آپ یقین جانیے کہ اس کی رسید کی آواز بلاد عربیہ سے آئے گی، آپ کے سامنے اس کی مثالیں ہیں، میں نام نہیں لوں گا، اور اگر اس میں اپنی خود ستائی نہیں تو اپنے خانوادہ کی، یا اپنے علمی مرکز دار العلوم ندوۃ العلماء کی تعریف نکلے گی، جو اپنی ہی تعریف ہوتی ہے، یہ سنت الٰہی ہے: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا﴾ (۱) اتنی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے، کسی قسم کا تغیر نہیں پاؤ گے، پہلے کہا: تبدیلا، پھر کہا: تحویلا، کوئی اس میں تبدیلی، کچھ الٹ پھیر نہیں پاؤ گے۔

اخلاص واختصاص کی اہمیت

ایک بات تو آپ سے کہتا ہوں، جو میں بڑے بڑے چوٹی کے مدرسوں میں کہتا رہا

(۱) سورۃ فاطر: ۴۳

ہوں کہ آپ کسی فن میں امتیاز پیدا کریں، اوراس میں ایک جملہ جو میری زبان سے اکثر نکلا ہے،اوراس کو میں نے وظیفہ کےطور پر یاد کر رکھا ہے، وہ یہ کہ آپ اخلاص واختصاص پیدا کریں، جہاں تک اللہ کا معاملہ ہےاس میں خلوص ہو،اس میں اللہ کی رضا کی نیت ہو،اللہ کی رضا کی طلب ہو کہ اللہ ہم سے راضی ہو، ہم قرآن وحدیث پڑھ رہے ہیں، ہم فقہ کی تعلیم حاصل کرر ہے ہیں، تا کہ ہم اللہ کو پہچانیں، اوراس کے رسول (ﷺ) کو جانیں، اوراس کے کلام کو سمجھیں،اوردوسروں کو سمجھائیں،اوراس کے مطابق عمل کریں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اخلاص ہو، دوسری بات یہ کہ اختصاص ہو، یعنی کسی ایک فن میں دوسروں کے مقابلہ میں امتیاز حاصل ہو، اس کی طرف انگلیاں اٹھیں، جو اہل کمال ہیں، پہچاننے والے ہیں، وہ کہیں کہ یہ اس فن میں بہت بڑھا ہوا ہے،سیکڑوں سے بڑھا ہوا ہے، ایک طرف تو طالب علموں سے یہ کہوں گا کہ ''اخلاص واختصاص'' پیدا کریں،اوراپنی نیت صحیح کریں،صرف اللہ کی رضا کی نیت ہو، باقی چیزیں خودبخود پیدا ہوں گی، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قانون ہے،وہ خودبخود حاصل ہوں گی۔

اوردوسرے یہ کہ کسی خاص فن میں، کسی ایک چیز میں،کم سے کم ایک چیز میں (اوراللہ توفیق اور ہمت دےتو اس سے زیادہ میں) اختصاص یعنی امتیاز ہو، یقیناً زمانہ بہت بدل گیا ہے، لیکن اس بارے میں کچھ نہیں بدلا، آج بھی جن لوگوں نے کوئی امتیاز پیدا کرلیا ہے، انھوں نے اپنا امتیاز منوالیا ہے، دشمنوں تک سے منوالیا ہے، تسلیم کروالیا ہے، گردنیں جھک گئی ہیں،اورلوگ ان کے قدموں پر پڑتے ہیں، ان کی خوشامدیں کرتے ہیں،ان کو سر پر بٹھا کرآنکھوں میں جگہ دے کر لے جانا چاہتے ہیں،ایک بات تو یہ ہے،اس میں نہ تو نیپال کی خصوصیت ہے، نہ برما کی کوئی خصوصیت ہے،آج ہم لوگوں کے نام پڑھتے ہیں،ان کے نام کے ساتھ نسبتیں دیکھتے ہیں، آج اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو نہیں معلوم کہ صاحب ''ہدایہ'' مرغینانی کہاں کے رہنے والے ہیں،کوئی تبریزی ہیں،اورکوئی زمخشری ہیں،کوئی سکاکی ہیں، اب جغرافیہ میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوگئی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے،تو یہ نیپال کی یا ہندوستان کی یا کسی صوبہ کی کوئی خصوصیت نہیں،آپ کمال پیدا کریں گےتو ساری دنیا،کم سے کم عالم اسلام آپ کے کمال کو مان لے گا،اوراگرآپ کہیں چھپ کر رہنا چاہیں

گے تو آپ کو کوئی چھپنے دے گا نہیں، آپ ہزار پردے میں بیٹھیں، آئیں گے لوگ اور پردے اٹھا کر اور کسی طرح آپ تک پہنچ کر آپ کو اٹھا لیں گے، گود میں اٹھا لیں گے، اور آپ کو سر پر اٹھا کر لے جائیں گے، وہ خوشامدیں کریں گے، آپ کے پاؤں پر ٹوپی ڈال دیں گے، آپ ہمارے مدرسہ چلیے! آپ ہمارے کالج چلیے! ہماری یونیورسٹی چلیے! یہ فن پڑھائیے!

اپنے طالب علموں سے تو یہ کہتا ہوں کہ اخلاص و اختصاص پیدا کریں، اللہ کے معاملہ میں اخلاص، کوئی نیت نہیں، نہ کمانے کی، نہ کھانے کی، یہ اِتنی بڑی تنخواہ، اُتنی بڑی تنخواہ، اور فن کے لحاظ سے (علم کا جہاں تک معاملہ ہے) اختصاص ہو، اس لیے کہ بغیر اختصاص اور بغیر امتیاز کے کوئی چیز نمایاں نہیں ہوتی، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کا قول ہے: "قِيمَةُ كُلِّ امْرِئٍ مَا يُحْسِنُهُ" (ہر شخص کی قیمت وہ ہے جس کام کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر انجام دے سکتا ہے) طالب علموں سے یہ کہوں گا کہ تم محنت کرو، تمہاری یہ محنت تمہیں چمکائے گی اور دور تک لے جائے گی، کہاں کا ندوہ؟ کہاں کا دارالعلوم دیوبند؟ اور کہاں کا جامع ازہر؟ تم چمکو گے اور اس میں نیپال کا ہونا، اتنی دور ہونا، اتنا مشکل اتنا لمبا راستہ ہونا، کوئی چیز حائل نہیں ہوگی، جو لوگ صاحب کمال تھے، ان کو لوگ کہاں کہاں سے لائے، اور ان کو کیسی جگہ دی؟

طالب علموں سے کہتا ہوں کہ شکر کریں اللہ کا، اللہ تعالیٰ نے ایسی دور افتادہ جگہ میں دینی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، میں آپ سے صاف کہتا ہوں، نیپال کا تعارف صرف فوجی سپاہیوں، پہرے داروں کی وجہ سے تھا، میں آپ سے صفائی کے ساتھ کہتا ہوں، بہت پڑھتا لکھتا ہوں، دنیا میں پھرا ہوں کہ میں نیپال کو گورکھوں کی وجہ سے جانتا ہوں، نیپال وہ جگہ ہے جو بڑے مضبوط فوجی دیتا ہے، بہت امانت دار، بڑے جفاکش پہرے دار دیتا ہے، جس کو بڑے بڑے رئیس اور نواب لوگ اپنے دروازے پر بٹھاتے تھے، لیکن ابھی تک عالموں کی حیثیت سے نیپال کا تعارف نہیں ہوا تھا، لیکن اللہ جزائے خیر دے، اللہ قبول فرمائے کہ یہ دارالعلوم یہاں قائم ہوا، اور ندوی فضلاء کے اہتمام و انتظام میں چل رہا ہے، جن لوگوں کے نام لیے گئے، اللہ ان کے درجے بلند فرمائے، اس کی وجہ سے اب انشاء اللہ نیپال کا نام صرف گورکھوں کی وجہ سے اور پہرے داروں کی وجہ سے نہیں ہوگا، عالموں کی وجہ سے بھی ہوگا، اس معاملہ میں شہروں اور ملکوں کا فرق نہیں ہوتا، لکھنؤ، دلی، جونپور (جو شیراز ہند کہلاتا تھا)

بھوپال، ٹونک جو کبھی بڑے بڑے اہل کمال کا مرکز بن چکے ہیں، رام پور میں بڑے بڑے منطقی اور فلسفی تھے، اور سنسری کا یہ علاقہ اور آپ کا یہ جلپا پور (نیپال) میں کوئی فرق نہیں ہوگا، یہ اللہ تبارک وتعالی کے یہاں سنت الٰہی ہے کہ اعتراف کمال میں ناموں کا، فاصلوں کا اور ان کی سابقہ روایات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ تو طالب علموں سے کہتا ہوں، آپ اپنے درجہ میں بھی ممتاز ہوں گے، اور نگاہیں اٹھیں گی، انگلیاں اٹھیں گی، دیکھو یہ نیپال کے طالب علم ہیں، یہ صرف ونحو میں ہمارے طالب علموں سے اچھے ہیں، اور یہ مطالعہ دیکھ کر آتے ہیں، اور بعد میں بھی پڑھتے ہیں، ان کی استعداد بھی بڑی اچھی ہے، اور یہ انشاء اللہ بڑی ترقی کریں گے، اس میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا ہے، امام غزالیؒ کو لیجیے، کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایران کے تھے، ان کے بزرگوں میں کوئی بڑے عالم بھی ہوئے ہیں، ان کے والد تک عالم نہیں تھے، اور غزالی کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ ان کا خاندان اُون کا کام کرنے والا تھا، ایک جلیل القدر بزرگ خواجہ نقشبند کہلاتے ہیں، ان کے یہاں نقاشی کا کام ہوتا تھا، کوئی بزرگ کچھ کہلاتے ہیں، تو اس سے آپ سمجھ لیجیے، اس کے علاوہ خصّاف یعنی جوتا گانٹھنے والے، زیّات یعنی تیل بیچنے والے، خیّاط کپڑا سینے والے جن کے پیچھے ہم نے بیسیوں نمازیں پڑھی ہوں گی، حرم شریف جو دنیا میں سب سے بڑھ کر عزت واحترام کی جگہ اور عبادت گاہ ہے، جہاں کی امامت سب سے فخر اور شَرَف کی بات سمجھی جاتی ہے، اور وہ بیت اللہ کہلاتا ہے، اس کے امام خیّاط تھے، وہ شیخ عبداللہ الخیاط ہندوستانی تھے، لیکن اپنے علم کی وجہ سے ان کو حرم کا امام بنایا گیا، اور ایسی کتنی مثالیں دے سکتا ہوں، بڑے بڑے مصنفین کے ساتھ کیا کیا لگا ہوا ہے، بعض تو حجار ہیں، یعنی پتھر توڑنے والے، ہم نے بھی ان کی زیارت کی ہے، قدوری ایک بہت بڑے فقیہ ہیں، جن کی کتاب فقہ کے ضروری نصاب میں داخل ہے، شروع میں وہ قدوری تھے، یعنی ہانڈیاں بناتے تھے مٹی کی، اور قدوری کہلاتے تھے، انھوں نے کتاب لکھی اور وہ کتاب مقبول ہوئی، اس کتاب نے منوالیا اپنے کو، اور مصنف کو بھی، طالب علموں سے یہ بات مختصر کہتا ہوں کہ آپ محنت کیجیے اور اخلاص واختصاص پیدا کیجیے، آپ بھی چمکیں گے، اور اپنے ملک کو بھی چمکائیں گے، اور آپ کی روشنی دور دور تک پھیلے گی۔

اپنے اخلاق سے برادرانِ وطن کے دل جیتیے

اب ہم اپنے ان بھائیوں سے جو مدرسہ سے طالب علمی کا تعلق نہیں رکھتے، اپنے دینی جذبہ اور دین کے شوق میں آئے ہیں، کہتا ہوں کہ آپ ایسے ملک میں ہیں کہ اگر آپ اس ملک کے رہنے والوں کے دل جیت لیں، اور ان کو اسلام کی طرف مائل کرلیں، اور ان کے دلوں میں ایمان کا بیج ڈال دیں، تو آپ نہ صرف اسلام کی بلکہ انسانیت کی خدمت کریں گے، کیونکہ یہ ملک اسلام سے ناآشنا رہا ہے، ابھی ہمارے عزیز بھائی نے جو اس ملک پر ایک تاریخی روشنی ڈالی ہے، یہاں کیسے کیسے لوگ ہوئے ہیں، ان میں رام جی کا نام آیا ہے، اور بودھ جی کا نام آیا، اور لچھمن جی کا نام آیا ہے، لیکن یہاں کسی سیدنا جیلانی کا نام نہیں آیا، خیر اُن کا ہونا آسان کام نہیں، کسی بزرگ کا اور کسی مرشد کا، کسی فقیہ کا اور کسی مفسر کا نام نہیں آیا، تو آپ یہ کوشش کریں کہ آپ اپنے اخلاق اور اپنے کیرکٹر سے زندگی کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ یہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں، اور وہ اسلام کا مطالعہ کریں، اور آئیں مدرسوں میں کہ ہمیں آپ بتائیے کہ اسلام کی کیا خصوصیات اور کیا تعلیمات ہیں؟ نیپالی زبان میں ہو، انگریزی میں ہو، یا ہندی میں، ہم سمجھیں کہ کیا بات ہے کہ لوگ اتنے مختلف ہیں۔

ایک ایمان افروز واقعہ

میں نے آکسفورڈ میں (جو انگلستان کا بہت بڑا علمی و تعلیمی مرکز ہے) تقریر کی، وہاں کے لوگوں کے سامنے ہندوستان کا ایک واقعہ بیان کیا کہ جب ہندوستان کے مجاہدین نے پشاور فتح کیا، اور اس میں کئی ہفتے ممکن ہے کئی مہینے گزر گئے، وہاں ایک دن ایک پٹھان نے ایک ہندوستانی کا ہاتھ پکڑا (اودھ کا یا کہیں کا رہنے والا ہوگا) اور کہنے لگا: میاں! ایک بات پوچھتا ہوں، صحیح صحیح جواب دینا، کیا تم ہندوستانیوں کی دور کی نظر کچھ خراب ہوتی ہے، کمزور ہوتی ہے، دور کی چیز تم دیکھ نہیں سکتے؟ اس نے کہا کہ نہیں، ہم خوب دیکھتے ہیں، کہا: نہیں! کوئی بات ہے ضرور، ہندوستانیوں کی دور کی نظر کمزور ہے، اس ہندوستانی نے کہا: یہ تو آپ بتلائیے کہ آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ بات تو ہر ایک پوچھتا نہیں، یہ کوئی

ایسی پوچھنے والی بات بھی نہیں ہے، آپ پوچھ کیوں رہے ہیں؟ ہم بھی اتنا ہی دیکھتے ہیں جتنا آپ دیکھتے ہیں، مگر آپ پوچھ کیوں رہے ہیں؟

پٹھان نے کہا کہ پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ مہینوں سے گھر سے نکلے ہوئے ہو، اپنے گھر بار کو، بیوی بچوں کو چھوڑے ہوئے ہو، اور تندرست ہو، ماشاء اللہ شکیل ہو، ہم نے تم میں سے کسی کو کسی نامحرم عورت کو دور سے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا، تمہاری نگاہیں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں، ایک آدمی کا معاملہ ہو تو آسان ہے، سارے کے سارے کیوں نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے عورتوں کو اور لڑکیوں کو، لوگ جانتے ہیں کہ پشاور میں، صوبۂ سرحد میں خوبصورتی زیادہ ہے، یعنی وہاں کچھ ایسی کشش بھی ہے کہ آدمی دیکھے اور اس کے اندر اس کا خیال پیدا ہو، شوق پیدا ہو، تو ہم نے سوچا کہ دو چار زاہد ہو سکتے ہیں، عابد ہو سکتے ہیں، بڑے محتاط، متقی ہو سکتے ہیں، لیکن فوج میں تو لوگ عام طور پر زاہد نہیں ہوتے، جوان ہوتے ہیں، ہٹے کٹے ہوتے ہیں، ہٹے کٹے لوگ پھر اپنے گھر سے دور، کوئی اپنی بیوی سے دور، دو برس سے ملا نہیں، کوئی چار برس سے ملا نہیں، کوئی چھ مہینے سے نہیں ملا، اور جوان بھی ہیں، کبھی تو یہ نظر اٹھا کر دیکھتے کہ یہاں کی عورتیں کیسی ہوتی ہیں، دیکھنے ہی سے کچھ اپنی تسکین کر لیتے، لطف لیتے، تو ہم سمجھے کہ یہ کوئی تقوی اور زہد کی بات نہیں، بلکہ اُن کی دور کی نظر ہی نہیں!!

ہندوستانی نے جواب دیا کہ نہیں، الحمد للہ ہماری دور کی نظر خوب کام کرتی ہے، ہم دور کی چیز صاف دیکھتے ہیں، لیکن یہ ہمارے امام کی تربیت کا نتیجہ ہے، قرآن مجید کی آیت پر عمل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾ [1]۔ (اہل ایمان سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، عفت وطہارت کے ساتھ رہیں)۔

سننے والوں کو بڑا تعجب ہوا، ہم نے وہاں ہندستان کے لوگوں سے کہا کہ آپ یہ نمونہ دکھائیں، لوگوں کو یہ شوق پیدا ہو کہ یہ چیز کہاں سے آئی؟ یہ لوگ گھر چھوڑے ہوئے اتنے دنوں سے یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، کوئی بی. اے. میں پڑھ رہا ہے، کوئی بی. ایس. سی.

---

(١) سورة النور: ٣٠

میں پڑھ رہا ہے، کوئی ایم.ایس.سی. میں پڑھ رہا ہے، کسی کو چار برس ہوئے، کسی کو چھ برس ہوئے، اور یہاں بہت خرچ ہوتا ہے ہندوستان جانے میں، اوران میں سے اکثر کی شادی نہیں ہوئی، اور یہاں کی لیڈیز اپنی خوبصورتی میں مشہور ہیں، ساری دنیا میں اورخود ہندوستان میں لوگ بڑی للچائی ہوئی، بڑے شوق کی نگاہوں سے ان کو دیکھتے تھے، یہاں کیوں نہیں دیکھتے؟ ان کے اندر یہ سوال پیدا ہو، اور پھر وہ سمجھیں کہ یہ اسلام کا فیض ہے، یہ اسلام کی تربیت کا فیض ہے۔

اپنا امتیاز ثابت کریں

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک بات تو یہ ہے کہ آپ اسی شہر میں چلیں پھریں، دکانیں کریں، ملازمت کریں، ملیں جلیں، اور دور رہنے کی ضرورت نہیں، لیکن آپ اپنا امتیاز ثابت کر دیں، نیپال کی اس سرزمین پر سوال پیدا ہو کہ یہ کون سے لوگ ہیں؟ یہ کوئی بے احتیاطی نہیں کرتے، یہ کسی غیر محرم کو نہیں دیکھتے، اُن کا ہاتھ کسی چیز پر اٹھتا نہیں چوری کے لیے، یہ جھوٹ نہیں بولتے، یہ وہ ہیں کہ اگر ملازمت کرتے ہیں تو بڑی دیانت داری اور وفاداری کے ساتھ کرتے ہیں، پھر یہ گرے پڑے لوگوں کو سہارا دیتے ہیں، یہ غریبوں اور کمزوروں پر زیادتی نہیں کرتے، یہ کیرکٹر آپ کو دکھانا چاہیے۔

مجھے امید نہیں کہ اس کے بعد آپ سے ملنے اور کہنے سننے کا موقع ملے گا، اور ملے گا تو کب ملے گا؟ ہم آپ پھر جمع ہوں گے یا نہیں ہوں گے؟ اس لیے میں یہ دو تین باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، ایک بات تو یہ کہ آپ اپنی زندگی کا نقشہ، اپنی زندگی کا طرز ایسا بنائیں کہ لوگوں کے اندر سوال پیدا ہو، تجسس پیدا ہو کہ بھئی! پوچھنا چاہیے کہ یہ بات ان میں کہاں سے آئی؟ یہی بات تھی جس کی وجہ سے انڈونیشیا مسلمان ہوگیا، پورا کا پورا ملک مسلمان ہوگیا، مؤرخین کہتے ہیں کہ وہاں کبھی کوئی اسلامی فوج نہیں پہنچی، یہ بات مانی ہوئی ہے تاریخی طور پر، لیکن پورا کا پورا ملک پہلے سو فی صدی مسلمان تھا، اب وہاں کچھ شامت اعمال سے، کچھ حکومتوں کی خرابی سے، کچھ امریکہ اور برطانیہ کی سازش سے کہیں کہیں عیسائیت پھیل رہی ہے۔

ایک بات تو یہ کہ آپ اپنے اخلاق سے، اپنی ایمانداری سے، اپنی سچائی سے، اپنی شرافت سے ثابت کریں کہ آپ کوئی اور نمونہ، کوئی اور ماڈل ہیں، کوئی اور چیز ہیں۔

مدارس و مکاتب قائم کیجیے

دوسری بات یہ کہ مکاتب اور مدرسے قائم کیجیے، کوئی بستی کوئی گاؤں ایسا نہ ہو جہاں کوئی مکتب اور مدرسہ نہ ہو، جہاں دینی تعلیم نہ دی جائے، اور عورتوں تک کو گھر میں، خواتین کو، مستورات کو اپنے گھر میں، بیٹیوں اور بچیوں کو بھی دین کی تعلیم دیجیے، اور ان کو تاکید کیجیے کہ اپنے بچوں کو بھی تعلیم دیں، پیغمبروں کے قصے سنائیں، توحید کی محبت پیدا کریں، شرک سے نفرت دلائیں، بد اخلاقیوں سے نفرت پیدا کریں، دلوں میں حضور (ﷺ) سے عشق اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا کریں، جب جا کر یہاں ایمان محفوظ رہے گا نئی نسل کا، ورنہ کوئی ٹھکانا نہیں، کوئی بھروسہ نہیں اس کا۔

تیسری بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ہندوستان میں یہ آفت آئی ہوئی ہے، کل ہی بھاگلپور میں بڑا جلسہ ہوا، ہزاروں آدمی تھے، وہاں میری تقریر ہوئی اور بڑے بڑے علماء کی تقریریں ہوئیں، اس سے پہلے مونگیر میں بڑا جلسہ ہوا، ہزاروں ہزار آدمی تھے، کرناٹک سے اور آندھرا پردیس سے، اور کہاں کہاں سے علماء آئے، وہاں ایک مصیبت ہے، شادیوں میں فضول خرچی اور دھوم دھام اور نمائش کی، اور سخت درجہ کے اسراف فضول خرچی کی، بڑی بڑی باراتیں لے جانا، اور بڑے کھانوں کا اہتمام۔

اور پھر وہاں ایک اور مصیبت آئی ہوئی ہے، بلکہ خدا کا ایک عذاب آیا ہوا ہے کہ لڑکی والوں سے فرمائش کی جاتی ہے کہ لڑکی کو اتنا جہیز دیا جائے، موٹر دیا جائے، اور وہ موٹر لے کر آئے، اور اتنی رقم لے کر آئے جب ہم اپنے لڑکے سے شادی کریں گے، نہیں تو نہیں کریں گے، خدا کرے آپ کے یہاں یہ نہ ہو۔

دین کی قدر کریں

آخر میں یہ کہ آپ اپنے دین کی قدر کریں، اس کو سب سے بڑی نعمت سمجھیں، نمازوں

کی پابندی کریں، اور کلمہ کے معنی سمجھیں، قرآن مجید کی کچھ سورتیں آپ کو یاد ہونی چاہئیں، ان کے معنی مطلب بھی اگر آپ سمجھ سکیں، یاد کر سکیں تو یاد کریں، اور دین کی ضروری معلومات حاصل کرنے کا آپ کو شوق ہو، آپ مدرسوں میں جائیں، اور پھر آپ گاؤں گاؤں میں مکتب مدرسہ قائم کریں، خلاصہ یہ کہ اپنے دین وایمان کی سب سے زیادہ فکر کریں، اور اللہ سے دعا کریں، کوشش کریں کہ اسلام پر قائم رہیں، ایمان پر خاتمہ ہو، قرآن شریف میں آتا ہے: ﴿ وَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾ [1] (دیکھو نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو) اس کی کوشش کریں، سب سے بڑی نعمت، سب سے بڑی دولت، سب سے بڑی خوش قسمتی، سب سے بڑی اقبال مندی اسلام کی دولت کا مل جانا، اور ایمان پر خاتمہ ہونا، اللہ کے رسول (ﷺ) کی شفاعت نصیب ہونا، اور آپ کے دست مبارک سے جام کوثر پینا، اور جنت کا مستحق قرار پانا ہے، اس کو سب سے بڑی دولت سمجھیں، اس کی پوری حفاظت کریں۔

مدارس دینیہ کے وجود کو غنیمت جانیں

میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی تقریر ختم کرتا ہوں، اور آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، اور آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان مدرسوں کی قدر کریں، کہ یہاں سے پڑھ کر یہ دوسروں ملکوں میں جاتے ہیں، اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، اور ماشاء اللہ یہ آپ کے ملک کا نام روشن کرتے ہیں، اور آپ کے ملک کی عزت بڑھاتے ہیں، آپ اس کی قدر کریں، اور ان مدرسوں کی ضروریات کی تکمیل کریں، یہاں تعمیرات کی ضرورت ہے، ابھی تعمیرات پوری نہیں ہوئیں، وہاں اس کی کوشش کریں جہاں ضرورت ہے، خرچ کر کے لڑکوں کو طالب علموں کو وظیفہ دیا جائے، ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا جائے، اس میں بھی آپ مدد کریں، اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑے ثواب کا کام ہے، اس کی قدر آپ کو قیامت میں معلوم ہوگی، آپ کی وجہ سے کوئی طالب علم علم دین حاصل کرے، اللہ ورسول کا نام ہی نہ سیکھے بلکہ اللہ و رسول کا نام سکھانے کی اس میں قابلیت پیدا ہو جائے، اس سے بڑا صدقۂ جاریہ کیا ہے؟

[1] سورۃ آل عمران:۱۰۲

انھیں چند باتوں پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں، ان کو گرہ میں باندھ لیں، اور ان پر عمل کرنے کوشش کریں۔

آخر میں ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اور اپنی اس مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے اس مرکز کو اپنی امید اور اپنے تصور سے زیادہ پایا، ہمیں بڑی خوشی ہوتی اگر ہمیں یہاں زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع ملتا، لیکن کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ ہم زیادہ وقت نہیں دے سکتے، مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم نے آ کر خود ہی کہا کہ ہم خطاب کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ ہماری حالت کا تقاضا یہ تھا کہ ہم کہتے: بھئی! کچھ بات نہیں کر سکیں گے، ہمیں تو سلا دینا لٹا دینا، ہم آرام کر لیں، اور کل صبح ہی ہمیں جانا ہے، لیکن آپ کی محبت کا، آپ کے خلوص کا اور ان بلانے والے بھائیوں کے خلوص کا اثر تھا کہ ہم نے خود ہی اپنی طرف سے کہا کہ اگر کوئی پروگرام ہو، یا آپ کر سکیں تو کیجیے، اپنے بھائیوں کو دیکھ لیں، کہاں پھر ہم دیکھنے کے لیے آئیں گے، یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ اپنے کلمہ گو بھائیوں کو، اپنے دینی بھائیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھیں، خوش ہوں، اور اللہ کا شکر ادا کریں، کچھ اللہ و رسول کے دین کی باتیں ہم ان سے کر لیں، سن بھی لیں، اللہ کا شکر ہے کہ یہ کام ہو گیا، بس اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرمائیں۔ "وما التوفيق إلا من عندالله"۔(۱)

---

(۱) ۳؍ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۵؍ مئی ۱۹۹۲ء کو دارالعلوم نورالاسلام، جلپاپور، ضلع سنسری (نیپال) میں ذمہ دارانانِ دارالعلوم، اساتذہ، طلبہ، واطراف وجوانب کے خواص وعوام کے ایک بڑے مجمع کے سامنے کی گئی تقریر، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۹۲ء)، یہ تقریر علاحدہ رسالہ کی شکل میں "نیپال میں طلبۂ علوم دینیہ اور عامۃ المسلمین سے خطاب" کے عنوان سے بھی شائع ہوئی۔)

تصحیح نیت اور رسوخ فی العلم

تصحیح نیت

میرے عزیزو! میں اس وقت آپ سے تفصیل سے بات نہیں کرسکتا، صرف تین باتیں کہتا ہوں، ایک بات تو یہ ہے کہ آپ علم دین حاصل کرنے آئے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے، ایک نصیحت کی بات تو یہ ہے کہ آپ اپنی نیت درست کریں، علم دین حاصل کرنے کی جو صحیح نیت ہے وہ تازہ کریں اور تازہ کرتے رہیں، تاکہ آپ کو، آپ کے سرپرستوں کو، اور آپ کے والدین کو اور مدرسہ کے بانی کو ثواب ملتا رہے، اور بہت سے کام ہم کرتے ہیں مشینری طریقہ پر، اس میں کوئی نیت نہیں ہوتی، اس کا استحضار نہیں ہوتا، تو اس کا ثواب نہیں ملتا۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آپ ابھی سے نیت کریں کہ اللہ کی خوشی کے لیے علم دین حاصل کر رہے ہیں، ہم کو اللہ تعالیٰ اس قابل بنائے کہ ہم اللہ کا منشا سمجھیں اور اس کے رسول (ﷺ) کا منشا سمجھیں اور اس کو دوسروں تک پہنچائیں، ورنہ آپ میں اور کسی نرسری اسکول کے طلبہ میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا، وہ بھی پڑھتے ہیں اور آپ بھی پڑھتے ہیں، وہ بھی محنت کرتے ہیں اور آپ بھی محنت کرتے ہیں، وہ انگریزی اور ہندی پڑھ رہے ہیں اور آپ عربی اور اردو پڑھ رہے ہیں، بس اتنا فرق رہ جائے گا، ایک بات تو یہ ہے کہ ذرا خیال کرلیا کیجیے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ اپنے گھر کو ہم نے کیوں چھوڑا ہے؟ یہاں کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ علم دین حاصل کرنے کی بڑی فضیلتیں آئی ہیں، حضور (ﷺ) ایک مرتبہ حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے تو ایک طرف اللہ کا ذکر ہورہا تھا، اللہ کی یاد ہورہی تھی، تسبیحات پڑھی جارہی تھیں، اور ایک طرف کچھ لوگ مسئلے مسائل سیکھ رہے تھے، پوچھ رہے تھے، مذاکرہ کررہے تھے، تو آپؐ

نکلے اور ان پر آپ نے شفقت کی نگاہ اور سرپرستانہ نگاہ ڈالی، قدر کی نگاہ ڈالی اور ان لوگوں کے پاس گئے جو مسائل سیکھ رہے تھے اور فرمایا: إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً [۱]، "میں معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں"، تو ایک تو یہ اس کو یاد رکھیں، پھر ملنا ہو یا نہ ہو زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔

تو آپ سے ایک بات کہتے ہیں کہ اپنی نیت درست اور صحیح کر لیجیے اور تازہ کر لیجیے کہ ہم اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے پڑھ رہے ہیں تا کہ علم دین حاصل ہو، اور اللہ نے جو زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا ہے اور اللہ کے رسول نے جو طریقہ سکھایا ہے، اس کو سیکھنے کے لیے پڑھ لیں، قرآن پڑھیں گے، حدیث پڑھیں گے، دوسروں تک پہنچائیں گے، اسلام اور کفر کا فرق، توحید اور شرک کا فرق، طاعت و معصیت کا فرق، سنت و بدعت کا فرق دوسروں کو ہم بتائیں گے۔

علم میں رسوخ

دوسری بات یہ ہے کہ صرف ونحو میں پختگی پیدا کیجیے، جو چیزیں آپ کو پڑھائی جائیں ان میں پختگی پیدا کیجیے، اس زمانہ میں بہت کچا پن آ رہا ہے، بڑے بڑے مدرسوں میں صرف ونحو میں ہی پختگی نہیں ہوتی، صحیح عبارت نہیں پڑھ سکتے، پوچھا جائے یہ منصوب کیوں ہے؟ مرفوع کیوں ہے؟ اس کو وہ نہیں بتا سکتے، اور بہت سے لوگ ہیں جن کی شہرت ہے لیکن وہ صحیح عبارت نہیں پڑھ سکتے، ہمیں تجربہ ہوا ہے بہت سی کانفرنسوں میں، بعض بڑی مجلسوں میں کہ جب ان کو عربی پڑھنے کا اتفاق ہوا اور وہ بہت بڑے محقق ہیں، بہت بڑے مفکر ہیں، لیکن جب عربی پڑھنے کا اتفاق ہوا اور اپنا ہی لکھا ہوا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا تو وہ تو پڑھ رہے ہیں لیکن ہم شرما رہے ہیں، تو بتائیے لوگ کیا کہیں گے؟ تو ہم تم سے کہہ رہے ہیں کہ صرف ونحو اور ادب میں پختگی پیدا کرو تا کہ تم بتا سکو منصوب کیوں پڑھا، اور مرفوع کیوں پڑھا، اور جو کچھ پڑھو پختگی سے پڑھو، اور علم میں رسوخ پیدا کرو، رسوخ فی العلم بہت بڑی چیز ہے، فقہ و حدیث میں رسوخ پیدا کرو۔

---

(۱) رواه ابن ماجه في سننه، كتاب السنة، باب فضل العلماء و الحث على طلب العلم، حديث رقم ۲۲۹

اپنے اندر سعادت مندی پیدا کرو

تیسری بات یہ کہ اپنے اندر سعادت مندی پیدا کرو، اساتذہ کا ادب و احترام کرو، کتاب اور علماء کا ادب کرو، درس گاہوں کا احترام کرو، اسلام میں ادب بڑی اہمیت کا حامل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (۱)، شاہ صاحبؒ کی تحقیق اور ان کے بیان کے مطابق شعائر کی تشریح کتاب اللہ، بیت اللہ اور نماز ہے، لیکن ان کے ساتھ اور ذیلی شعائر ہیں جو ان کا حامل ہو، جو ان کا خادم ہو، جس کی ان کی طرف نسبت ہو وہ سب بھی شعائر ہیں، تو ادب و احترام لازم سمجھو، اسکولوں اور کالجوں کی طرح نہیں کہ وہاں نہ کتاب کا ادب ہے، نہ استاد کا ادب ہے اور نہ ہی کسی سرپرست کا ادب ہے، تو اساتذۂ کرام کا، کتابوں کا، درس گاہوں کا حقیقی معنی میں ادب کرو اور اپنے اندر امتیاز پیدا کرو، علمی بھی اور عملی بھی، کہ تمہیں دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں دین کا احترام پیدا ہو اور دین کی طرف ان کا رجحان ہو۔

تو میرے عزیزو! نیت کی تصحیح کرو کہ ہم اللہ کو خوش کرنے کے لیے اور اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پڑھ رہے ہیں، اور تہذیب سیکھنے اور دوسروں کو تہذیب سکھانے کے لیے پڑھ رہے ہیں، بس اللہ آپ لوگوں کو علم و عمل سے نوازے، اور مدرسہ کو ترقی عطا فرمائے، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ (۱)

---

(۱) سورۃ الحج: ۳۲

(۲) جامعہ اسلامیہ (اعظم گڑھ) میں ۱۸/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا محمد نسیم الدین ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' لکھنؤ، (شمارہ ۲۵/جولائی ۱۹۹۲ء)۔

آدمی کی اصل قدر و قیمت اس کا کمال فن ہے

میرے بھائیو اور عزیزو! میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ مجھے ایک بار پھر آپ عزیزوں سے، بھائیوں سے خطاب کرنے کا موقع ملا، میں جب یہاں آتا ہوں تو مجھے محسوس نہیں ہوتا کہ میں کسی اجنبی جگہ گیا ہوں، یا کسی دوسرے حلقۂ خیال اور مکتب فکر میں ہوں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے دارالعلوم ہی کے طلبہ سے خطاب کر رہا ہوں، وقت تھوڑا ہے باتیں کہنے کی بہت ہیں، اور آپ کو سننے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے، میں چھوٹا سا جملہ آپ کے سامنے عربی کا دہرا کر تھوڑی سی اس پر روشنی ڈالوں گا، روشنی ڈالنا تو خیر بڑی چیز ہے، آپ کو متوجہ کروں گا کہ بہت سے جملے، کلمات ماثورہ اور بہت سے وصایا، توجیہات اور تجربے زندگی کے، وہ کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، اور ان پر نظر پڑتی رہتی ہے، اور ان کو لوگ زبان سے بھی دہراتے ہیں، تو پھر ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، ایک جملہ ہے بہت ہی مختصر لیکن بہت پُر از معانی ہے، اور بہت وسیع ہے، اور زندگی کے صرف ایک ہی موضوع پر منطبق نہیں، بلکہ پوری زندگی پر منطبق ہوتا ہے: "قِيمَةُ كُلِّ امْرِئٍ مَا يُحْسِنُهُ" ہر شخص کی اصلی قدر و قیمت یہ ہے کہ جس کام کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر جانتا اور کر سکتا ہو۔

اس وقت ہمارے مدارس میں خدا کے فضل و کرم سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نوجوان، لاکھوں طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، موجودہ نصاب پڑھایا جاتا ہے، مفید نصاب ہے وہ، تھوڑی ترمیم کے ساتھ اور تحفظ کے ساتھ، اور پڑھانے والے بھی خدا کے فضل سے ذی استعداد ہیں، مخلص ہیں، لیکن جو امتیاز پیدا ہونا چاہیے، کسی فن میں امتیاز خصوصی ہونا چاہیے، جس سے اس کی طرف انگلیاں اٹھیں اور اشارے کیے جائیں، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی قدر ہو، اور اس کی طلب ہو، اور اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری جد و جہد کی جائے اور وہ اپنے اپنے درجے

اور زمانے اور حالات کے مطابق ایک اچھے اور قابل ذکر حلقہ میں، مؤثر حلقہ میں کام کر سکے، اس کا بڑا فقدان ہے، اور بہت دن سے یہ کمی محسوس کی جا رہی ہے ہمارے علمی حلقوں میں، تدریسی حلقوں میں، تصنیفی حلقوں میں، اور تحقیقی حلقوں میں اور پھر تعلیم و تعلم کے حلقوں کا ذکر کیا ہے کہ سب کچھ پڑھا جاتا ہے، اور علم سے واقفیت پیدا کی جاتی ہے، لیکن وہ جس کو عربی زبان میں ''احسان'' کہتے ہیں، اس کا فقدان ہے، ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے، ایک ڈگری ہوتی ہے، اس کی حرارت اور برودت کا ایک ٹمپریچر ہوتا ہے، ایک ڈگری ہوتی ہے، جو لفظ اردو میں عربی کے مستعمل ہوں، ضروری نہیں کہ وہ عربی کے الفاظ کی طاقت کو پوری طرح منتقل کرسکیں، منتقل کرسکنا تو ان سے تعلق رکھتا ہے، لیکن سمجھا سکے اس کو، اور خاص طور سے جو چیزیں ایک زبان سے منتقل ہو کر دوسری زبان میں رائج ہوتی ہیں اور زبان زد عوام وخواص ہو جاتی ہیں، ان کا تو درجۂ حرارت اور درجۂ برودت اور ان کی ڈگری جو ہے، ان کا جو پوائنٹ ہے، وہ نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے، تو عربی میں جب کسی چیز میں کہتے ہیں کہ اس میں درجۂ کمال پیدا کیا جائے اور اس میں امتیاز پیدا کیا جائے تو اس کے لیے عربی میں "الإحسان" کا لفظ آتا ہے، یہاں تک کہ حدیث شریف میں بھی یہ لفظ بڑے خاص موقع پر آیا ہے، "مَاالْإِحْسَان؟" فرشتہ پوچھتا ہے کہ احسان کیا ہے؟ اور آپ (ﷺ) جواب دیتے ہیں کہ "اَلْـإِحْسَـانُ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ"۔ (۱)

عربی میں ''الإحسان'' کے معنی

''احسان'' کا لفظ اردو میں آ کر بہت ہی معمولی معنوں میں محدود ہو گیا ہے، کہ احسان یہ ہے کہ فقیر کو کچھ پیسے دے دیجیے، کسی کو کھانا کھلا دیجیے، کسی سے بات کر لیجیے، لیکن عربی میں وہ اب بھی، جو لوگ عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں اور خدا کے فضل سے یہاں ایسے حضرات موجود ہیں، میں نام نہیں لوں گا (۲) وہ سمجھتے ہیں کہ عربی کا ایک سادہ لفظ جو ہے، جو زبان زد

(۱) رواه البخاري، كتاب التفسير، سورة لقمان، باب قوله: إن الله عنده علم الساعة، رقم ٤٧٧٧

(۲) حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی حال ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، اور ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم سابق معتمد تعلیمات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

عوام وخواص ہو گیا ہے، وہ اپنے اندر اصل میں کیا طاقت رکھتا تھا، اور اہل زبان اس کے سننے سے کتنا متاثر ہوتے تھے، اس لیے کہ لفظ میں بھی پارے کی طرح حرارت اور برودت ہوتی ہے، جیسے آپ کسی چیز کو چھوئیں تو ایک درجہ کی حرارت ہوگی اور آپ کو محسوس ہوگی، تھوڑی سی حرارت ہوگی تو آپ ہاتھ رکھ دیں گے لیکن اگر زیادہ ہوگی تو آپ ہاتھ رکھ نہیں سکیں گے اور ہاتھ اٹھالیں گے، تو بڑی مشکل یہ پیش آ گئی ہے، ایسی مشکل ہے کہ اس کو مشکل کہنا بھی مشکل ہے، اس لیے کہ یہ توفیضان بھی ہے اور احسان بھی ہے کہ عربی کے الفاظ جو بہت طاقتور تھے وہ اردو میں عام استعمال ہونے لگے ہیں، اور انھوں نے اپنی طاقت کھودی اردو میں آ کر، انھیں میں ایک لفظ "الإحسان" ہے۔

الإحسان کے معنی ہیں کسی کام کو بہت بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دینا اور اس میں امتیاز پیدا کرنا، تو کہنے والے نے یہ کہا: "قِيمَةُ كُلِّ امْرِئٍ مَا يُحْسِنُهُ" ہر شخص کی قیمت وہ ہے، اس کا درجہ اور اس کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ اور اس کا معیار، ہر شخص کا جو بلند معیار ہے، وہ رہین منت ہے، وہ موقوف ہے "مَا يُحْسِنُهُ" پر، تو انسان دوسروں کے مقابلہ میں، دو چار کے مقابلہ میں، بعض مرتبہ بیس پچیس کے مقابلہ میں، بعض مرتبہ سیکڑوں کے مقابلہ میں، بعض مرتبہ ہزاروں کے مقابلہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، اس چیز کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے مدارس میں اس کی طرف سے توجہ ہٹتی چلی جارہی ہے، یعنی اس کو عربی میں "مشـاركة" کہتے ہیں، یہ لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، ہم نے اپنے عرب استاذوں اور ادیبوں سے بولتے سنا ہے کہ "فُلَانٌ لَهُ مُشَارَكَةٌ فِي ذَلِكَ الْفَنِّ"، "فُلَانٌ لَهُ مُشَارَكَةٌ طَيِّبَةٌ فِي هَـذَا الفَنِّ" کسی چیز سے واقفیت رکھنا اور اس سے کام لے سکنا، اس سے فائدہ اٹھا سکنا، اس کو "مشارکت" کہتے ہیں، یہ بھی تعریفی لفظ ہے، عرب اہل زبان سے ہم نے سنا ہے کہ "فُلَانٌ لَـهُ مُشَـارَكَةٌ فِـي كَـذَا"، لیکن ایک ہے "مشارکت" اور ایک ہے "احسان"، "احسان" یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں، دس بیس کے مقابلہ میں، سو پچاس کے مقابلہ میں بعض مرتبہ، مبالغہ نہیں ہے ایسے بہت سے لوگ گزرے ہیں جو ہزاروں کے مقابلہ اور بعض لوگ ایسے گزرے ہیں جو لاکھوں کے مقابلہ میں امتیاز کا درجہ رکھتے تھے، مثال کے طور

پر پیش کرتا ہوں، اصحاب صحاح ہیں، امام بخاری ہیں، یا ائمۂ اربعہ ہیں، یا شارحین حدیث ہیں، اب آپ ایک ''فتح الباری'' کو لے لیجیے، کہ ہم کہا کرتے ہیں کسی ملت میں بھی کسی مصنف کی کتاب اس طرح پیش نہیں کی جاسکتی جو بالکل دائرۃ المعارف ہو، اور حاوی ہو، اور ایسے ہی ''لسان العرب'' کو لے لیجیے، ایک سمندر ہے، ''قصیدۂ بردہ'' کو لے لیجیے، اور ایسی ہی کتنی چیزیں ہیں کہ جو پورے اس موضوع پر ایک امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔

تو "الإحسان" کے معنی یہی ہیں کہ آپ کو چند فنون پر عبور کامل ہو، اور آپ کی دسترس میں ہوں، اور لوگوں کو اس کے بارے میں نفع پہنچتا ہو، کھلا ہوا نفع پہنچتا ہو، اور افسوس ہے کہ یہ چیزیں بھی ہمارے تعلیمی حلقوں سے ختم ہوتی جارہی ہیں، مشارکت ہے، کام چلاؤ جس کو کہتے ہیں، اہل عرب کے محاورہ میں کام چلاؤ چیز تو ہے، تو پڑھالیں گے، سمجھ بھی لیں گے، سمجھا بھی دیں گے، کتابوں سے فائدہ بھی اٹھالیں گے، لیکن جس کو کہتے ہیں شان امتیازی، اور کہتے ہیں شان اجتہادی، شان امتیازی سے بڑھ کر ایک شان ہے شان اجتہادی، اس میں آدمی کو ایسا ملکہ ہو کہ جیسے ملبوسات، مذوقات اور ایسی چیزیں جو استلذاذ سے تعلق رکھتی ہیں، ویسے ہی جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ ایک ہوتا ہے زبان کا ذوق اور ایک ہوتا ہے زبان کا ذائقہ، بعض لوگوں کو زبان کا ذوق ہوتا ہے، اور ذائقہ نہیں ہوتا، اب میں اپنی زبان کے بارے میں کہتا ہوں، فخر کی بات نہیں ہے کہ میرے بڑے بھائی صاحب (۱) نے میرے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جن کے لیے زبان ذوق کا درجہ نہیں ذائقہ کا درجہ رکھتی تھی، یعنی جب وہ اس لفظ کو کہتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، اور وہ کیفیت منتقل ہوئی دوسروں کی طرف، یعنی وہ اپنے کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تھے، جھومنے لگتے تھے اور کہتے تھے، کیا غضب کیا، کیا غضب کیا، کیا غضب کیا۔

ہمیں یاد ہے کہ ہم کراچی اسکول میں تقریر کرنے گئے شعبۂ عربی ادب میں، تو حسنِ اتفاق کہ اس شعبہ کی جو صدر تھیں وہ ہمارے استاذ شیخ خلیل بن محمد عرب صاحب کی صاحبزادی تھیں، ہماری عربی کی اصل بنیاد اور عربی میں خدمت کرسکنے کی صلاحیت زیادہ تر

---

(۱) مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنی، سابق ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

ان ہی کی رہین منت ہے، ہم تقریر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس طرح ہمیں ہمارے استاذ نے عربی پڑھائی، تو انھوں نے وہیں سے آواز دی کہ علی بھائی! والد صاحب کا کوئی پسندیدہ شعر سنایئے جس سے ان پر کیفیت طاری ہو جاتی ہو، تو ہمیں یاد تھا کہ وہ بحتری کے بڑے قائل تھے، متنبّی کے مقابلہ میں بحتری کو بہت ترجیح دیتے تھے، اور ہم نے یہ شعر پڑھے:

بَلَوْنَا ضَرَائِبَ مَنْ قَدْ نَرٰی
فَمَا إِنْ رَأَيْنَا لِفَتْحٍ ضَرِيْبًا
هُوَ الْمَرْءُ أَبْدَتْ لَهُ الْحَادِثَا
تُ عَزْمًا وَشِيْكاً وَرَأْياً صَلِيْباً
تَنَقَّلَ فِيْ خُلُقَيْ سُؤْدَدٍ
سَمَاحاً مُرَجًّى وَّ بَأْسًا مَهِيْبًا
فَكَالسَّيْفِ إِنْ جِئْتَهُ صَارِخًا
وَكَالْبَحْرِ إِنْ جِئْتَهُ مُسْتَثِيْبًا

ارے غضب، ارے غضب، ارے غضب کیا، ارے ظالم، سَمَاحاً مُرَجیًّ وَّ بَأْساً مَهِيباً، سَمَاحاً مُرَجیًّ وَّ بَأْساً مَهِيباً، سَمَاحاً مُرَجیًّ وَّ بَأْساً مَهِيباً، سَمَاحاً کے لیے مُرَجّی کا لفظ لانا اور بأس کے لیے مَهِیب کا لفظ لانا، ایسے جھومتے تھے کہ بعض مرتبہ باہر سے دیکھنے والا ڈر جاتا اور بعض مرتبہ کہتا: قصہ کیا ہے؟ یہ تو عربی زبان کے متعلق کہہ دیا۔

''قیمت'' کے معنی

آپ صرف اس فقرہ کو میری آج کی اس حاضری کی قیمت سمجھیں، آج کل کسی مدرسہ کے خادم اور ناظم سے تقریر کی فرمائش کرنا بڑی خطرناک بات ہے، معلوم نہیں کیا کیا کہے گا، کن کن چیزوں پر تنقیدیں کرے گا، اور کیسے حرف گیری کرے گا، اور ہم سب ایک برادری ہیں، ہم سب کو معلوم ہے کہ کیا کمزوریاں آ گئی ہیں مدرسے میں، اس لیے آپ نے خطرناک کام کیا، میں اس خطرہ سے اپنے کو بچاتا ہوں اور آپ کو بھی محفوظ رکھتا ہوں، کہ آپ صرف

اتنی بات میری یاد رکھیں کہ "قِیمَۃُ کُلِّ امْرِئٍ مَایُحْسِنُہٗ" ہر شخص کی قیمت اصل جو ہے "مَایُحْسِنُہٗ" ہے، یعنی جو کام دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر جانتا ہے، اور قیمت کا لفظ عربی میں بڑا قیمتی ہے، یہ بھی بتادوں آپ کو، قیمت یہ نہیں ہے کہ جیسے کہتے ہیں کہ اس کی یہ قیمت ہے، بلکہ جس کی طرف امید وآس کی نگاہیں اٹھتی ہوں، یہ ہے اپنے فن میں سونے کے بھاؤ تولنے کے قابل، اور جس سے اس کو سر پر بٹھایا جائے، اور جس سے اس کو آنکھوں میں جگہ دی جائے، اس سب کے لیے اگر مفرد لفظ کہا جائے، عربی داں یہاں موجود ہیں، مولوی عبد اللہ عباس صاحب ندوی ہیں، یہ سالہا سال سے عربوں میں رہتے ہیں اور عربی زبان کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں، کہ قیمت کا لفظ جس کا ترجمہ اردو میں ہو نہیں سکتا، دار و مدار کہہ لیجیے، اصل سند فضیلت کہہ لیجیے، احترام کی وجہ کہہ لیجیے اور جس سے سہارا ہو زندگی کا، اس کا ایک مقام ہے، قَامَ یَقُوْمُ سے یہ لفظ بنا ہے، کہ "قِیمَۃُ کُلِّ امْرِئٍ" یہ نہیں کہ جو اس کو تنخواہ ملتی ہو وہ قیمت ہے اس کی نہیں، اس کی تو جو اصل قدر و قیمت ہے اور اصل جو اس کے اعزاز اور احترام کا باعث ہے وہ "مَایُحْسِنُہٗ" ہے، جو کام دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر جانتا ہو، جس میں اس کو کمال اور دسترس حاصل ہو، جس میں شان امتیازی حاصل ہو۔

آج ہم ڈھونڈھتے ہیں کہ فقہ میں کسی کو امتیاز حاصل ہو، ملنا مشکل ہوتا ہے، اور حدیث میں اور زیادہ ملنا مشکل ہوتا ہے، تفسیر میں اور تدبر قرآن میں اور زیادہ ملنا مشکل ہوتا ہے، اور صرف ونحو پڑھانے میں ایسا ملکہ ہو کہ آدمی چاہے ازہر میں جائے، چاہے کہیں جائے، کوئی اس کو پکڑ نہ سکے، لیکن ہم ہندوستانیوں میں یہ نقائص رہتے ہیں۔

زبان بہت ہی حساس چیز ہے

۱۹۵۱ء سے پہلے کی بات ہے کہ میں دمشق گیا تھا پہلی مرتبہ، وہاں ہمارے جاننے والوں میں مصطفیٰ بہاء الدین الامیری مرحوم تھے، تو انھوں ہم سے کہا: آپ کی یونیورسٹی میں تقریر ہونی چاہیے، اور اس زمانہ میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر ایک عیسائی تھا اور بڑا فاضل تھا، اور مسئلۂ فلسطین کے اسباب کے بارے میں (مقالہ پڑھنا تھا)۔ خیر ہم نے اس کی تیاری کی،

ازسرنو مطالعہ کیا فلسطین پر، اور صلاح الدین ایوبی کی تاریخ پڑھی، اور اس کے بعد فلسطین کے بارے میں جو کچھ تھا لکھا، جب مضمون لکھنے بیٹھا ہوں تو بتاتا ہوں کہ آپ کے لیے مفید ہو، اگرچہ عربوں سے پڑھ چکا تھا اور عرب بھی کیسے عرب، علامہ دکتور تقی الدین ہلالی مراکشی کی نظیر نہیں تھی، ہم نے ان کی نظیر کہیں پائی نہیں، الفاظ کی صحت کے بارے میں کہ علامہ امیر شکیب ارسلان اور علامہ رشید رضا میں جب کسی لفظ کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا کہ عرب اس معنی میں اس لفظ کو بولتے تھے کہ نہیں، تو کہتے تھے کہ دکتور تقی الدین ہلالی بتائیں گے، تو شیخ تقی الدین ہلالی سے ہم پڑھ چکے تھے، لیکن جب ہم نے مضمون لکھا تو ہم نے مناسب سمجھا کہ بڑے عرب عالم اور نقاد کو پہلے سنادیں، میں آپ کو بتاتا ہوں آپ کے کام کی بات ہے، کیا تھا میں مضمون پڑھ دیتا، نہ مجھے کوئی اجرت ملنی تھی اور نہ مجھے تعریف چاہیے تھی، نہ ہی وہاں ملازمت کرنی تھی کہ اس کا ذریعہ بنتا ہے کہ نہیں، لیکن ہم ان کے پاس گئے اور اول سے آخر تک ان کو سنایا کہ اعراب بھی ہم صحیح پڑھیں اور لفظ بھی، آپ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ عربی میں صرف اعراب ہی پر انحصار نہیں ہے، بلکہ درمیانی جو حرکات ہیں، مثلاً آپ فقر کو، اگر وہ اعراب کی حیثیت سے مرفوع ہے تو مرفوع کہیں گے اور منصوب ہے تو منصوب کہیں گے، لیکن قاف کا بھی ایک اعراب ہے، اگر آپ قاف کو متحرک پڑھیں گے تو سب پر پانی پھر جائے گا، ''فَقَرْ'' کہیں گے، فَقْرْ کو فَقَرْ کہہ دیں گے، آپ شَرَفْ کو شَرْف کہہ دیں گے، تو متحرک کو ساکن پڑھیں گے اور ساکن کو متحرک پڑھیں گے تو سب پر پانی پھر جائے گا۔

آپ کو بتاتا ہوں کہ زبان بہت ہی حساس چیز ہے، اس کی طرح حساس چیزیں بہت کم ہوتی ہیں، ایک ہلکی سی غلطی سے بالکل نظر سے گر جاتا ہے، خواہ اول سے آخر تک سنیں، مجھے بھی احساس تھا، کہنے لگے: آپ الف لام کا استعمال بہت صحیح کرتے ہیں ناموں پر، اَعلام پر، اس میں بڑی غلطی کرتے ہیں ہندوستانی، مکہ مکرمہ میں ایک ہندوستانی عالم تھے، ایک عرب عالم کے پاس گئے ہوئے تھے، انھوں نے کہا: أَنَا ذَاهِبٌ یا أَنَا أَذْهَبُ مِنَ الْمَكَّة إِلَى مَدِينَة، فَهَلْ لَكُمْ حَاجَةٌ؟ تو کہا: حَاجَتِي الْوَحِيْدَةُ أَنْ تَأْخُذَ الْأَلِفَ وَ اللَّامَ مِنْ مَكَّةَ وَ تَضَعَهُمَا عَلَى الْمَدِيْنَة، مجھے اسی کی ضرورت ہے کہ آپ مکہ سے الف لام نکال لیجیے گا،

اٹھا لیجیے گا اور مدینے کو ڈال دیجیے گا، اس لیے کہ مکہ بغیر الف لام کے ہے اور مدینہ الف لام کے ساتھ، اور یہ سماعی ہے عرب میں، خود ہندوستان میں کئی صوبے ایسے ہیں جو الف لام کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، جیسے السند، غالباً الملتان بھی کہتے ہیں، لیکن اور کسی ملک یا شہر پر الف لام داخل نہیں کرتے، کیوں کہ قاعدہ نہیں ہے، ملک شام الشام، العراق، لیکن مصر کیوں نہیں ہے المصر، ہمیں نہیں معلوم، عربوں سے پوچھیے، تو مصر پر الف لام نہیں آئے گا، الایران نہیں آئے گا، لیکن العراق پر آئے گا،، تو زبان کا مسئلہ ایسے ہی تھا جیسے علوم کا، یہ بھی آپ کو بتاتا ہوں اس میں اگر ذراسی غلطی آپ سے ہوگئی کہ فقہ ہی میں سہی، فقہ میں، حدیث میں اور کلام وغیرہ میں اور جو درس دیا جاتا ہے، اس میں تو ایک غلطی سے سب پر پانی پھر جاتا ہے، پھر وہ نظر سے گر جاتا ہے، اور کسی اور ذریعہ سے وہ اپنا کلام ظاہر کرنا چاہے تو اس کلام کا اثر نہیں ہوتا، بڑی نازک چیز ہے، خاص طور پر اہل زبان کے اس معاملہ میں۔

اسی لیے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے، اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے، انھوں نے عربی زبان کو عربی زبان کی حیثیت سے پڑھنے کی پہلی مرتبہ دعوت دی ہندوستان میں، ورنہ عربی زبان کو ذریعہ کے طور پر، مجھ سے خود کہا ایک بڑے عالم نے، مستند عالم نے، نام نہیں لوں گا کہ عربی زبان کی قدر و قیمت اتنی ہے کہ فقہ و حدیث کی کتابیں سمجھ لی جائیں، بس اتنا کافی ہے، لیکن حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ جیسے عارف باللہ، ان کا خط ہے میرے والد صاحب کے نام، محفوظ ہے خطوط میں کہ یہاں ایک عرب عالم ہیں، بہت اچھی تقریر کرتے ہیں، ہم ان کو تیار کر رہے ہیں کہ وہ جائیں اور ندوہ میں پڑھائیں، اور دیکھیے اس کا خیال رکھیے گا کہ لڑکے عربی میں تقریر کرسکیں، اور اظہار خیال کرسکیں، اس وقت ان کو خیال تھا۔

علم میں رسوخ پیدا کریں

تو کہنے کی بات یہ ہے کہ صرف اتنا جملہ آپ کے لیے چھوڑتا ہوں بطور نصیحت کے یا بطور وصیت کے کہ "قِیمَةُ کُلِّ امْرِئٍ مَا یُحْسِنُهُ" ہر شخص کی قیمت وہ ہے جس کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور کامیاب طریقہ پر جانتا ہو اور کرسکتا ہو، تو آپ کے لیے

اتنا کافی نہیں ہے کہ آپ فقہ سمجھنے لگیں، مطلب نکالنے لگیں، مسئلہ بھول جائیں تو آپ کو معلوم ہو کہ یہاں سے نکال لائیں گے، یہاں ملے گا، وہ سب کر سکتے ہیں، لیکن کسی ایک فن میں آپ کو امتیاز خصوصی حاصل ہونا چاہیے، اور ہمارے مدارس کا تو پیغام یہ ہے، اور ان کی بنیاد اس پر ہے کہ ایک فن میں نہیں بلکہ تمام فنون جو درس میں ہیں، ان سب میں آپ کو رسوخ ہونا چاہیے، "قِيمَةُ كُلِّ امْرِئٍ مَا يُحْسِنُهُ" کا مطلب رسوخ بھی ہے، یعنی آپ کو صرف علم حاصل نہ ہو بلکہ رسوخ فی العلم بھی حاصل ہو، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف کی ہے: ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جب فرمائیں، اور وہ کیا ہے: ﴿اَلرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ تو رسوخ بھی کم سے کم علماء کے لیے جو دین کی خدمت کریں، مدارس قائم کریں، تدریس کا فرض انجام دیں، یا فتاویٰ کا فرض انجام دیں، ان سب کے لیے "قِيمَةُ كُلِّ امْرِئٍ مَا يُحْسِنُهُ" بھی ان سب کے سامنے رہنا چاہیے، اور "اَلرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" بھی رہنا چاہیے۔

بس اسی کی آپ کوشش کیجیے، اس میں بڑا زوال تیزی سے آ رہا ہے، اور سطحیت پیدا ہو رہی ہے، کسی ایک فن میں بھی استقرار اور تعمق پیدا نہیں ہوتا، اس تعمق کو پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور خاص طور پر ایسے مدارس میں جو ہنگاموں سے ہٹے ہوئے ہیں، اور بڑے سیاسی میدانوں سے اور آج کل کے جو مشاغل ہیں، آج کل کی تحریکیں ہیں، ان سب سے دور ہیں، وہاں یہ کام زیادہ آسان ہے بہ نسبت بڑے بڑے مدارس کے، یہاں تیاری کر لیجیے، پھر آپ کو اختیار ہے، آپ دیوبند جائیے، ندوہ جائیے، یا آپ عرب چلے جائیے، یا جزیرۃ العرب کے کسی مدرسہ میں چلے جائیے، مگر صرف نحو کی بنیاد اور ابتدائی جو مقدمات ہیں علم کے، ان میں آپ کو پختگی ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو توفیق دے،

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔(۱)

(۱) جامعہ اسلامیہ (اعظم گڑھ) میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے ۳۰ر ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق یکم مئی ۱۹۹۵ء کو کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا محمد نسیم الدین ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۹۵ء)۔

چراغ زندگی اور دستور العمل

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَآءَ الْأَوْفٰى ﴾ (۱)

میرے عزیزو! میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے خطاب کرنا ہے اور بہت عرصہ کے بعد بات کرنی ہے، اور کچھ حق ادا کرنے کی کوشش کرنی ہے جو حق ہم پر عائد ہوتا ہے وطنیت کا بھی، جوار کا بھی، اور علمی اشتراک کا بھی، اور مقصد کے اتحاد کا بھی، اور دعوت کے تقاضوں کا بھی، کیا کہا جائے، کہنے والی باتیں تو بہت ہیں، وقت تھوڑا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دل میں ڈالی جس میں پورا پیغام ہے، آپ کی زندگی کا پورا نظام اس کے اندر ہے، زندگی کس طرح گزارنی چاہیے؟ زندگی کے لیے کیا سامان پیدا کرنا چاہیے؟ زندگی دینی زندگی ہو، علمی زندگی ہو، دعوتی زندگی ہو، اصلاحی زندگی ہو، ان سب کے لیے کس طرح تیاری کرنی چاہیے اور اس تیاری کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس لیے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ اس کو فائدہ بھی معلوم ہونا چاہیے، کون سی کوشش کا کیا فائدہ ہے؟ فلاں دوا کا کیا خاصہ ہے؟ فلاں بیج کا کیا مادہ ہے؟ اور فلاں میدان کا کیا تقاضا ہے؟ یہ انسان کی فطرت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ذہن میں القاء فرمائی اور دل میں ڈالی، جس میں پوری زندگی کا نظام آ گیا ہے اور پورا قانون آ گیا ہے، اور آپ اس آیت کو سمجھ لیں، اس کو اپنا دستور العمل اور اپنا رہنما بنا لیں، اور اس آیت کی صداقت پر آپ ایمان لے آئیں، اور یقین کر لیں، اور دل میں اس کو اتار لیں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے، دنیا

---

(۱) سورۃ النجم: ۳۹-۴۱

کے تمام حکماء اور بڑے بڑے ذہین لوگ بھی کوئی بات کہتے ہیں کہ یہ ہوگا، اور ایسا ہوگا، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، تو اس کا پورا سو فیصدی اعتبار نہیں کیا جا سکتا، یہ زندگی کا تجربہ ہے اور تاریخ کا مطالعہ ہے کہ کتنے آدمیوں کی پیشین گوئی غلط نکلی، اور کیسے کیسے فائدے فلاں فلاں چیزوں کے بتائے گئے تھے، ان میں سے کچھ حاصل نہیں ہوا، پوری تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ فرما دے کہ اس کا یہ خاصّہ ہے، یہ کروگے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا، تو پھر اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا، پھر ایسی کیا بات ہے کہ کہی جائے کہ اس کو آپ اپنا دستور العمل بنا لیں، اس کو اپنا چراغ زندگی بنا لیں، اور اس کی روشنی میں آپ چلیں۔

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا

یہ آیت جو ہم نے پڑھی ہے، یہ خاص طور پر ہماری تعلیم گاہوں کے لیے، اور اصلاحی مراکز کے لیے، اور خاص کر ان مرکزوں کے لیے جہاں پر نوجوان ہوں، امت کے اور ملت کے بچے و فرزند ہوں، جن کی اٹھتی ہوئی عمر ہے اور چلتی ہوئی کشتی ہے، تو ان کے لیے اس آیت میں پورا دستور العمل ہے، اور ایک چراغِ راہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ ''انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے کوشش کی ہے''، یہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے، وہ جب کہہ رہا ہے کہ کوشش شرط ہے اور انسان کی کوشش ہی کا نتیجہ نکلے گا، تو پھر دوسرا انسان کیا کہہ سکتا ہے؟ ''نہیں ہے انسان کے لیے مگر جس چیز کی اس نے کوشش کی ہے۔'' ﴿وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ﴾ اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوگا، اس کی کوشش کا نتیجہ دکھائی دے گا، آنکھوں کو دکھائی دے گا کہ جو کوشش کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا۔

پھر اس کے بعد بڑی بشارت سناتا ہے: ﴿ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ﴾، اَلْأَوْفیٰ اسم تفصیل کا صیغہ ہے، اتنا آپ جانتے ہوں گے، ''پھر اس کو بدلہ دیا جائے گا بھرپور بدلہ، زیادہ سے زیادہ بدلہ،'' ایک تو انسان کی کوشش ضائع نہیں ہوگی، کوشش کا نتیجہ نکلے گا، پھر انسان کی کوشش کا نتیجہ اس کی توقع سے، اس کے استحقاق سے، اس کی محنت کی مقدار سے بھی بڑھ کر نکل سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بشارت سناتا ہے کہ ہوگا ایسا، اور ساری تاریخ بتاتی ہے، علم کی

تاریخ بتاتی ہے، دعوت واصلاح کی تاریخ بتاتی ہے، کاموں سے اشتراک کی تاریخ بتاتی ہے، تحقیقات وتصنیفات کی تاریخ بتاتی ہے، اصلاحی کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوشش کا نتیجہ نکلا، بعض اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات کوشش سے زیادہ نکلا، کوشش کا جو پیمانہ تھا، اس کا جو سائز تھا، اس سائز سے بہت بڑھ کر نتیجہ نکلا، وہ نتیجہ کوشش کے سائز سے بہت بڑھا ہوا تھا، اس سے بڑھ کر بشارت کیا ہوسکتی ہے؟

آپ اگر پکڑ لیں اس بات کو، اور دل پر لکھ لیں کہ ہم کوشش کریں گے، تو کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا، امید ہے کہ کوشش کی حیثیت سے بڑھ کر نکلے گا، توقع سے بڑھ کر، قیاس سے بڑھ کر نکلے گا، اور اس کے لیے نہ کسی بہت بڑی جگہ کی ضرورت ہے، نہ کسی بڑی دانش گاہ کی ضرورت ہے، نہ کسی بڑے اونچے خاندان کی ضرورت ہے، نہ بہت اعلیٰ درجہ کے اساتذہ کی ضرورت ہے، نہ بہت وسیع کتب خانہ کی ضرورت ہے، اس کے لیے کوشش کی ضرورت ہے، نیت کی ضرورت ہے، سنجیدگی اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔

درس نظامی اور ملاّ نظام الدین سہالویؒ

تاریخ اسلام تو بہت بڑی ہے، اس کی مثالیں دینے پر آئیں تو دن بھی کافی نہ ہوگا، ہندوستان ہی کو لیجیے کہ جن لوگوں کا آج دنیا میں نام ہے، جن لوگوں کا اس وقت دنیا میں کارنامہ سمجھا جاتا ہے، وہ ایک پورے کے پورے دور کے بانی ہیں، اور ساری دنیا نے ان کے علم کے آگے سر جھکا دیا ہے، وہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کہاں پڑھا؟ آج ان بستیوں کا شاید بہت کم لوگ نام جانتے ہوں۔

یہ درس نظامی جو ہندوستان میں کئی صدیوں تک چلا ہے، اور یہی شرط اور معیار تھا قابلیت کا، علمیت کا، یہ ملاّ نظام الدین کا بنایا ہوا اور ترتیب دیا ہوا ہے، اس کی پوری تاریخ ہے، کبھی آپ ہمارے والد صاحب کی کتاب ''ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات'' پڑھیے گا، لیکن جس کی طرف اس کی نسبت ہے، وہ ملا نظام الدین ہیں، کہاں کے رہنے والے تھے؟ سہالی کے رہنے والے تھے، سہالی کہاں ہے؟ شاید اس مجمع میں کوئی بھی نہ جانتا ہو، یہ

بارہ بنکی میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، وہاں کے رہنے والے تھے، پھر بعض بعض کتابیں درس نظامی کی ایسی ہیں کہ جن کی بلندی کو، اور جن کے مضامین کی نزاکت کو، مضامین کی سنجیدگی کو، مضامین کی دقت کو ساری دنیا نے مان لیا ہے، وہ ایسے قصبات کے رہنے والوں نے لکھی ہیں کہ خیال بھی نہیں ہوسکتا، مثلاً درس نظامی میں سب سے اونچی کتاب جو سب سے زیادہ دقیق سمجھی جاتی ہے، وہ ہے: ''شمس بازغہ''، یہ ''شمس بازغہ'' ولید پور۔ بھیرہ [1] کے ایک عالم کی لکھی ہوئی ہے، لیکن بڑے بڑے استادوں نے سر جھکا دیا، اس کو پڑھنا، اس کو سمجھنا ایک معیار سمجھا جاتا تھا، درس نظامی آپ نے پڑھا ہے؟ درس نظامی میں ''شمس بازغہ'' آپ نے پڑھ لی ہے؟ سمجھ گئے؟ اسی طرح سے ملا حسن کی کتابیں درس نظامی میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، یہ سندیلہ کے آدمیوں اور فرنگی محل کے چند لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

محنت اور حسن نیت واخلاق

بات تو یہ ہے کہ محنت اور حسن نیت واخلاق یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں تو پھر وہ ضائع نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے، جو کہ عالم الغیب اور قادر مطلق ہے، دیکھیے ایک تو عالم الغیب ہونا یہی ایک بڑی بات ہے، لیکن وہ قادر مطلق بھی ہے، عالم الغیب بھی ہے، مخبر صادق بھی ہے، اور رب العالمین بھی ہے، وہ جب فرماتا ہے، اعلان کرتا ہے اور اس کی ذمہ داری لیتا ہے: ﴿وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ﴾ ''اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوکر رہے گا'' تو پھر دنیا میں اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، کچھ اس میں اضافہ ہو ہی نہیں سکتا۔

علم اور کمال

رب العالمین، أرحم الرحمین، أقدر القادرین، عالم الغیب والشہادۃ، رب الاولین والآخرین، وہ جب کہتا ہے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوکر رہے گا، بس آپ اس چیز کو پکڑ لیجیے، پلو میں باندھ لیجیے، دل پر لکھ لیجیے کہ آپ کو محنت کرنی ہے، پھر ہم خانۂ خدا میں بیٹھ کر کہہ

---

(۱) ضلع مئو میں محمد آباد گوہنہ کے پاس واقع ایک قصبہ۔

رہے ہیں کہ اس کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا، اور بڑے بڑے اہل کمال اس کو مانیں گے ،مثلاً صحیح عبارت پڑھنا کہ صرف ونحو کے قواعد آپ جانتے ہوں، اور ان کی آپ کو مشق ہو ،آپ مرفوع کو مرفوع پڑھیں، منصوب کو منصوب پڑھیں، اور مجرور کو مجرور پڑھیں، اور جانیں کہ کہاں 'الف لام' آنا چاہیے، کہاں نہیں آنا چاہیے، اگر آپ عبارت صحیح پڑھیں تو یہ بہت بڑا کمال ہے، ہمارے ہندوستان اور عجمی ملکوں میں خاص طور پر یہ بڑی اہم چیز ہے، سب کچھ آپ جانتے ہیں، بڑا علم ہے، مشکل سے مشکل کتاب سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں، لیکن اگر عبارت پڑھنے لگے کسی اہل زبان کے سامنے، کسی اہل علم کے مجمع میں تو بعض مرتبہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے کہ سب پر پانی پھر جاتا ہے، سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، کالعدم ہو جاتا ہے۔

اب بات آ گئی تو ہم آپ سے کہیں گے کہ ہم ۱۹۵۱ء میں دمشق گئے، عمر بہاء الدین الامیری جو پاکستان میں شام کے سفیر تھے، وہ بھی تشریف لے گئے تھے، انھوں نے کہا کہ آپ کی تقریر یونیورسٹی میں ہونی چاہیے، یونیورسٹی سب سے بڑی دانش گاہ ہوتی ہے، سب سے بڑا علمی مرکز ہوتا ہے، ہم عجمی، ہندی یہاں رائے بریلی کے رہنے والے اور وہاں دمشق یونیورسٹی میں ہماری تقریر ہوگی، ہمیں معلوم ہوا کہ اس میں پارلیمنٹ کے ممبران بھی شامل ہوں گے، اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان اور بڑے بڑے چوٹی کے علماء بھی شامل ہوں گے، ہم چونکہ عربوں کو دیکھے ہوئے تھے اور پڑھے ہوئے بھی تھے، تو ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے بہت بڑے عالم کو اپنا مضمون سنا دیں کہ خدانخواستہ ہم نے فتحہ کی جگہ پر کسرہ پڑھ دیا، یا کسرہ کی جگہ پر فتحہ پڑھ دیا، تو سب پر پانی پھر جائے گا، لوگوں کا بیٹھنا اور سننا مشکل ہو جائے گا۔

یہ آپ کو بتاتے ہیں کہ غلطی کا مزاج اور ماحول پر اثر پڑتا ہے، جیسے ہوا کا اثر ہوتا ہے، ایک دم سے گرم جھونکا آ گیا، یا ایک دم سے ٹھنڈا جھونکا آ گیا، یا پانی برسنے لگا، تو آدمی کا بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے، ویسے ہی ایک غلطی آپ نے کی، نحوی غلطی یا صرفی غلطی، یا منصوب کو آپ نے مرفوع پڑھ دیا، جہاں الف لام نہیں داخل ہونا چاہیے، وہاں الف لام داخل ہو گیا، تو چاہے جتنی ہی آپ کی تحقیقات ہوں، کتنا ہی آپ کے متعلق کہا گیا ہو کہ ایسے فاضل ہیں، فلاں جامعہ کے ہیں، ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں، یا دیوبند کے فاضل ہیں، فلاں جامعہ کے

ہیں، سب بیکار ہو جاتا ہے۔

ہم نے مضمون لکھا وہاں کے حالات کے مطابق "العوامل الأساسية لكارثة فلسطين "جو وہاں کے حسب حال تھا کہ جو المیہ پیش آیا فلسطین میں، مسجد اقصیٰ اور قدس شہر عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور یہودیوں کے پاس پہنچ گیا، اس کے حقیقی اسباب کیا تھے؟ اس کے بنیادی اسباب کیا تھے؟ لوگ تو ایسے ہی سطحی اسباب سوچ لیتے ہیں، تجویز کر لیتے ہیں، لیکن اس میں حقیقی اسباب کیا ہیں؟ کیا چیز اللہ کو ناپسند ہوئی کہ جس کی وجہ سے اس نے نقشہ ہی بدل دیا، الٹ دیا بالکل، اور وہ یہودی جو کئی ہزار برس سے حکومت کرنے سے محروم تھے، ان کو حکومت مل گئی، ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے قرآن کی روشنی میں، حدیث کی روشنی میں، سیرت کی روشنی میں، تاریخ کی روشنی میں، ہم نے مضمون لکھا "العوامل الأساسية لكارثة فلسطين "اس کو کتابیں پڑھ کر تیار کیا کہ مسلمان اور غیر مسلم عیسائی بھی اگر ہوں تو وہ بھی متاثر ہوں اور قائل ہوں۔

پھر ہم نے کہا، اتنے بڑے فاضلوں کے سامنے، اور بڑے بڑے اساتذہ کے سامنے، پروفیسر صاحبان کے سامنے، پارلیمنٹ کے ممبران کے سامنے، اور ادیبوں کے سامنے مضمون پڑھیں گے، ہم ہندوستانی، ملک کا اثر پڑتا ہی ہے، خدانخواستہ اگر ذرا سی غلطی ہو گئی تو پھر لوگوں کا بیٹھنا مشکل ہو جائے گا، سننا مشکل ہو جائے گا، اور احتراماً اگر بیٹھے رہے تو اثر کچھ نہیں لیں گے، تو ہم علامہ بہجۃ البیطار کے پاس گئے جو اس عہد کے چوٹی کے عالموں میں سے تھے، شاید سب سے بڑے عالم ہوں، علامہ رشید رضا مصری صاحب مجلۃ "المنار" کا جب انتقال ہوا، ان کی تفسیر نامکمل رہ گئی تھی، تو انہیں کا انتخاب ہوا تھا کہ یہ مکمل کریں، "البلاغ" بھی ان کی ادارت میں دیا گیا۔

ہم ان کے پاس گئے، ہم نے کہا کہ شیخ! دمشق یونیورسٹی میں ایک مضمون پڑھنا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ پہلے آپ کو سنا لیں، آپ کا انتخاب اس لیے کرتے ہیں کہ آپ ہمارے استاد، ہمارے مخدوم اور ہمارے سرپرست علامہ سید سلیمان ندویؒ کے دوستوں میں ہیں (یہ ہمیں معلوم تھا)، تو آپ کو سنانے میں کوئی شرم ہمیں نہیں آنی چاہیے، انھوں نے کہا: نہیں! نہیں! آپ کو سنانے کی کیا ضرورت؟ آپ کی کتاب "ماذا خسر العالم "ہم نے پڑھی ہے، آپ

تو مصنف ہیں، (جیسے شریف آدمیوں اور منتظم لوگوں کو کہنا چاہیے)، ہم نے کہا: نہیں، آپ سن لیجیے، انھوں نے سنا اول سے آخر تک، الحمدللہ کوئی غلطی نہیں نکلی۔

پھر وہ ایک لطیفہ سنانے لگے کہ آپ تو الف لام کے استعمال میں بڑے محتاط ہیں، ورنہ بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ کس ملک پر الف لام آتا ہے، کس پر نہیں آتا ہے، یہ بالکل سماعی چیز ہے، قیاسی نہیں، عربوں نے جس پر الف لام داخل کردیا تو اس پر قیامت تک الف لام رہے گا، اور جس پر داخل نہیں کیا اس پر کوئی داخل نہیں کرسکتا، مصر پر الف لام داخل نہیں ہو سکتا، مصر کو مصر کہیں گے، المصر نہیں کہیں گے، لیکن عراق پر داخل ہوتا ہے تو العراق کہیں گے، عراق نہیں کہیں گے، فارس پر نہیں داخل ہوتا ہے، عرب پر داخل ہوتا ہے، اس لیے العرب کہیں گے، سند پر الف لام آتا ہے اس لیے السند کہیں گے،، تو اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے، صرف دیکھیں گے کہ کس طرح عربوں نے استعمال کیا ہے اور کس طرح کتابوں میں ہے ،بس اتنا ہی کافی ہے۔

تو ہم کو ایک لطیفہ سنایا کہ آپ کے ہندوستان کے ایک عالم مکہ مکرمہ کے ایک عالم کے پاس گئے، اور انھوں نے عربی میں کہا: أنا ذاهبٌ یاأنـا أذهبُ من المكة إلى مدينة، میں المکۃ سے مدینہ جارہا ہوں، کوئی ضرورت ہے؟ مکہ پر الف لام نہیں آتا، کیوں نہیں آتا؟ یہ کوئی پوچھ نہیں سکتا، یہ طے شدہ بات ہے، اور مدینہ پر آتا ہے کہ ہر شہر کو مدینہ کہتے ہیں تو المدینۃ ہو، یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون سا مخصوص شہر ہے، تو انھوں نے کہا: بس ہمارا اتنا کام ہے کہ مکہ کے سر سے الف لام اٹھا کر مدینہ کے سر پر ڈال دیجیے، انھوں نے اصل میں ان کی تنبیہ تہذیب کے ساتھ کی، پھر جب آپ پوچھتے ہیں کیا کام ہے؟ تو اتنا کام ہے، وہ سمجھ گئے کہ ہم سے غلطی ہوگئی۔

زبان کی حسّیت اور خاصۂ لسانی سے واقف ہونا ضروری ہے

زبان کا احساس، زبان کی حسیت، خاصۂ لسانی، یہ بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے، زبان ایسی چیز ہے کہ وہ معاف نہیں کرتی، اور زبان کی غلطی معاف نہیں کی جاتی، اگر کہیں کوئی نقل میں

غلطی ہوگئی ہو تو کہا جائے گا کہ یاد سے لکھ دیا، لیکن اگر ایک لفظ بھی آپ غلط بول گئے تو تقریر پر پانی پھر جاتا ہے، ہم سے خود عربوں نے کہا، جدہ کے لوگوں نے کہا کہ آپ کے یہاں کے بعض لوگ آتے ہیں، عالم ہوتے ہیں، مبلغ ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آج تقریر ہوگی، سب لوگ بیٹھ جائیں، سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں، لیکن چند جملے سن کر ہم نہیں بیٹھ سکتے، اٹھ کر چلے جاتے ہیں، ہم سے نہیں سنا جاتا، اہل زبان بڑے غیرت دار ہوتے ہیں، غیرت کی ہزاروں قسمیں ہیں، یہ غیرت لسانی ہے۔

تو آپ سے ایک بات یہ کہتے ہیں کہ یہاں عبارت صحیح پڑھنا سیکھیں اور کس پر الف لام داخل ہوتا ہے اور کس پر نہیں ہوتا، کس کو منصوب پڑھنا چاہیے، کس کو مرفوع، یہ سیکھیں، اور اس کے ساتھ یہ کہ 'ث' کو 'ث' کس طرح پڑھیں، اگر 'ث' کو 'س' کہہ دیا، 'ص'، 'ث' یا 'س' کہہ دیا، تو سب پر پانی پھر گیا، عربی زبان مختلف المخارج بھی ہے، مختلف الاصوات بھی ہے، ث، س، ص، یہ ملتی جلتی آوازیں ہیں، لیکن ث، ث کس طرح ادا ہوگا؟ س، س کس طرح؟ اور ص، ص کس طرح ادا ہوگا؟ مخارج عربی زبان کی خصوصیت ہے، انگریزی یا کسی دوسری زبانوں میں یہ چیزیں نہیں ہیں، تو اگر بڑی تحقیقات آپ نے کی ہیں، بڑی نئی نئی باتیں آپ نے پیش کی ہیں، لیکن آپ نے 'ث' کو 'ص' پڑھ دیا، 'ص' کو 'س' پڑھ دیا تو عربوں کا سننا مشکل ہو جائے گا۔

تو ایک تو یہ کہ آپ یہاں کوشش کریں کہ صحیح عبارت پڑھ سکیں، صرف ونحو آپ کی مضبوط ہو، آپ اعراب سے واقف ہوں، اور آپ کا لہجہ درست ہو، اور جو بھی حروف حلقی ہوں ان کو حروف حلقی کی طرح ادا کریں، اور جو حروف حلقی نہیں ہیں ان کو اسی طرح ادا کریں، یہ کام یہیں سے ہو سکتا ہے، اس کی بنیاد یہیں پڑے گی، اگر یہاں نہ پڑی تو پھر آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء چلے جائیں، دارالعلوم دیوبند جائیں، کہیں جائیں، پھر اس کا درست ہونا مشکل ہے، یہیں کوشش کریں کہ آپ کو معلوم ہو کہ کس کو منصوب پڑھنا چاہیے؟ کس کو مرفوع پڑھنا چاہیے؟ اور کیوں پڑھنا چاہیے؟ سب عوامل اور ان کے جو اثرات ہیں، ان سے واقف ہوں۔

مسائل کا استحضار

دوسری بات یہ کہ آپ دینیات میں، فقہ میں جو ابتدائی مسائل ہیں، جو کتابیں آپ کے یہاں پڑھائی جاتی ہیں، مثلاً شرح وقایہ یا دوسری فقہ کی کتاب قدوری وغیرہ، ان کے مسائل آپ کو مستحضر ہوں، نماز کے مسائل آپ کو معلوم ہوں، زکوٰۃ کن پر فرض ہوتی ہے؟ اس کا کیا نصاب ہے؟ سب معلوم ہو، اگر خدا حج کو لے جائے تو اس کے ارکان اور مسائل بھی پہلے سے مستحضر ہوں، زکوٰۃ کے مسائل آپ کو معلوم ہوں، اور اگر کوئی موٹا مسئلہ آپ کے خاندان میں کوئی پوچھے، گاؤں میں کوئی پوچھے تو آپ بتا سکیں، اس کو معلوم ہو کہ ہمارے گاؤں میں ایک صاحبزادے کے جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مسئلہ بتاتا ہے، یہ بات آپ کو یہیں سے آنی چاہیے، اس کی مشق کریں۔

اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جو دینی رنگ ہونا چاہیے، جو دینی سطح ہونی چاہیے ایک دینی عربی مدرسہ کے طالب علم کی، یعنی نمازوں کی پابندی، وقت سے آنا، بلکہ وقت سے پہلے آنا، اور خشوع وخضوع کے ساتھ اور احترام کے ساتھ بیٹھنا، دنیا کی باتیں نہ کرنا، قرآن مجید کی تلاوت کا جو معمول مقرر کیا ہے، اس کو پورا کر لینا، اذکار وتسبیحات جو آپ کو بتائی ہیں یا آپ کو معلوم ہیں اور آپ کا معمول ہے، ان کو پورا کر لینا، پھر استادوں کا ادب، تواضع خاکساری، خدمت کا جذبہ، یہ سب باتیں ہونی چاہئیں۔

زمانۂ طالب علمی میں تربیت کی اہمیت

یہ چیزیں یہیں سے پیدا ہو سکتی ہیں، اور یہاں نہ ہوئیں تو پھر آپ جامع ازہر چلے جائیے، وہاں بھی یہ باتیں پیدا نہیں ہوں گی، اور یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب کسی طالب علم میں یہ بات شروع سے پیدا نہ ہوئی تو پھر بعد میں پیدا ہونی مشکل ہے، ہم نے بڑی بڑی جامعات کو دیکھا ہے، کئی جگہ تقریر کرنے کا موقع بھی ملا ہے، وہاں کے بڑے طالب علموں سے اور اساتذہ سے بھی بے تکلف باتیں ہوئیں، صحبتیں رہیں، دمشق میں، قاہرہ میں، بغداد

میں، اور مراکش ورباط میں سب جگہ علمی حلقہ سے -الحمد للہ- واسطہ پڑا ہے، لیکن دیکھا ہے کہ جن لوگوں کی تربیت ہوگئی اور طالب علمی کے زمانے میں ان کا سانچہ بن گیا، وہ بڑے باکمال نکلے اور انھوں نے بڑے دینی کام کیے، لیکن جن کا سانچہ وڈھانچہ طالب علمی کے زمانے میں نہیں بنا، وہ کسی کام کے نہیں رہے۔

غیر درسی کتب کا مطالعہ

تو یاد رکھیے! سانچہ وڈھانچہ ان مدرسوں میں بن سکتا ہے، اس کو بنایئے اور پھر اساتذہ سے رابطہ آپ کا رہے، ان سے پوچھیں کہ ہم خارج اوقات میں کیا پڑھیں؟ یہ بہت اہم بات ہے، ہم دعوے سے نہیں کہہ سکتے، مگر اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے آپ کو ایسے اساتذہ دیے ہیں، اور پھر جوار بھی عطا فرمایا ہے کہ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہمیں سیرت پر کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں؟ صحابہ کرام کے فضائل وخصائص پر کون کون کتابیں پڑھنی چاہئیں؟ اپنی اصلاح کے لیے ہمیں کون سی کتاب پڑھنی چاہیے، جو دستور العمل ہو اور پوری زندگی کے لیے اس میں رہنمائی ہو؟ اور اسلاف کے حالات سے واقف ہونے کے لیے کون سی کتاب پڑھنی چاہیے؟

مادر علمی سے محبت

آپ سے یہ بات بھی کہنا چاہوں گا کہ آپ کو یہ بھی احساس ہونا چاہیے کہ آپ کہاں تعلیم پا رہے ہیں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا جوار ہے؟ یہ ہر جگہ کے لیے ضروری ہے۔

دیوبند میں اگر کوئی پڑھتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ دار العلوم کس نے قائم کیا؟ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، جو کہ قاسم العلوم والخیرات کہلاتے ہیں، اور ایک دور کے بانی ہیں، ان کے حالات سے واقف ہونا چاہیے، اور پھر ان کے بعد ان کے جانشینوں میں، ان میں سب سے بڑھ کر مشہور ومبارک شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ ہیں، جو انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے، انگریزوں نے ان کو گرفتار کیا پھر ان کو مالٹا بھیجا گیا، ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تھے، مولانا عزیز گلؒ اور کوڑا جہان آباد کے- جہاں ہماری قرابت

بھی ہے۔مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحبؒ بھی تھے، ان کا وہیں انتقال ہو گیا، اور یہ حضرات جیل سے رہائی کے بعد واپس آئے، اسی طرح مولانا انور شاہ صاحبؒ جیسا محدث اس کو ملا، اور مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا حکیم الامت اور شیخ طریقت پیدا کیا، مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ شیخ العرب والعجم جو بڑے مجاہد، غازی اور اہل اللہ میں سے تھے۔

اور سہارن پور کے رہنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مدرسہ کس نے قائم کیا ہے؟ یہاں کے سب سے بڑے رہنما اور سرپرست مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھویؒ، پھر ان کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ اور دوسرے جو بڑے بڑے اہل اللہ پیدا ہوئے، جیسے مولانا اسعد اللہ صاحبؒ وغیرہ۔

اسی طرح جو ندوۃ العلماء میں پڑھے، اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ کس نے اس کی بنیاد ڈالی، مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوریؒ، پھر اس کے بعد علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا عبد الحی صاحبؒ جو ہمارے والد اور یہیں کے رہنے والے تھے، پھر مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوریؒ، مولانا مسیح الزماں صاحبؒ، نواب صدر یار جنگ صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحبؒ، اور اس کے مایۂ ناز فرزند علامہ سید سلیمان ندویؒ جن کو فخر ندوہ کہا جاتا ہے، مولانا عبد السلام صاحب ندویؒ، مولانا عبد الباری صاحب ندویؒ، اور اخیر میں مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندویؒ جیسا ماہر قرآن اور عالم ربانی، ان سب کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔

اسی طرح آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کہاں ہیں؟ آپ کس بستی میں ہیں؟ یہ دائرہ شاہ علم اللہ ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں چوٹی کے علماء اور بڑے بڑے مشائخ آنا اپنی سعادت سمجھتے تھے اور فخر سمجھتے ہیں، مولانا حسین احمد مدنیؒ تشریف لائے، کسی نے کچھ کہا تو فرمایا کہ ہمارا تو یہاں چلہ گزارنے کا دل چاہتا ہے، اور ایک رات تو ضرور یہاں گزارنے کو جی چاہتا ہے، جیسا کہ میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے حجرہ میں، اور مولانا الیاس صاحبؒ یہاں آئے تو اپنی حیرت کا اظہار کیا، اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے سامنے کہا کہ شاہ علم اللہ صاحبؒ تو بہت بڑے آدمی تھے، پھر شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ جو ہمارے شیخ

ومربی اور مرشد تھے، تشریف لائے اور بڑے ادب واحترام سے رہے، اور بہت ہی خوش ہوئے، مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ یہاں سے گزرے تو رائے بریلی کے اسٹیشن پر بڑے بلند الفاظ کہے، مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ نے ہمیں خود سنایا کہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کی گاڑی یہاں کھڑی تھی، پتہ نہیں کیا بات ہوگئی دیر تک ٹھہری تو اُتر کر چلنے لگے، میں ساتھ ہوگیا، مجھ سے فرمایا کہ حضراتِ تکیہ کے انوار یہاں تک ہیں، اور یہاں آنے کا ارادہ فرمایا مگر موقع نہیں ملا، ایسے ہی حضرت شیخ الحدیثؒ ایک سے زائد مرتبہ تشریف لائے اور شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ تشریف لائے۔

تو آپ کو واقف ہونا چاہیے کہ شاہ علم اللہ صاحب کون تھے؟ کب پیدا ہوئے؟ تعلیم و تربیت اور اصلاح کا تعلق ان کا کن سے تھا؟ ان کے بارے میں ان کے معاصر کیا کہتے تھے؟ کیا فیض ان سے پہنچا؟ کون سی ان کی خصوصیات تھیں؟ سب سے بڑھ کر عقیدۂ توحید اور اتباع سنت تھی، یہی اس جگہ کا پیغام بھی ہے، اور اس جگہ کا خاصہ بھی ہے، اور یہاں کی ہوا میں جو بات ہونی چاہیے خدا کرے وہ اب بھی ہو، وہ ہے: توحیدِ خالص ﴿أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾۔

دائرہ شاہ علم اللہ کا پیغام عقیدۂ توحید اور اتباع سنت

دائرہ شاہ علم اللہ کا پیغام عقیدۂ توحید اور اتباع سنت کا پیغام ہے، سارے عالم کے لیے، اور خاص کر ہندوستان کے لیے، اتباع سنت میں تو شاہ علم اللہ صاحبؒ اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ایک واقعہ تاریخ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ اچانک حضور (ﷺ) کی وفات ہوگئی، تو بہت گھبرائے، معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا زوال ہونے والا ہے، گھبرا کر علماء سے پوچھا کہ آج میں نے یہ خواب دیکھا ہے، اللہ خیر کرے، انھوں نے کہا کہ آپ گھبرائیے نہیں، تاریخ لکھ لیں، اسی تاریخ کو شاہ علم اللہ صاحبؒ کا رائے بریلی میں انتقال ہوا ہوگا، اس لیے کہ ان سے بڑھ کر متبع سنت کوئی نہیں، چنانچہ یہاں سے چٹھی گئی، جو واقعات نگار رہا کرتے تھے، انھوں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ آج فلاں تاریخ کو شاہ علم اللہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔

اسی طرح اللہ نے یہاں ایسی ہستی کو پیدا کیا یعنی حضرت سید احمد شہیدؒ کو جن کا ڈنکا اب بھی بج رہا ہے، خاص طور پر ہندوستان میں، ہم تاریخ کے طالب علم بھی ہیں، مصنف بھی ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ کسی ہستی سے اتنا بڑا انقلاب ہوا ہو، اتنی بڑی اصلاح ہوئی ہو جتنی بڑی اصلاح سید صاحب سے ہوئی، تیس لاکھ آدمی تو ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، بیعت کے معنی یہ تھے کہ ابھی ہاتھ پر ہاتھ رکھا، شرک سے نفرت ہوگئی، بدعت کے روادار نہیں رہے، معاصی سے نفرت پیدا ہوگئی، تاریخ میں اس کے بیسیوں واقعات ہیں، وقائع احمدی اور منظورۃ السعداء میں اس طرح کے واقعات بھرے پڑے ہیں۔

بیعت کر لیجیے!

لکھنؤ میں ٹیلہ والی مسجد میں قیام تھا، کچھ لوگ سید صاحب کی ملاقات کو آئے، لوگ کہنے لگے کہ یہ یہاں کیسے آ گئے؟ آپ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ بولے: بڑے بدنام ہیں، ڈاکو ہیں، رہزن ہیں، ان کا یہاں کیا کام ہے؟ آپ نے کہا: کچھ کہنا نہیں، چور آئے اور کہنے لگے: ہم کو بیعت کر لیجیے، فرمایا: جلدی کیا ہے پھر کر لیں گے، کہا: نہیں ابھی کر لیجیے، بیعت ہوئے، اس کے بعد گھر گئے، اسی دن یا ایک دو دن کے بعد ان کی پارٹی کے لوگ آئے، کہا: بہت دنوں سے ہم نے کام نہیں کیا ہے، یعنی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے، آج کل تنگی ہوگئی ہے، چلو کہیں کام کریں، انھوں نے کہا کہ اب نہیں ہوگا یہ کام، پوچھا: کیا بات ہے؟ اب نہیں ہوگا یا کبھی نہیں ہوگا؟ کہا: اب کبھی نہیں ہوگا، کہا: کیا بات ہے؟ بولے ایک بزرگ رائے بریلی سے آئے ہیں، ان کے ہاتھ پر ہم نے بیعت کی ہے کہ ہم چوری نہیں کریں گے، انھوں نے بھی توبہ کی، کہا: ہم بھی بیعت ہو سکتے ہیں؟ کہا: ہاں، وہ بھی بیعت ہوئے۔

ہدایت اور انقلاب

ہدایت کا یہ معاملہ ہے کہ نواب بہادر یار جنگ صاحب نے جو ایک بڑے مصنف ہی نہیں بلکہ بہت بڑے لیڈر اور قائد مقرر تھے، وہ لکھنؤ آئے، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ

حیدرآباد میں رہ چکے تھے، ان سے واقف تھے، بھائی صاحب سے کہا کہ ان کو دارالعلوم گھمانا چاہیے، اوران کا خطاب ہونا چاہیے، ہم ان کو لائے، انھوں نے مسجد کے صحن میں خطاب کیا، تو انھوں نے بہت سی باتیں کہتے ہوئے کہا کہ مولانا کرامت علی صاحبؒ سید صاحبؒ کے بڑے خلفاء میں تھے، مولانا کرامت علی صاحبؒ کے ہاتھ پر میری معلومات کے مطابق دو کروڑ آدمیوں کو ہدایت ملی۔

جب ہم بنگلہ دیش گئے، سفر میں ہمارے ساتھ عزیزان محمد رابع اور محمد واضح اور مولوی سعید الرحمٰن بھی تھے، تو وہاں کے واقف عالموں نے کہا کہ دو کروڑ سے بھی زیادہ لوگوں کو مولانا کرامت علی صاحب کے ذریعہ ہدایت ملی، اور چالیس ہزار سے اوپر آدمی مسلمان ہوئے۔

اور یہ حالت تھی کہ جب سید صاحبؒ رائے بریلی سے کلکتہ جانے لگے، پہلے گنگا کنارے کی بستی ڈلمؤ گئے، پھر وہاں سے دریا سے سفر کیا، ڈلمؤ سے آگے جہاں جہاں جاتے وہاں بس بالکل انقلاب آجاتا تھا، تعزیے کے چبوترے توڑ دیے جاتے تھے، تعزیے توڑ دیے جاتے تھے، لوگ غیر مشروع مراسم سے تائب ہوتے تھے، اور آپس میں جن کی لڑائیاں تھیں وہ اتحاد کر لیتے تھے، بنارس گئے تو اور بھی زیادہ، کلکتہ گئے تو ایک طوفان اٹھا، معلوم ہوتا تھا کہ شہر ہل گیا، شراب خانوں سے انگریزوں نے ٹیکس مانگا، انھوں نے کہا: ہم کہاں سے ٹیکس دیں؟ کوئی بھول کر بھی ہمارے شراب خانے کی طرف نہیں آتا، بولے: کیا بات ہے؟ کہا: جب سے رائے بریلی سے ایک سید صاحب آئے ہیں اسی وقت سے کوئی ہمارے شراب خانے کا رخ ہی نہیں کرتا، انھوں نے کہا: اچھا! اب یہی حالت رہے تو معاف کر دیں گے، اور ان کے جانے کے بعد پھر آنے لگیں تو پھر ٹیکس دینا پڑے گا، ایسے انقلاب کے واقعات تاریخ میں ہیں جو صدیوں میں نظر نہیں آتے۔

تو یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کہاں ہیں؟ اور آپ کو اس پر خدا کا شکر کرنا چاہیے، فخر کرنا چاہیے کہ ہم ایسی جگہ پر پڑھ رہے ہیں جو بالکل اس کے جوار میں ہے، وہاں کی ہوا کے جھونکے یہاں آتے ہوں گے، اور ان شاء اللہ اس میں کچھ نہ کچھ برکتیں بھی ہوتی ہوں گی۔

اور اس کے بعد ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ دو چیزیں ضرور پڑھیے گا، موقع ہو تو یہیں

پڑھ لیجیے، ایک تو ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' اور ایک ''تذکرہ سید شاہ علم اللہؒ''۔ ''تذکرہ شاہ علم اللہ'' بڑے بڑے ادیبوں نے پڑھی، پروفیسر رشید احمد صدیقی تو بہت متاثر ہوئے، تذکرہ شاہ علم اللہؒ، سیرت سید احمد شہیدؒ اور حیات عبدالحیؒ، اگر ہو سکے تو یہاں پڑھ لیجیے، ورنہ نوٹ بک پر لکھ لیجیے کہ انشاء اللہ ہم یہاں سے جانے کے بعد ان کتابوں کو ضرور پڑھیں گے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں کون لوگ پیدا ہوئے تھے۔

دعوت اور پیغام

میرے عزیزو! یہاں کا پیغام آپ لے کر جائیں، صرف یہاں سے کتابی علم لے کر نہ جائیں، شخصی علم لے کر نہ جائیں، بلکہ یہاں کی دعوت بھی لے کر جائیں، پیغام بھی لے کر جائیں، اور آخری بات یہ کہ یہاں کا مزاج بھی لے کر جائیں، ہر جگہ کا ایک مزاج ہوتا ہے، ہر دعوت کا، ہر ادارے کا، ہر مقام کا ایک مزاج ہوتا ہے، اور یہاں کا مزاج ہے: توحید خالص، اتباع سنت، فرائض کی پابندی اور تبلیغ کا جذبہ، اصلاح کا جذبہ، جہاد کا شوق اور اعلائے کلمۃ اللہ کا ارادہ، اس کے لیے جو کچھ ہو سکے وہ ہم کریں گے، بس یہ سب باتیں ہیں، ان کو ذہن میں رکھ لیں۔

پھر آپ سے کہتے ہیں کہ پختہ استعداد پیدا کیجیے، عبارت صحیح پڑھنا سیکھیں اور سمجھنا سیکھیں، اس کے بعد فرائض میں پابندی، نماز میں خشوع و خضوع ہو، دعا ہو، یہاں بیٹھ کر دعا کریں کہ یہ اولیاء اللہ کا جوار ہے، انشاء اللہ دعا میں اثر رہے گا، اور پھر اس کے بعد یہ کہ استادوں کی خدمت کریں، قدر کریں، ذہن میں کچھ چیزوں کو محفوظ کریں کہ یہاں سے جانے کے بعد یہ کام کرنا ہے، جو کام یہاں نہیں ہو سکا وہ گھر جا کر یا دوسرے بڑے مدرسے میں جا کر کریں گے، اور پھر اس کام کو جاری رکھیں گے، اور یہ کہ دعوت و تبلیغ کا ارادہ کریں کہ یہاں سے یا کسی دوسرے مدرسے سے فارغ ہو کر دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہے، مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرنا ہے، عقائد کی اصلاح کا، اعمال کی اصلاح کا، رسم و رواج کی اصلاح کا کام کرنا ہے، شادی بیاہ کی رسوم، ان کی فضول خرچیاں اور بیجا مطالبے، ان سب کے خلاف

آواز بلند کرنا ہے، خود بھی بچنا ہے اور دوسروں کو بھی بچانا ہے، مسلم پرسنل لا پر جو دست درازیاں ہوتی ہیں، اور اس کے لیے جو خطرات ہیں، ان کا مقابلہ کرنا ہے، اس کی دعا اور کوشش کرنی ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں شرعی قانون پر، شرعی قانونِ ازدواج وقانونِ وراثت پر، پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی رہے، اور جو تنظیمیں، جو انجمنیں، جو ادارے اس کام کو کر رہی ہیں، اس کا بیڑا جنھوں نے اٹھایا ہے، ہمیں ان کا ساتھ دینا ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ جس کا مرکز پٹنہ میں ہے، اور صدر ہمیں بنایا گیا ہے، یا دینی تعلیمی کونسل ہے، یا مجلس مشاورت ہے، ان سب تنظیموں میں، اور پھر تبلیغی جماعت جو ساری دنیا کے لیے عالمی جماعت ہے، اس کے لیے ہمیں کوشش کرنا ہے، اور اسلام کی بقا اور تحفظ اور سر بلندی کے لیے کام کرنا ہے۔(۱)

---

(۱) مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، تکیہ کلاں (رائے بریلی) میں ۱۹۹۷ء میں کی گئی تقریر، یہ تقریر مولانا محمد نفیس خان ندوی اور مولانا محمد زاہد جمشید پوری ندوی نے قلمبند کی، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/جنوری-۱۰/فروری ۱۹۹۸ء)۔

طالب علم- دو اہم ذمہ داریاں

أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم

بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾۔ (۱)

ایک خاص جماعت یا گروہ

میرے عزیزو، بھائیو اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے ابھی سورہ توبہ کی آیت پڑھی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات تو آسان اور ممکن نہیں ہے اور ہر جگہ قابل عمل نہیں کہ اہل ایمان سب کے سب کھڑے ہو جائیں، اپنے سب کام کاج چھوڑ دیں، اور اپنے تمام مشاغل ترک کر دیں، لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ﴾ کہ ان میں سے ہر جماعت، ہر گروہ میں سے کچھ لوگ اس کے لیے کھڑے ہو جاتے ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ تا کہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں ﴿وَلِيُنذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ﴾ اور جب دین کا ضروری علم یہ لوگ حاصل کر لیتے اور ان کو علم ہو جاتا صحیح عقائد اور فرائض کا، اور انہیں معروف و منکر کا فرق معلوم ہو جاتا، اور اللہ کو جو چیزیں پسند ہیں اور جو نا پسند ہیں، اور جو اللہ کی رحمت کو کھینچنے والی ہیں اور اس کی رضا حاصل کرانے والی ہیں، اور جو چیزیں اللہ کو ناپسند ہیں اور اس کی رحمت سے دور کرنے والی ہیں، اور اس کے غضب کو بلانے والی ہیں، ان دونوں کا فرق وہ سمجھ لیتے۔

(۱) سورة التوبة:۱۲۲

دو مقاصد

﴿فَلَوْ لاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ﴾ کا مطلب ہے: ایک جماعت، ایک عنصر اور ایک فریق، ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ اس گروہ کے دو مقاصد اور دو کام ہوں کہ خود دین کی سمجھ حاصل کرلے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر اور خاتم الرسل سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کون سی شریعت نازل کی، اور اس میں توحید وشرک کی کیا تعریف ہے، اور ان کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے، اور پھر معروف ومنکر کا فرق، فرائض کا علم، اللہ تبارک وتعالیٰ کے حقوق کا معلوم کرنا، اور اس کے نبی کے مرتبہ کو معلوم کرنا، اور ان کی شریعت سے محبت، اور حمیت دین کی، اور شریعت پر عمل کرنے کی توفیق، دوسروں کو شریعت کی طرف بلانے کی صلاحیت اور جذبہ، ان سب چیزوں سے وہ پورے طور پر اپنے کو مسلح کرلیں اور تیار ہو جائیں، اور ان سب تقاضوں کو پورا کرلیں تاکہ وہ دین کے مبلغ بن سکیں، اور وہ دین کے محتسب بھی بن سکیں، اور داعی بن سکیں، عامل بنیں پھر داعی بنیں ﴿لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ﴾ تاکہ وہ اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہاں وہ جائیں۔

واپس جانے کا مطلب

واپس جانے کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے ملک سے آئے ہوئے ہوں، وہ دوسرے ملک کو جائیں، بلکہ جو اپنے گھر اور اپنے گاؤں چھوڑ کر آئے تھے، اپنا قصبہ، اپنا قریب کا وطن یا وہی شہر اور گھر کا جو ماحول تھا، اور جو اپنا مسکن تھا، اور جو اعزاء اور رشتہ دار تھے، ان کے ساتھ جو زندگی گزر رہی تھی، عارضی طور پر اس کو چھوڑ کر آئے تھے، ﴿لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ﴾ کہ جب اس فرض سے فارغ ہوکر وہ گھر جائیں، اپنے وطن واپس جائیں، اپنے اہل وعیال کے پاس، اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے پاس پھر واپس جائیں تو ان کو ڈرائیں، ﴿لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ کہ وہ احتیاط کرنے لگیں اور ڈرنے لگیں۔

مدارس کا تذکرہ قرآن میں

اگر پوچھا جائے کہ قرآن شریف میں سب کچھ ہے، ہر طرح کے اس میں علوم ہیں، ہر

طرح کے حقائق اس میں ہیں، اور ہر طرح کی خبریں اس میں دی گئی ہیں، کیا مدارس اور جامعات کا بھی کہیں تذکرہ ہے؟ ہم نے جہاں تک مطالعہ کیا، کہیں نام نہیں دیکھا، نہ جامعہ کے نام سے کوئی چیز ہے، نہ مدرسہ کے نام سے کوئی چیز ہے۔

یہ مدرسے کہاں سے آئے؟ اور کب سے؟ یہ کہاں سے نکالے گئے؟ کیسے ان کو قائم کیا گیا؟ اور یہ دانش گاہیں اور جامعات کب سے قائم ہو گئے؟ یہ تعلیم و تعلم کے مراکز، یہ کتابوں کا مطالعہ، ان میں جو مخصوص علوم ہیں قرآن فہمی کے لیے، حدیث کے لیے، ان کا پڑھنا، ان میں سالہا سال لگا لینا، اپنے کو اس کے لیے وقف کر دینا، اور یکسو ہو جانا، اپنے گھروں پہ نہ کمائی کرنا، اور نہ کوئی دوسرا فن سیکھنا، اور نہ کسی دوسری مشغولیت میں اپنے کو وقف کر دنا، اس کا قرآن مجید میں کہاں ذکر آیا ہے؟ تو ہم کہیں گے اپنے مطالعہ کی بنا پر اور قرآن مجید سے جو توفیق الٰہی سے فہم حاصل ہوا ہے، اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت سے مراد مدارس وجامعات ہیں۔

مدارس وجامعات کا مقصد

اس آیت میں صاف صاف جامعات اور مدارس کی تعریف کی گئی ہے، مدارس وجامعات کا مقصد کیا ہے؟ فائدہ کیا ہے؟ خاص کام کیا ہے؟ کام یہی ہے کہ پہلے دین کی سمجھ حاصل کی جائے، دین کا ضروری علم حاصل کیا جائے، اور شرک وتوحید کا فرق سمجھا جائے، کفر وایمان کا فرق سمجھا جائے، اور سنت وبدعت کا فرق سمجھا جائے، حیات نبوی اور سنت نبوی کا علم حاصل کیا جائے، اور اللہ تعالیٰ کو جو چیز محبوب ہے اس کو معلوم کیا جائے، اور جو چیز مبغوض ہے وہ معلوم کیا جائے، جو چیز اللہ کی رحمت کو بلانے اور کھینچنے والی ہے، ان کا علم ہو، اور جو اللہ کی رحمت سے دور کرنے والی ہے، اور بے برکتی پیدا کرنے والی ہے، اس کا علم ہو، اور انبیاء اور سید الرسل خاتم الرسل (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تعلیم لے کر آئے، اس کا علم حاصل کیا جائے، پھر اس کے بعد کیا کرنا ہے؟ اس کے بعد نوکر ہو جانا ہے، اس کے بعد اور ڈگریاں حاصل کرنا ہے، اور اس کے بعد کسی چیز میں مہارت حاصل کرنا ہے، پھر ایک دوسرے علمی

مرکز سے اپنا تعلق قائم کرنا ہے، مصر چلا جانا ہے، کسی دوسرے ملک چلا جانا ہے، یہ جائز ہے، ممکن ہے اور ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات یہ مستحب ہو، لیکن یہ بھی اسی مقصد کی خاطر کہ علم میں رسوخ اور اتقان پیدا ہو، اور اس میں اور توسع پیدا ہو، لیکن کرنا کیا ہے؟ صاف کہہ دیا کہ یہ سب نوکریوں کے لیے نہیں کیا جارہا ہے، یہ سب شہرت کے لیے نہیں کیا جارہا ہے، یہ سب سیاسی قیادت کے لیے نہیں کیا جارہا ہے، یہ سب ناموری پیدا کرنے کے لیے نہیں کیا جارہا ہے، یہ سب عیش وآرام کے لیے نہیں کیا جارہا ہے، ﴿لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ﴾ ''تاکہ اپنی قوم کو ڈرائیں جاکر جب ان کے پاس واپس جائیں،'' واپس جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنا لمبا سفر کر کے واپس جائیں، عربی میں ''رَجَعَ'' کا لفظ مسافت قریب کے لیے بھی ہے اور مسافت بعید کے لیے بھی ہے، بلکہ ایک ہی جگہ کے لیے بھی ہے، مثلاً صبح ایک کام کیا پھر دوپہر دوسرا کام کیا، اس کو بھی رجوع کہتے ہیں، یا پھر اس کام کی طرف پلٹے، تو اس کو بھی رجوع کہتے ہیں، یہ قرآن مجید کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے، اس میں بتادیا کہ دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ ایسا نظام ضروری ہے، ایسا انتظام ضروری ہے، نظام نہ کہیے اب نظام سے ذہن بہت سی چیزوں کی طرف چلا جاتا ہے جو اس وقت کی ایجاد ہے، لیکن ایسا انتظام ضروری ہے کہ امت اسلامیہ میں ہر دور میں، ہر جگہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو پہلے اپنے کو وقف کردیں، اپنے کو فارغ کرلیں، ضروری علم دین حاصل کرنے کے لیے، اور شریعت کا جو مطلوب اور انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت کا جو مقصد ہے، اور نجات جس پر موقوف ہے، جس سے نجات حاصل ہوتی ہے، اور قیامت میں جس کے متعلق سوال ہوگا، ان سب کو پہلے پورے طور پر جاننے کی کوشش کریں۔

تفقه في الدين کا مفہوم

﴿لِيَتَفَقَّهُوا﴾ یہ نہیں کہا کہ ہوا لگ جائے، ذرا سی شُد بُد پیدا ہو جائے، اور ذرا سا اس کا اجمالی علم ہو جائے، سنی سنائی بات، کسی وعظ میں گئے تھے، وہاں بھی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اور آدمی کتاب میں پڑھتا ہے تو اس سے بھی معلومات حاصل ہو جاتی

ہیں، یہ نہیں، بلکہ قرآن مجید میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ بہت بڑی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے والا ہے، اور بہت قابل توجہ اور قابل غور لفظ ہے: ﴿لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے، دین میں ایسی سمجھ حاصل کرے کہ مسئلہ بتلا سکے، حکم شرعی سنا سکے، وہ معروف ومنکر کا فرق جان سکے، وہ سنت وبدعت کا امتیاز معلوم کر سکے، اور جب کوئی مسئلہ پیش آجائے زندگی میں، تو جہاں پر شریعت کا حکم معلوم کرنا ہے کہ حلال ہے کہ حرام، جائز ہے کہ ناجائز، اس کا کیا مرتبہ ہے، اور نہ کرنے پر کیا سزا ملے گی، اور کرنے پر کیا ثواب ملے گا، اس کا بھی جواب دے سکے، ان سب پر یہ لفظ حاوی ہے، ﴿لِيَتَفَقَّهُوا﴾ ''تا کہ دین کی سمجھ حاصل کرے''، اور پھر قرآن مجید میں بڑی صفائی سے کہا گیا کہ مدارس کو، مدارس کے علماء کو، اور پھر اساتذہ کو، طلبہ کو، اس طرح ذہن میں رکھنا چاہیے، ذہن میں اتار لینا چاہیے، اور دل اور دماغ کی تختی پر لکھ لینا چاہیے کہ اس تفقہ کا نتیجہ، اور اس تفقہ کا انجام، یا اس تفقہ کا انعام، اس تفقہ پر گویا اللہ تعالیٰ کی رضا کا حاصل ہونا، اور سند ملنا، یہ تفقہ ہے، اس کا ایک ہی مقصد ہے: ﴿لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ﴾ ''تا کہ اپنی قوم کو ڈرائیں جب واپس جائیں''۔

ایک بڑی کمی

ہم جو مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، اول تو وہ تعلیم تفقہ کی حد تک نہیں ہے، یہ ایک بڑی کمی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ تفقہ کی حد تک وہ تعلیم ہونی چاہیے، زبان سیکھ لینا، عربی بول لینا، عربی کتاب آسانی سے پڑھ لینا، ابواب پڑھ لینا، کسی عرب سے بات کر لینا، یہ تفقہ نہیں ہے، اسی طریقہ سے بہت ہی ڈھونڈ کر اور تلاش کر کے وہ مسئلہ کی کتاب نکالی جائے یا فتاوی کا کوئی مجموعہ حاصل کیا جائے، اس میں دیکھا جائے، اس کی حلت وحرمت کا کیا حکم ہے؟ اس کا شریعت میں کیا مقام ہے؟ کیا شریعت میں اس کا درجہ ہے؟ یہ تفقہ نہیں، بلکہ اس میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے پڑھے ہوئے علم سے اور اپنے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے سے، اور کتابوں کا مطالعہ کرنے سے، اور غور اور محنت کر کے یاد کرنے سے،

اس میں یہ بات پیدا ہو کہ اس میں تفقہ پیدا ہو جائے، دین کی سمجھ آجائے اس میں، کہ اس کا کیا مقام ہے شریعت میں، اور اس کا کیا درجہ ہے اور اس کا کیا نتیجہ ہے، کیا اس کی جزا و سزا ہے؟ اور اللہ نے جو شریعت کا بنانے والا ہے، اور اتارنے والا ہے، اس شارع نے جو شریعت کو پیش کرنے والا ہے، اور مسائل کا استنباط کرنے والا ہے، اس نے اس کو کس نظر سے دیکھا ہے؟ اور اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اگر اچھی چیز ہو تو اس کا کیا انعام ملنے والا ہے؟ اور اگر غلط اور خلاف شریعت ہے تو اس کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ یہ سب اس کو معلوم ہو۔

تفقہ کا لفظ عربی میں بڑا قابل احترام اور بڑا عالی مرتبہ ہے، ہر چیز کو تفقہ نہیں کہتے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی تھی: "اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ" [(۱)] "اے اللہ! اس کو فقیہ بنا دے دین میں"، پہلے حکم دیا کہ دین کی سمجھ حاصل ہو، دین پر کسی درجہ میں، دین کے مبادی پر، اور دین کے جو منصوصات ہیں، اس پر حاوی ہو جائے، مثلاً عشاء کا وضو ہم نے اس طرح کیا، کیا وضو ہو گیا؟ ذرا ٹھہر جاؤ، ہم کتاب دیکھ لیں، ہم ذرا بہشتی زیور دیکھ لیں، ہم ذرا سا فلاں کتاب دیکھ لیں، آپ بتا سکیں کہ وضو میں کیا غلطی ہے، اس سے وضو ہوا یا نہیں؟ نماز میں ہم سے یہ غلطی ہو گئی، آپ جواب دے سکیں، اگر باریک مسئلہ ہو، قلیل الوقوع بلکہ نادر الوقوع مسئلہ ہو، تو بے شک آپ پھر فتاوی کی کتابیں دیکھیں، اور بڑی کتابیں دیکھیں، وہ سب لگ بھگ بیسیوں نہیں، سیکڑوں کی تعداد میں ہیں، لیکن روز مرہ کے مسائل میں آپ کے پاس خود علم ہو اپنا ذاتی کہ یہ عمل صحیح ہوا کہ نہیں ہوا، اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس لیے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ دین کی سمجھ حاصل کی جائے۔

اللہ نے آزاد نہیں چھوڑا

پھر اللہ میاں نے آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ دین کی سمجھ حاصل ہو گئی، جاؤ گھر رہو، اور مزے کرو، آرام سے کھاؤ، عزت حاصل کرو، نوکریاں کرو، یا سیاست کے میدان میں آجاؤ، یہ نہیں، اس کے بعد یہ شرط لگائی ہے، وہ بہت سوچنے کی بات ہے، کبھی ہم میں سے بہت سے

(۱) رواه البخاري، كتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء، حديث رقم ۱۴۳

بھائیوں کو اس پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا، کہ مدارس کا اصل فائدہ کیا ہے؟ ﴿وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ﴾ ''تا کہ ڈرائیں اپنی قوم کو جب وہاں واپس جائیں،'' شرک سے ڈرائیں، کفر کی باتوں سے ڈرائیں، معصیتوں سے ڈرائیں، خدا کی نافرمانیوں سے ڈرائیں، بدعات میں پڑنے سے ڈرائیں، رسوم کی پیروی سے ڈرائیں، اسراف سے ڈرائیں، اصلاح رسوم اور اصلاح معاشرہ کی دعوت دیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟

یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیسی شادیاں ہو رہی ہیں، یہ کیسے جہیز کے مطالبے ہو رہے ہیں کہ ایک لاکھ روپے لائے، ایک لاکھ روپے کا جہیز لائے، پچاس ہزار کا جہیز لائے، اور پھر اس کے بعد اگر وہ بہن جہیز نہ دے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا جائے، یہاں تک ہونے لگا ہے ہمارے برادران وطن میں کہ ایک اسکوٹر نہ لانے پر زہر دے دیتے ہیں، مار ڈالتے ہیں، اور اس طریقے سے اور بدعات بھی شامل ہوگئی ہیں ہماری شادی بیاہ کی تقریبات میں، اور اس کے علاوہ کتنے لوگ قبر پرستی میں مبتلا ہیں، کتنے لوگ صالحین سے استغاثہ کرتے ہیں، صاف صاف دعا کرتے ہیں، ہمیں بیٹا دیجیے، ہمیں روزی دیجیے، ہمارا کام کرا دیجیے، قبور و مزارات پر وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو دوسرے مذاہب میں عبادت گاہوں میں ہوا کرتا تھا، اور کھلے طریقے پر استغاثہ کیا جاتا ہے، دعا کی جاتی ہے، اس کے لیے ہمارا ذہن صاف ہو جائے کہ یہ شرک ہے۔

پوری غلامی صرف خدا کی ہوگی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ﴿أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ﴾ [سورة الزمر:۳] ''یاد رکھو! پوری اصل عبادت اور فرمانبرداری اور غلامی جو بھی ہے وہ صرف خدا کی ہے،'' ہم خدا کے سوا کسی کے پورے غلام نہیں، ہم سو فیصدی اسی کی بات ماننے کے مکلّف اور مامور ہیں، آپ سب جانتے ہیں کہ جس مسلک سے ہمارے ان جامعات اور مدارس کا تعلق ہے، وہاں سب سے اہم چیز تصحیح عقیدہ اور شرک اور بدعات سے نفرت پیدا کرنا تھی، اگر یہ بات نہ پیدا ہوئی تو یہ

سب مدارس ناکام ہیں، اور وقت کا ضائع کرنا ہے، اگر آپ عابد اور زاہد بھی بن جائیں اور اگر آپ عربی زبان پر ایسے قادر ہو جائیں کہ عرب بھی عش عش کریں اور تعریف کریں، اور آپ بڑی سے بڑی تنخواہ پائیں سعودی عرب اور خلیج میں جا کر، اگر آپ کا ذہن نہیں بنا ہے، آپ کا عقیدہ صحیح نہیں ہوا ہے، اور آپ کے اندر توحید کی دعوت دینے اور اصلاح معاشرہ کا جذبہ نہیں پیدا ہوا، اور شرک و بدعت اور سنت و بدعت کا فرق، کفر و ایمان اور محظورات اور مباحات کا فرق آپ کو نہیں معلوم، تو یہ سب تعلیم بیکار گئی اور آپ نے کوئی مفید کام نہیں کیا، انگریزی پڑھ کر کے آپ کماتے اس سے زیادہ آپ کو تنخواہ ملتی، فائدہ ہوتا۔

توحید خالص کی دعوت دیں

اصل یہ ہے کہ آپ کا عقیدہ صحیح ہو، صحیح مسلک آپ اختیار کریں اور اس کے بعد پھر اپنا فرض سمجھیں کہ آپ جہاں جائیں، جس بستی اور جس شہر سے آپ کا تعلق ہو، جس معاشرہ، جس سوسائٹی اور جس طبقے سے آپ کا تعلق ہو، آپ وہاں توحید خالص اور دین پر چلنے کی دعوت دیں، اور توحید و شرک اور سنت و بدعت کا فرق بتائیں۔

ہمارے معاشرہ میں ہمارے ہم وطنوں کی اکثریت، جس کے ساتھ ہم سیکڑوں برس سے رہ رہے ہیں، اس کے جو اثرات آ گئے ہیں، یعنی دولت پرستی کے اثرات، اس کی وجہ سے یہ ملک تنگ ہو رہا ہے، انسان کی جان لی جا رہی ہے، ایک شریف گھرانے کی ایک شریف معصوم لڑکی کے ساتھ رشتہ ہوا اور اس کے بعد صرف پیسے نہ لانے اور مطلوب جہیز نہ لانے پر زہر دیا گیا، آگ لگا دی گئی، اس سے بڑھ کر سفاکی، اس سے بڑھ کر حیوانیت اور اس سے بڑھ کر کمینگی کیا ہو سکتی ہے؟

مدارس کا فائدہ

مدارس میں پڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ عقائد درست ہوں، خود شریعت اور سنت پر چلنے کی کوشش کریں، اور حتی الامکان سنت پر چلیں، اور اس کے بعد ہم داعی بنیں اس مسلک کے،

جس کے لیے انبیائے کرام کی بعثت ہوئی ہے۔

مدارس نوکری دلانے کے لیے قائم نہیں ہوئے

ہم آپ سے صاف کہتے ہیں کہ یہ مدارس نوکری دلانے کے لیے قائم نہیں ہوئے ہیں، ہرگز نہیں، اگر نوکری دلانا تھا تو کافی تھی یونیورسٹیاں، کئی مسلم یونیورسٹیاں ہیں، اسلامی کالجز ہیں، اور یہ سائنسی علوم ہیں، اور غیر ملکی زبانیں Foreign Languages ہیں، اور خاص کر انگریزی ہے، یہ سب اس لیے ہے کہ نوکری حاصل کی جائے۔

بہت بڑی غلط فہمی

طالب علموں کو صرف اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ خود خدا کو پہچانیں، اس کے رسول کو جانیں، اور شریعت کا علم حاصل کریں، اور سب سے پہلے عقائد، پھر اس کے بعد فرائض اور اس کے بعد پھر سنن اور اخلاق نبوی کی پیروی کرنا، اور اپنی زندگی کو شریعت کے قالب میں ڈھالنا، اور دوسروں کی زندگی اس قالب میں ڈھالنا، اور جو چیزیں خدا کے غضب کو بلانے والی ہیں، عقائد فاسدہ اور عقائد مُضَلّلہ ہیں، ان سب سے بڑھ کر کفر و شرک، اس کے بعد پھر بدعات، ان سب سے بچانا ان مدارس کا کام ہے، اسی لیے ہم نے اپنے مدارس میں ایسی کتابیں بھی داخل کی ہیں جن سے صحیح عقیدۂ توحید کی تعلیم ہو، اور اس کی حقیقت سامنے آجائے ﴿أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾، ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ [(۱)]، اس کا کام پیدا کرنا بھی ہے، اس کا کام انتظام کرنا بھی ہے، ایک بڑے گروہ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا، لیکن اس نے اس کے بعد بہت سے شعبے دوسرے لوگوں کے حوالہ کردیے، تم اولاد دینا، تم روزی دینا، تم بیمار کرنا، تم شفا دینا، ہمارے عوام اور بہت سے طبقوں میں یہ خیالات ہیں کہ اولاد ان بزرگ سے ملے گی، اور اس کے لیے وہاں چادر چڑھاؤ، وہاں شمع جلاؤ، اور اس کے لیے وہاں دہائی دو، ایسا ہرگز نہیں ہے، ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ سب کام خدا کا ہے، پیدا کرنا بھی اور انتظام چلانا بھی۔

(۱) سورة الأعراف: ٥٤

یہ کوئی تاج محل نہیں ہے

یہ کوئی تاج محل نہیں ہے، جیسے شاہجہاں نے بنادیا تھا، اور اس کے بعد وہ چلا گیا دنیا سے، اب وہ لوگوں کے رحم وکرم پر ہے، چاہے تاج محل پر کچھ لکھ دیں، داغ ودھبہ لگادیں اور توڑ دیں، تو شاہجہاں بے بس ہے، اب کچھ نہیں کرسکتا، یہ شاہجہاں کا بنایا ہوا تاج محل نہیں ہے، یہ اللہ میاں کا وہ کارخانہ ہے جو اللہ میاں نے بنایا بھی اور ہمیشہ چلاتے رہیں گے، اور ذرا بھی نہیں ہل سکتا اپنی جگہ سے بغیر خدا کی اجازت کے، تو یہ معجزہ ہے قرآن مجید کا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ہم سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ یہ بتایئے کہ دینی تعلیم کا اتنا اہتمام آپ کے یہاں ہے، لاکھوں روپیہ خرچ کیا جارہا ہے، جگہ جگہ مدرسے ہیں، جگہ جگہ جامعات ہیں اور عربی پڑھائی جارہی ہے، یہاں ضرورت نہیں ہے ہندوستان میں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ کیسی بڑی بڑی کتابیں لڑکوں کے ہاتھ میں ہیں کہ ان سے اٹھنا بھی مشکل ہے، اور وہ کتابیں اٹھارہے ہیں، پڑھ رہے ہیں، آخر یہ سب کس لیے؟ ہم کہیں گے کہ یہ اس آیت کی تفسیر ہے: ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾۔

دونوں چیزیں ہونی چاہئیں

یہ دونوں چیزیں ہونی چاہئیں اور ان میں سے ایک چیز دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہے، ﴿لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ﴾ جب ہوگا جب ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ ہوگا، اور ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ کے بعد ﴿لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ﴾ ہوگا، اور اگر یہ نہیں ہوگا تو پھر وہ جو کچھ پڑھا لکھا ہے آپ نے، وہ کافی نہیں ہوگا، اللہ کے یہاں سوال ہوگا کہ تم نے پڑھا تھا، تم کفر واسلام کا فرق جانتے تھے، اور تم حلال وحرام کا فرق جانتے تھے، تم سنت وبدعت کا فرق جانتے تھے لیکن تم نے نہ کہیں ٹوکا، نہ کہیں روکا، نہ کہیں تم نے اشارہ کیا،

نہ تم نے کہیں تبلیغ کی، اس کا جواب دو! تم نے کس لیے پڑھا تھا؟ کیوں سات برس آٹھ برس لگائے تھے دارالعلوم دیوبند میں، مظاہر علوم میں یا ندوۃ العلماء میں، یا آپ کے یہاں جامعہ میں، اور پھر یہاں سے پڑھ کر آپ ندوہ گئے، وہاں پھر کیا حاصل کیا؟ خدا کے یہاں جواب دینا ہوگا کہ جو کچھ پڑھا تھا، اس کا ہم نے کیا حق ادا کیا؟ حدیثوں میں صاف صاف آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ ہم نے تمہیں رزق دیا تھا، اس کا کیا حق ادا کیا؟ ہم نے تمہیں دین کی سمجھ دی تھی، اس کا کیا حق ادا کیا؟ زندگی دی اس کا کیا حق ادا کیا؟

دینی تعلیم کے تقاضے کی تکمیل کیسے ہو؟

تو بھائیو! بس اتنا کافی ہے اگر آپ سمجھ لیں کہ یہاں مدارس میں اس لیے آتے ہیں کہ پہلے خود دین کی سمجھ حاصل کریں، عقیدہ بھی صحیح ہو، اور مضبوط بھی ہو، اور ہمیں اس عقیدہ پر فخر بھی ہو، اور اس عقیدہ پر ہمیں غیرت بھی آئے، اس عقیدہ پر ہم اصرار کریں، اور اس کے خلاف شرک و بدعت سے ہم بچیں، اور خاص طور پر شرک کو برا سمجھیں، یہاں جنوب کا ہم زیادہ حال نہیں جانتے، لیکن ہم پورے ہندوستان میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں، ہر جگہ جاتے رہتے ہیں، کہیں تو مشرکانہ اعمال ہیں، کہیں بدعات ہیں، کہیں منکرات ہیں، کہیں معاصی ہیں، کہیں اسراف ہے، اور کہیں معاشرہ کی خرابی ہے کہ اب ہمارے یہاں کی تقریبات میں دین کی بنیادی تعلیمات کا قطعی لحاظ نہیں کیا جاتا، بلکہ ایسے مواقع پر دین کو الگ کر دیا جاتا ہے، ہمیں چاہیے کہ پورے دین کو اپنی زندگی میں داخل کریں، اور پورے طور پر اس کی تعلیمات کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھال دیں، تب ہی ہم دینی تعلیم کے تقاضے کی تکمیل کر سکتے ہیں۔(۱)

---

(۱) بھٹکل میں کی گئی ایک اہم تقریر جسے عدنان قاضی نے قلمبند کیا، ماخوذ از ''ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام''، ص: ۲۰۲ تا ۲۱۳۔

آج آپ سید احمد شہیدؒ کی دعوت کے امین بنائے جارہے ہیں

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا، فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ، وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ، وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ، ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾۔ (۱)

خاندان صادق پور کی خصوصیت

حضرات اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ! میں دو باتیں بتانا چاہتا ہوں، ایک تو یہ کہ بچپن سے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گھٹی میں جن لوگوں کے نام محبت وعظمت کے ساتھ پڑے، اور یہ کوئی مبالغہ نہیں کہ واقعی گھٹی میں پڑے، ان میں حضرت سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے یارانِ باثقہ، مجاہدین باصفا کے علاوہ، کہ یہ گھر کی چیز تھی، حضرت مولانا ابومحمد ابراہیم صاحب کا نام ہے، اور جب پڑھنے لکھنے لگا تو مولانا عبدالعزیز صاحب کا نام اس میں شامل ہوا، حضرت مولانا ابومحمد ابراہیم صاحب کا ہمارے خاندان سے بڑا قریبی تعلق رہا ہے، ہمارے جدِّ مادری سید ضیاء النبی صاحب جو حضرت سید صاحبؒ کے سلسلہ کے آخری بزرگوں میں سے صاحب نسبت وصاحبِ باطن تھے، ان کے پاس وہ آیا کرتے تھے، اور خود میرے گھر میں جو انقلاب آیا، وہ حضرت مولانا ابراہیم صاحب کی تقریر سے آیا۔

---

(۱) سورۃ فاطر:۳۲

میری والدہ سناتی تھیں کہ ہمارے خاندان میں جدید تعلیم کا رواج تھا، میرا دادیہال -الحمدللہ- خالص مولویوں کا خاندان ہے، اوراس میں جائداد وزمین نہ ہونے کے برابر ہے ،لیکن میرے نانیہال کا بڑے زمینداروں میں شمار ہوتا تھا، اوراگرچہ بزرگوں کے اثرات چلے آرہے تھے،لیکن پھر بھی ہر چیز اپنا ایک اثر رکھتی ہے، إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه، زمینداری آئی اور بڑی زمینداری آئی، اور میں یہ بھی عرض کردوں کہ اس کا شجرۂ نسب بہار سے جاملتا ہے،اورآپ ہی کے قریب کے ضلع مظفر پور سے ملتا ہے، میرے جدِ مادری، میری والدہ کے حقیقی دادا مولوی سعید الدین صاحب رائے بریلوی جو سید صاحب سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، وہ یہاں رہے، انھوں نے وکالت کی احتیاط کے ساتھ جو اس زمانے میں ممکن تھی، اس سے مظفر پور میں جائداد پیدا کی، مجھے بچپن سے یہ بات معلوم تھی، میں مظفر پور کا نام شروع سے سنتا تھا،تو جب مظفر پور سے میں گزر رہا تھا،تو وہ یاد تازہ ہوگئی،تو زمینداری کے سواد پڑے،لیکن مولانا ابراہیم کی تقریر سے دنیا بدل گئی۔

مولانا ابومحمد ابراہیم صاحب ان لوگوں میں تھے جو عمل بالحدیث کے ساتھ تعلق مع اللہ اورنسبتِ باطن رکھتے تھے،اور یہ خصوصیت خاندانِ صادق پور کی ہے، اور صادق پور کا سلسلہ سید صاحب کی تحریک سے جاملتا ہے۔

سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی خصوصیات

حضرت سید صاحب کی تحریک چار چیزوں کی جامع تھی:

۱:-توحید خالص ﴿أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ (۱)

۲:- اتباعِ سنت- آپ مولانا ولایت علیؒ کے حالات پڑھیے، مولانا یحییٰ کے حالات پڑھیے، اولیائے متقدمین کے حالات آپ کونظر آئیں گے، تزکیۂ نفس اورتقویٰ کا تذکرہ جو آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں، ان کی زندگی میں آپ کونظر آئے گا، میں سچ کہتا ہوں، ان کی سیرت پڑھنے سے آپ کی نمازوں کی کیفیت بدل جائے گی، میں نے خود اس کا بارہا تجربہ کیا ہے۔

(۱) سورۃ الزمر:۳

۳:-نسبت مع اللہ، دوام ذکر اور خدا کے ساتھ ہر وقت تعلق۔

۴:- اعلائے کلمۃ اللہ، جو اگر کبھی جہاد بالسیف کا تقاضا کرے تو جہاد بالسیّف، جہاد و قتال میں جو نسبت ہے عموم و خصوص کی، اہلِ علم جانتے ہیں، قتال اخص ہے جہاد سے، جہاد کبھی کبھی قتال کی نوع میں ظاہر ہوتا ہے، اس وقت وہی افضل جہاد ہوتا ہے، لیکن جہاد اس سے وسیع ہے، وہ بغیر سیف کے بھی ہوتا ہے، اور مدّتوں ہوتا رہتا ہے، یہ سب جہاد میں شمار ہوتا ہے، غرض سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کی جماعت ان چار چیزوں کی مجموعہ تھی۔

ہم اپنا احتساب کریں

میں نے دیوبند کے جشن صد سالہ میں الفاظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ بات کہی کہ ان جماعتوں کو جن کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی جماعت سے ہے، اور حضرت سید صاحب کی جماعت سے، خواہ وہ جماعتیں اہل حدیث حضرات کی ہوں، یا ان میں سے ہوں جو اپنے آپ کو دیوبندی کہلاتے ہیں، ان سب جماعتوں کو ہمیشہ یہ احتساب کرتے رہنا چاہیے کہ ہم اس سے منحرف تو نہیں؟ یا خدانخواستہ ہم اس سلسلے میں ﴿أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (۱) کے تو مرتکب نہیں ہو رہے ہیں؟ یا ہم نے ایک جُزو کو پکڑ لیا اور دوسرے جُزو کو چھوڑ تو نہیں دیا؟ یہ اسلاف کی امانت ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس وقت کی پیش کی گئی رپورٹ میں اس کی طرف بلیغ انداز میں اشارے بھی کیے گئے۔

تو میں ایک بات عام جماعتوں سے یہ کہتا ہوں کہ سید صاحبؒ کی جماعت کی یہ جو چار خصوصیات تھیں، توحید خالص اور اتباع سنّت کا خاص رنگ، یعنی احادیث کا تتبع اور ان پر عمل کرنے کی کوشش، اس میں آپ میں اور متبعین سنت کے دوسرے گروہوں میں لَوْن کا تھوڑا سا فرق تو ہو سکتا ہے، اجتہاد کا فرق تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ سب اتّباع سنت کے قائل ہیں، عامل ہیں، اور اس کے لیے کوشاں ہیں، اور تیسری چیز تعلق مع اللہ ہے، یعنی عوام کے تعلق سے کچھ زیادہ تعلق، ایک طرح کا تعلق اور عمومی ولایت تو ہر مسلمان کو حاصل ہے، جیسا کہ محققین اور عارفین کہتے ہیں کہ ہر مسلمان کو ولایت عامہ حاصل ہے، لیکن اللہ کے ساتھ خصوصی ولایت اور اس کے

(۱) سورة البقرة:۸۵

ساتھ محبت جسے قرآن میں کہا گیا ہے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهُ﴾، ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ اور کہا گیا: ﴿وَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ﴾، یہی چیز عمر بھر اس جماعت کا شیوہ رہیں۔

دستار بندی کا مطلب

سن لیجیے! میں ایک مؤرّخ اور اس جماعت کے ایک امین کی حیثیت سے آپ کو بتلا رہا ہوں کہ یہ جو آپ کے اوپر دستار باندھی جارہی ہے، آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کے ساتھ کیا کیا چیزیں بندھ گئیں، اور جو خصوصیات ذکر ہوئیں، وہ ساری چیزیں اس دستار کے باندھنے میں آگئیں، اگر کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتو وہ دیکھ سکتی ہے، وہ ساری چیزیں اس دستار کے تاروپود اور تانے بانے میں ہیں، آپ کو اس دستار کے مشتملات اور مضمرات کی حفاظت کرنی ہے، اس دستار کے بندھنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ بالکل فارغ ہو گئے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چاروں چیزوں کے لیے آپ کو پوری زندگی وقف کرنی ہے، اور انھیں زندہ کرنا ہے، انہیں چاروں چیزوں کے ساتھ اللہ کا وہ مقبولیت کا معاملہ تھا، انہیں خصوصیات کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کے متبعین میں وہ تاثیر اور کیمیا اثری رکھی تھی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔

مولانا سید محمد علی رامپوریؒ کا واقعہ

میں ابھی مدراس گیا، وہاں ''الذكر الجلي في كرامات السيد محمّد علي الرامپوري'' کا ایک نایاب نسخہ مجھے ملا، حضرت مولانا سید محمد علی صاحبؒ سید صاحب کے کبار خلفاء میں سے تھے، میں پڑھ کر حیران تھا کہ یا اللہ! کیسی تاثیر ملی تھی حضرت سید صاحبؒ کو اور ان کی جماعت کے متبعین کو، اللہ اکبر، ایک شخص کا انتقال ہو رہا ہے، کلمہ نہیں نکل رہا ہے، سارا گھر پریشان ہے، کوشش کی جارہی ہے، لیکن زبان سے کلمہ نہیں نکل رہا ہے، حضرت مولانا سے ذکر کیا گیا، انھوں نے کہا کہ گھبرائیے نہیں، میں ابھی چلتا ہوں، تو ان سے لوگوں نے کہا کہ بدعتیوں کا گھر ہے، آپ کے ساتھ بہت برا معاملہ کیا جائے گا، آپ نے فرمایا: اچھا کوئی بچہ ہے اس گھر کا، اس کو بلا دیجیے، بچے کو بلایا گیا، اور پھر اس سے کہا کہ دیکھو، سرہانے کھڑے ہو کر یہ تلقین کرو، تلقین کرتا تھا کہ وہ زور زور سے ''لا إلٰهَ إلّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ

الـلّٰـهِ ‘‘ کہنے لگے، سارا گھر گونج گیا، لوگ حیران تھے کہ کیا وجہ ہے؟ لکھا ہے کہ جو لوگ وہاں تھے، کہنے لگے کہ دیکھو جو لوگ صحیح سلسلہ میں داخل ہوتے ہیں ان کا خاتمہ کس طرح ہوتا ہے، دیکھو ہم اس طرح کلمہ پڑھتے ہیں، ہم اس طرح ایمان کی دعوت دیتے ہیں جیسے ایک ہوا چل گئی ہے، انقلابِ عظیم آ گیا، معاصی سے نفرت، بدعات سے اجتناب، ابھی شرک سے توبہ کی ہے، ابھی ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے، اور آن کی آن میں شرک سے ایسی گھن آنے لگی کہ جو کسی گندی سے گندی چیز سے آتی ہے، یہ سب ان چار چیزوں کے اجتماع کا اثر تھا، اور اصل بات یہ ہے کہ اللہ کو ان سے کام لینا تھا۔

تو عزیزو! ایک بات تو یہ ہے کہ اس دستار کا یہ مطلب نہیں کہ صرف پڑھنے پڑھانے بیٹھ جاؤ، بلکہ ان خصوصیات کو پوری ملت اسلامیہ کی طرف منتقل کرو، میں دینی جماعتوں اور ان کی تاریخ اور ان کی تاثیر سے بیگانہ نہیں ہوں ع

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے

میں نے بہت سی جماعتیں دیکھی ہیں، لیکن واللہ اس جماعت جیسی تاثیر میں نے کہیں نہیں دیکھی، یہ تاثیر اور قبولیت توحید خالص، اخلاص اور اتباع سنت کا کرشمہ تھی۔

عزیزو! تم اس کی کوشش کرو کہ اس کا کوئی حصہ تمہیں بھی ملے کہ اس میخانہ کا محروم بھی نہیں ہے، ان کی محبت اور ان کے مشن کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ جتنے مدرسے اور مسلک ہیں، یہ صرف پڑھنے پڑھانے کے کارخانے نہیں ہیں، حضرت سید سلیمان ندوی نے مولانا گیلانی سے کہا تھا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ مولانا نانوتویؒ نے اس مدرسہ کو پڑھنے پڑھانے کے لیے قائم کیا تھا؟ یہ چھاؤنی تھی چھاؤنی! جب ۱۸۵۷ء میں ہم نے سیاسی طور پر شکست کھائی، تو ہم نے اس کی تلافی کے لیے قلعے بنائے، یہاں سے تیار ہو کر فوج نکلے گی جو ملت اسلامیہ کو بچائے گی، جو زمین قبضہ سے نکل گئی ہے وہ زمین واپس لائے گی۔

جاہلیت ہر دور میں اپنا آشیانہ بناتی ہے

باتیں تو کہنے کی بہت سی ہیں، لیکن میں آپ سے خاص طور پر ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، خدا کرے کہ اپنے اصلی اور صحیح رنگ میں سمجھی جائے، وہ یہ کہ ہر دور میں جاہلیت اپنے

آشیانے بناتی ہے، کبھی شرک اپنا آشیانہ بناتا ہے، لیکن اس زمانے کے اہل نظر پر اللہ تعالیٰ یہ بات منکشف کرتا ہے کہ جاہلیت کی چڑیا اس آشیانہ میں چھپی ہوئی ہے، جیسا کہ قصوں میں کہا گیا ہے کہ فلاں جن کی روح اس چڑیا کے اندر چھپی ہے جو سات قلعوں کے اندر ہے، پھر ان قلعوں کے بعد ایک آشیانہ ہے، اور اس آشیانہ میں ایک چڑیا ہے، اس کے اندر جن کی روح چھپی ہوئی ہے، اس طرح جاہلیت کبھی کبھی کسی چیز کو اپنا ہدف اور نشانہ بنالیتی ہے اور اس میں چھپ جاتی ہے، اور ابتلائے عام ہوتا ہے کہ لوگ اس کے شکار میں آجاتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں کوئی ایسا درخت تھا جس سے لوگوں کے عقائد خراب ہو رہے تھے اور وہ شرک کا مظہر بن گیا تھا، حضرت عمرؓ نے اس کو کٹوا دیا۔ یہاں تک کہ دل پر پتھر رکھ کر بیعت رضوان کے درخت کو کٹوا دیا اور توحید کا یہی تقاضا سمجھا، اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ طائف کا وہ بت جسے لوگ گرانے سے ڈر رہے تھے اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو گرانے کے لیے بھیجا، اور کہا کہ مجھے اس کے گرانے کی بشارت دینا، چنانچہ انہوں نے ایسا کیا۔

اسی طرح ہر زمانے میں کچھ بت ہوا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جن سے کام لینا چاہتا ہے ان کی نگاہیں کھول دیتا ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے زمانہ میں وحدۃ الوجود کی شکل اختیار کر لی تھی، ''ہمہ اوست'' کی جو آخری شکل ہو سکتی ہے، حضرت مجدد صاحبؒ نے اس کو ہدف بنایا اور اس کو کمزور کر کے دم لیا، اس وقت سے وہ اپنی طاقت کھو چکا ہے، بدعات حسنہ کا ایک فتنہ تھا، جس چیز کو چاہا کہہ دیا کہ یہ بدعتِ حسنہ ہے، اور یہ کہ صاحب! بدعت کی دو قسمیں ہیں: (۱) بدعتِ سیئہ (۲) بدعتِ حسنہ، حضرت مجدد صاحبؒ نے کہا کہ جب اللہ کے رسول نے کہہ دیا کہ ''کل بدعة ضلالة'' تم کون ہوتے ہو کہ یہ کہو: 'بعض البدعة حسنة، و بعض البدعة سيئة'، انہوں نے کہا کہ مجھے صاف نظر آتا ہے کہ بدعت دافع سنت ہے، بدعت آتی ہے تو اپنی جگہ بنالیتی ہے، اور سنت کی جگہ لے لیتی ہے۔

اسی طرح سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا دور آیا تو انہوں نے، اور حضرت سید صاحب کا دور آیا تو انہوں نے بھی دیکھا کہ ان ان بدعتوں میں شرک پناہ لے رہا ہے، اور ان ان جگہوں سے لوگوں کے عقائد خراب ہو رہے ہیں، وہ جاہلیت میں مبتلا ہو رہے ہیں، اور فوراً ان پر

پوری ضرب لگائی، ایک عام بات تو یہ دیکھی گئی کہ بہار اور کلکتہ میں جگہ جگہ امام باڑے گرائے جاتے تھے، اور اسی کا پلاؤ کھلایا جاتا تھا، ان حضرات نے تعزیے کی پھپچیوں سے کمر بند ڈالنے والی لکڑی کا کام لیا، کوئی پوچھے کہ صاحب! ان باتوں سے کیا فائدہ؟ فائدہ یہ کہ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ اس وقت اشارۂ الٰہی کیا ہے، اور اس وقت کا فتنہ کیا ہے؟

پھر ایک وقت وہ آیا جب معقولی علماء اور اطرافِ لکھنؤ کے بعض فقہاء نے کہا کہ حج کے بارے میں قرآن میں ہے: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ [۱]، شرط یہ ہے کہ راستہ کا امن ہو، امن نہیں ہے، کیوں کہ بادبانی جہاز میں سمندر کا سفر ہے، اور ان پر پرتگیزی حملہ کرتے ہیں، اس لیے اب ہندوستانی مسلمانوں کے ذمہ سے حج ساقط ہو گیا، اس فتنہ نے اتنا طول کھینچا کہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے پاس لکھنؤ کی سرائے سے مفتی فیض الدین صاحب نے خط بھیجا، اور میں نے اس کا جواب پڑھا ہے، کہ صاحب! یہاں دو آدمی آئے ہوئے ہیں، ایک کا نام مولانا عبد الحی صاحب بڑھانوی ہے اور دوسرے کا نام مولوی اسماعیل دہلوی ہے، یہ لوگ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ حج کی فرضیت اسی طرح قائم ہے، اور ہم کیا کریں؟ یہ لوگ کس پائے کے ہیں؟ حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے بڑے جوش میں آ کر تحریر کیا ہے کہ مولوی عبد الحی تو شیخ الاسلام ہیں، اور مولوی اسماعیل صاحب حجۃ الاسلام ہیں، اور ان دونوں کو مجھ سے کسی چیز میں کم نہ سمجھو، اور فقہ و حدیث میں یہ لوگ بالکل میرے مساوی درجہ کے ہیں، اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا مجھ پر جو احسان ہے، اس کا میں شکر ادا نہیں کر سکتا، اور یہ لوگ جو کچھ کہیں تم اس کو اختیار کرو اور وہی شریعت کا حکم ہے۔

پھر سید صاحبؒ نے اعلان فرمایا کہ ہم حج کو جاتے ہیں، جس کا جی چاہے چلے، خرچ کے ہم ذمہ دار ہیں، لیکن محنت بھی کرنی پڑے گی، پیسہ جب ختم ہو جائے گا تو ہم مزدوری کریں گے، لیکن حج کو ضرور جائیں گے، چاہے کتنے سال لگ جائیں، تو سات سو کے قریب آدمی جمع ہوئے، حضرت سید صاحبؒ نے شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبد الحی صاحبؒ کو خط لکھوائے، سہارنپور وغیرہ سب جگہ خط لکھوائے، اور مولانا عبد الحی صاحبؒ کی اہلیہ آئیں، شاہ اسماعیل

(۱) سورة آل عمران: ۹۷

شہید کے بھی اعزہ آئے ،اور حالت یہ کہ اس وقت صرف چند روپے موجود ہیں، ہمارے گھر کے سامنے جوندی بہتی ہے، جب اس کو پار کیا تو پوچھا کتنے پیسے ہیں؟ کہا: سات روپیہ، کہا: اچھا یہ بھائی جو پہنچانے آئے ہیں ان کو دے کر رخصت کردو، پھر اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی ہے، تو بھائی، اگر معتبر ذرائع نہ ہوں اور تواتر کے ساتھ وہ بات نہ پائی گئی ہوتی تو آدمی کا یقین کرنا مشکل، بعض بعض شہر تو ایسے تھے کہ وہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہاں کوئی مسلمان بیعت سے خالی نہیں، یہاں تک کہ اسپتال کے مریضوں تک نے کہلوایا کہ ہم تو محروم رہے، یہاں تشریف لائیے اور ہمیں بیعت و توبہ کرائیے، اور کھانے کی حالت یہ تھی کہ الہ آباد میں اتنا کھانا بچتا تھا اور گنگا میں اس قدر کھانا ڈالا جاتا تھا کہ وہاں برہمن جو نہانے جاتے تھے، ان کے نہانے کا مسئلہ پیش آ گیا کہ نہائیں کیسے؟ سارا کنارہ سرخ ہو گیا اور تیل اور گھی بہتا ہوا نظر آتا تھا، انہوں نے اس وقت حج کیا، کہیں مزدوری کی ضرورت پیش نہ آئی، انہوں نے اس وقت انتخاب کیا کہ اگر اس میں تساہل برتا گیا، تو حج میں روز بروز سستی نظر آنا شروع ہو جائے گی اور حج کا فریضہ بالکل معطل ہو کے رہ جائے گا، انہوں نے اس کی فرضیت کا فتویٰ دیا، اعلان کر دیا، گیارہ جہاز کلکتہ سے کرایہ کیے اور یہ سات سو آدمیوں کا قافلہ وہاں سے گیا اور حج کر کے آیا، ہمارے علم میں اجتماعی طور پر جب سے اسلام آیا اتنا بڑا حج نہ کسی بادشاہ نے کیا تھا اور نہ کسی شیخ طریقت نے اور نہ کسی عالم دین نے، اور کلکتہ میں یہ حال ہوا کہ شراب خانے جو تھے ان کی بکری بند ہو گئی، انہوں نے شکایت کی کہ ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے مسلمانوں نے شراب پینی چھوڑ دی ہے، ہم رات تک تکتے رہتے ہیں، کوئی بھول کر نہیں آتا۔

نکاحِ بیوگان

پھر ایک وقت آیا کہ سید صاحبؒ نے محسوس کیا کہ ایک بڑی کمزوری پیدا ہو گئی ہے کہ ابھی ۲۵ برس کی عمر میں، ۳۰ برس کی عمر میں عورت بیوہ ہو گئی، اور اب وہ پوری عمر اسی طرح گزار دے گی، سید صاحبؒ نے بیوہ کی شادی پر ابھارا، مجھے ان کے نام معلوم ہیں جنہوں نے عقدِ ثانی کی ہمت کی، ہندوستان چھوڑ کر چلا جانا پڑا، حجاز ہجرت کر گئے، شریفوں کے

خاندان کے، علماء کے خاندان کے، سید صاحبؒ نے خود کہا کہ مجھے کوئی ضرورت نہیں، لیکن میں اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کرتا ہوں، مولانا عبدالحی بڑھانوی صاحبؒ نے مسجد میں وعظ کیا اور کہا کہ سید صاحب کے ذریعہ ساری سنتیں زندہ ہو رہی ہیں، صرف ایک سنت رہ گئی ہے، سید صاحب ایسے جھک کر بیٹھ گئے، کہنے لگے کہ آپ فرمائیے، میں ابھی شروع کرتا ہوں، اور باہر نکلے اور گھر میں جا کر اسی وقت کہا، اور نکاح کیا اور اس کے بعد خطوط لکھے، اور اس کے بعد یہ سنت زندہ ہوگئی۔

یہ سنت اس وقت بھی زندہ نہیں ہے، لیکن الحمدللہ مردہ بھی نہیں ہے، اور اب عار کی بات نہیں سمجھی جاتی، جیسا کہ پہلے سمجھی جاتی تھی، ایسے میں جب ایک بڑے عالم مدراس گئے، تو معلوم ہوا کہ یہاں کے مسلمان (بھائی صاحب یہاں میں کوئی سیاسی بات نہیں کہہ رہا ہوں، محض ایک تاریخی واقعہ سنا رہا ہوں، کوئی صاحب کوئی اور بات ملحوظ نہ رکھیں) گائے کا گوشت کھانے سے بہت بچتے ہیں کہ گوشت کھانے سے فلاں دیوتا (اس کا نام مجھے یاد نہیں) ناراض ہو جائے گا، اور اس کی وجہ سے گھر میں کوئی موت ہو جائے گی، بے برکتی ہوگی، کوئی مسلمان گائے کے گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا، جو لوگ آپ کے وعظ سنتے تھے، ان کے مواعظ سے متاثر تھے، اور ان کے ہاتھ پر بیعت تھے، سب کو دعوت دی اور گائے کے کباب پکوائے، اور کہا کہ اس کو کھانا ہوگا، کھا کر دیکھو، کچھ ہوتا ہے کہ نہیں، اب کوئی عالم کہے کہ صاحب کیا تکلیف مالا یطاق ہے، یہ فلاں گوشت کھایا جائے، فلاں گوشت نہ کھلایا جائے، یہ کہاں ہے، فقہ کی کس کتاب میں ہے؟ لیکن جو صاحب بصیرت ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہاں اسے تم حرام کرنے والے کون؟ اسلام اس وقت تک قائم نہیں ہوتا جب تک پوری شریعت اور مکمل اسلام پر عمل نہ ہو: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (۱) جس چیز کو اللہ نے جائز کیا، اسے تم حرام کرنے والے کون؟ ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ (۲) بنی اسرائیل نے اپنے اوپر اونٹ کا گوشت حرام کیا، تو اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر حرام ہی کر دیا، میں خود مدراس سے ہو کر آرہا ہوں، کہیں نہیں سنا کہ لوگ گائے کا گوشت کھانے سے ڈرتے ہیں، دل سے وہ

(۱) سورة البقرة:۲۰۸　(۲) سورة التحريم:۱

خوف نکل گیا، وہ خوف نہیں تھا، شرک جلی تھا، شرک جلی کو ختم کیا۔

وقت کا جہاد

میرے عزیزو اور دوستو! حدیث شریف میں آتا ہے کہ "یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ، وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." (۱) تجربہ کے طور پر عام سامعین کے لیے بتاتا ہوں کہ اس علم کے حامل ہر زمانہ کے عادل لوگ ہوں گے، مقبول و متوازن لوگ ہوں گے، عدل کا لفظ قرآن و حدیث کی زبان میں بہت جامع لفظ ہے، صرف انصاف کے معنی میں نہیں، اس کے حامل ہوں گے ہر زمانہ کے عدول جو اس سے دور کریں گے غلو پسند لوگوں کی تحریف کو، اور باطل پرستوں کی غلط نیت کو اور دعووں کو، اور جاہلوں کی تاویلات کو، ہر زمانہ کے علماء کا فرض ہے کہ اپنے زمانے کے ان آشیانوں کو تلاش کریں، ان پناہ گاہوں کو تلاش کریں جہاں جاہلیت اور کفر پناہ لے رہے ہیں، اور اس پر خاص طور پر ضرب لگائیں، یہ وقت کا جہاد ہے، وقت کی تبلیغ ہے، اور انبیاء (علیہم السلام) کی نیابت ہے، مثلاً آپ کو معلوم ہو جائے کہ فلاں درخت مقدس مانا جاتا ہے، اور اس میں کوئی چیز باندھ دی جائے، جیسا کہ ہم نے بعض بعض علاقوں میں سنا ہے کہ لوگ عرضیاں لٹکاتے ہیں، جیسا کہ شیعوں کے یہاں دستور ہے کہ عرضیاں لٹکاتے ہیں، کسی درخت پر یا کسی چیز پر، تو اس زمانہ کے حاملین کا یہ فرض ہوتا ہے کہ صاف صاف اس کی نکیر کریں اور صاف صاف عوام کو اس سے آگاہ کریں، جیسے سید سالار مسعود غازی کے جھنڈے، اور کہیں کچھ ہوتا ہے، کہیں کچھ ہوتا ہے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب "تقویۃ الایمان"

ہم جس سے منسوب ہیں، مجدد الف ثانیؒ سے لے کر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور پھر

---

(۱) أخرجه البيهقي في المدخل إلى السنن، كما ذكره صاحب مشكاة المصابيح في كتاب العلم، الفصل الثاني، حديث رقم: ۲۴۸

شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل صاحبؒ، ان کا دستور یہی تھا کہ انہوں نے جہاں جہاں دیکھا کہ شرک یہاں پر چھپا ہوا ہے، شرک وہاں سے حملہ کررہا ہے، یا اس نے منفذ بنایا ہے، اس نے گوریا زیرزمین ایک سرنگ بنائی ہے، اور ہمیشہ زیرزمین کی ضرورت نہیں ہوتی، بالائے زمین وہ پل بنادیتا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ چل کر گھروں تک پہنچ جاتا ہے اور شرک جلی میں مبتلا کردیتا ہے، ''کفر بواح'' میں مبتلا کردیتا ہے، شرک کی تو تاویل ہی نہیں ہوسکتی، اس وقت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا کرے) ''تقویۃ الایمان'' لکھی، ''تقویۃ الایمان'' معمولی حالات میں نہیں لکھی، اور اس نے ہلا کر رکھ دیا۔

لوگ تو اب ایسے پیدا ہو گئے ہیں، کہتے ہیں کتاب شاہ صاحبؒ کی ہے ہی نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں شاہ صاحب کی بھی اور مسلک کی بھی اور اپنی جماعت کی بھی خدمت ہے کہ چلو چھٹی ملی، بالکل غلط، تواتر سے ثابت ہے کہ وہ کتاب حضرت شاہ صاحبؒ کی ہے، اور ایک ایک لفظ کے وہ ذمہ دار ہیں، اور وہ تو خیر مصنف ہیں، ہم اس کی ذمہ داری لیتے ہیں، ہمارے یہاں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اتباعِ سنت اور علم میں بڑھ کر کون ہوگا، سب نے ان کو مان لیا، انہوں نے کھل کر حمایت کی ''تقویۃ الایمان'' کی، اور ساری ذمہ داری اپنے اوپر لی، اور کہا کہ ہم اسی مسلک پر ہیں، اس میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے، اور ایک بار اپنی مجلس میں کہا کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دولاکھ (یا کتنے لاکھ بتایا) آدمیوں کے عقائد اس کتاب سے درست ہو گئے اور ان کی اصلاح ہوگئی، اس کے بعد کچھ ہوا ہو کوئی نہیں جانتا، تو حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اسی بصیرت کی بنا پر، اور اس کے لیے بصیرت تو کیا بصارت بھی کافی ہوتی ہے، کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ کیا ہو رہا ہے، مزارات پر کیا ہو رہا ہے، ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے، درگاہوں پر کیا ہو رہا ہے، لوگ کیسے کیسے عقیدے لیے ہوئے بیٹھے ہیں، جو کھلا ہوا شرک ہے، تو ''تقویۃ الایمان'' لکھی، کسی نے کہا کہ بتدریج لکھئے، کہنے لگے کہ میں جہاد میں جا رہا ہوں اور اگر مجھے اطمینان ہوتا کہ میں وہاں سے زندہ بچ کر آؤں گا تو میں اس کو تدریج کے ساتھ بیان کرتا اور اس کو ہلکا کرتا، لیکن مجھ کو اس کا بھروسہ نہیں، اس لیے میں تو سب ایک مرتبہ کہہ دینا چاہتا ہوں، اور لکھ دینا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کتاب

سے جتنا فائدہ پہنچایا، میرے علم میں بہت کم اس طرح کی کتابیں ہیں جن سے اتنا فائدہ پہنچا ہو، یہ آپ لوگ اچھی طرح سمجھیں۔

عزیمت کا کام

اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ کسی طریقہ سے، جس راہ سے شیطان حملہ کرے، عام آبادی پر اور مسلمانوں پر، اور جس میں وہ کامیاب ہو جائے، اور ایسا کامیاب ہو کہ دیندار لوگ بھی اس کے زخم خوردہ ہوں، تو عزیمت کا کام یہ ہے کہ اس زمانہ میں اس کا انتخاب کر کے اس کے خلاف صف آرا ہو، ہمارے بزرگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ صف آرا ہو جاتے تھے، وہ اعلان کے ساتھ میدان میں آتے تھے، اور کہتے تھے کہ تمہیں جو کرنا ہے کرو، ہمیں تو یہ کرنا ہے، ہمیں تو یہ مہم چلانی ہے، اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان چیزوں کو تلاش کریں۔

غلط رسوم ورواج کے خلاف مہم چلانے کی ضرورت

ان چیزوں میں سے ایک چیز تو اس وقت بہت زیادہ عام اور ایسی ہو گئی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ علماء میں نہیں، بلکہ اللہ نے جن کو ذرا بھی توفیق فرمائی، ان کو کم سے کم برأت الذمہ کے لیے، اللہ کے یہاں جواب دہ نہ ہوں، ان کے خلاف کچھ نہ کچھ آواز اٹھانی چاہیے، وہ ہندوستان کا فتنہ ہے، بہار میں وہ خاص نام سے جانی جاتی ہے، اور شاید میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہاں زیادہ ہے، لیکن یہاں بھی بہت ہے، اور وہ ہے جس کو ''تلک'' کہا جاتا ہے، اور بہار کے مسلمان اس کو ''سلامی'' کہتے ہیں۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں، یہ وہ چیز ہے جس میں شیطان نے قلعہ بنایا ہے، شیطان نے اس آشیانے کے اندر انڈے اور بچے دیے ہیں، اور یہ غضب الٰہی کو بھڑکانے والی چیز ہے، ایک شریف گھرانے سے، ایک معصوم بے گناہ عورت کے دل سے اگر آہ نکل گئی کہ یا اللہ! جس مسلک میں اتنے علماء ہوں، اتنے مدارس ہوں، اتنے واعظ ہوں، اتنے مصنف ہوں، اتنے باحمیت مسلمان ہوں، وہاں یا تو ہماری جوانی ختم ہو، ہمارے والد،

ہمارے ماں باپ منہ دکھانے کے قابل نہ ہوں، یا زہر کھا کر مر جائیں، یا ہم گناہ میں مبتلا ہوں، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں، آج وقت کا جہاد یہ ہے کہ سب۔ سے پہلے تو یہ کہ بے تکلفی معاف، پہلے تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر کی شادیاں شاید نہ ہوئی ہوں، اگر بہت چھوٹی عمر میں شادیاں ہو جاتی ہوں، تو میں معافی چاہتا ہوں، لیکن اگر یہ نہیں ہے تو کم از کم ایک تعداد آپ کے یہاں ایسی نکلے گی جو ابھی اس مرحلہ سے گزری نہ ہوگی، پہلے آپ نمونہ قائم کریں، صاف کہہ دیں کہ ہمیں کچھ لینا دینا نہیں، ہم نمونہ قائم کرنا چاہتے ہیں، ہم بالکل سنتِ نبویؐ کے مطابق نکاح کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے خاندان میں (اللہ کے فضل سے ہمارے خاندان کو بہت کچھ ملا تھا) متعدد ایسے واقعات ہیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے نواسے سید محمد عمران ٹونک کی مسجد میں کھڑے ہوئے کہ صاحبو! ذرا ٹھہر جاؤ، محمد یوسف کا، کسی بیٹے یا بھتیجے کا نام لیا، اس کا نکاح ہونے والا ہے، کسی کو خبر نہیں ہے، عزیزوں کو، خود گھر والوں کو خبر نہیں ہے، کوئی جوڑا بھی پہن کر نہیں آیا، خود نکاح پڑھایا ، اس کے بعد رخصتی ہوئی، اور دو چار دس بیس آدمیوں کو ولیمہ کے لیے بلا لیا، بار بار ایسا ہوا ہے، حضرت سید صاحب کی جماعت میں تو ایسے بہت سے واقعات ہیں، حافظ محمد ولی صاحب سے جناب وجیہ الدین صاحب نے کہا کہ آپ کا بھتیجہ اتنا بڑا ہو گیا ہے، آپ کی لڑکی کی بھی کافی عمر ہو گئی ہے، تو شادی ہو جائے، انہوں نے کہا کہ بہت ٹھیک ہے، کہا: کب؟ کہا: اس جمعہ کو ہو جائے، کہا: اعلان ہو جائے؟ کہا: کچھ نہیں، سب کام چپ چاپ ہو گیا۔

دہلی میں سیرت کا جلسہ تھا، کافی مجمع تھا، میں نے تقریر میں مسلمانوں سے کہا: آپ اس امت میں ہیں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (۱) ہم اس قابل نہیں، ہم خاکِ پا کی طرح بھی نہیں، لیکن یقیناً ہم اس نبیؐ کی امت ہیں جن کے وجود گرامی کے ساتھ عذاب نہیں آ سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں آ سکتا جب تک آپؐ اس دنیا میں ہیں، آج آپؐ اس ناسوتی دنیا میں نہیں ہیں، لیکن انؐ کی امت تو ہے، اتنی بڑی تعداد

---

(۱) سورة الأنفال:۳۳

میں جس ملک میں امت موجود ہو، تو اس میں ایسا اندھیر ہورہا ہے، اس میں ایک ماہ میں ایک سو اسّی لڑکیاں دلی میں جلا دی جاتی ہوں، یہ میں نے ''قومی آواز'' میں پڑھا، جو کانگریس کا اخبار ہے، اور یہ سارے ہندستان میں ہورہا ہے، ابھی کل ہی میں نے انگریزی اخبار میں جہاز پر آتے ہوئے پڑھا کہ مہاراشٹر میں کسی کی ماں کو پھانسی دے دی گئی، کسی نوجوان نے اپنے ماں باپ کی مدد سے بیوی کو جلا دیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس کو اسکوٹر نہیں ملا، موٹر نہیں آئی، تم جینے کے قابل نہیں ہو، تم کو مار ڈالیں گے، تم نکل جاؤ، گلا گھونٹ دیں گے، اللہ تعالیٰ کیسے اس کو پسند فرما سکتا ہے؟ اس کے خلاف مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

اور اگر آپ فارغین یہ طے کرلیں کہ ہم اپنے علاقوں میں یہ مہم چلائیں گے، عہد لو، قسمیں لو، حلف لو، قرآن مجید ہاتھ میں دو، جو بھی ذریعہ ہوسکتا ہے مسلمانوں کو متاثر کرنے کا، کہ ہم نہ مانگیں گے، نہ ہم دیں گے، اور کم سے کم نوجوان یہ طے کرلیں کہ ہم اپنے والدین سے کہہ دیں گے کہ اگر آپ کرتے ہیں تو ہمیں قبول نہیں، اور جب تک محفلِ نکاح میں ہم ''قَبِلْتُ'' (قبول کیا) نہ کہیں، نکاح ہی نہیں ہوسکتا، ہمیں قبول نہیں، آپ چاہیں کریں، ہم ایسے نکاح کو قبول نہیں کرتے۔

آپ کے کام کرنے کا میدان

یہ وقت کا فتنہ ہے، ہمارے مدارس اصل میں اسی کو روکنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں، جو ایسی عزیمت والے لوگ پیدا کریں، اور باقی کام چلانے والے، کام چلاؤ آدمی تو سب درسگاہوں میں پیدا ہوں گے، یہ کام ہے کرنے کا، وہ کام نہیں کہ چلے جارہے ہیں باہر جامعات میں، اور وہاں سے پڑھ کر جاتے ہیں افریقہ، یورپ، امریکہ، یہ آپ کا معاشی مسئلہ ہے، یہ معاشی مسئلہ کا حل ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں وہاں کی محترم ترین جامعہ کا رُکن ہوں، میں نے وہاں بھی کہا، یہاں بھی کہا کہ میں کسی بات پر فخر نہیں کرتا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کا رُکن ہوں، یا کشمیر یونیورسٹی سے مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی، لیکن اگر مجھے فخر کرنے کا حق ہے تو الحمد للہ یہ کہ میں شروع سے اس وقت بیس برس ہو گئے، تسلسل کے

ساتھ-الحمدللہ- اس جامعہ کا رکن ہوں، سوائے شیخ عبداللہ بن باز کے کوئی ایسا نہیں ہے جو اس تسلسل کے ساتھ جامعہ کا رکن ہو، تو میں اس کا رکن ہوں۔

میں اپنے طلبہ سے صاف کہتا ہوں اور آج آپ سے اسی طرح خطاب کر رہا ہوں جیسے ندوہ کے طلبہ سے خطاب کرتا ہوں، دیوبند کے طلبہ سے خطاب کرتا ہوں، جامعہ رحمانی کے طلبہ سے خطاب کرتا ہوں، صاف سن لیجیے: آپ کے کام کرنے کا میدان (میں حالات کی رعایت رکھتا ہوں، اگر کوئی اچھا کرتا ہے اور وہ اس پر مطمئن ہے تو میں اس پر تنقید نہیں کرتا) نہ تو نائجیریا میں ہے اور نہ اریٹیریا میں ہے، نہ کہیں فلاں جگہ ہے، وہ معاشی مسئلہ ہے، اور پھر ایسا بھی دیکھا ہے کہ وہاں جانے کے بعد آدمی یہاں کے کام کا نہیں رہتا، وہ اونچے معیار زندگی کا ایسا عادی ہو جاتا ہے، دماغ اتنا اونچا ہو جاتا ہے، اور حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ کہاں یہاں دیہاتوں میں پھرے گا اور کہاں یہاں کا دال چاول کھائے گا؟ تو آپ سے خیر خواہی کے لیے یہ کہتا ہوں، کہ جہاد کا میدان ہندوستان ہے، مسلمانوں ہی سے نہیں، اپنے غیر مسلم بھائیوں سے بھی اس ملعون رسم کو چھڑائیے، تلک کی جو رسم ہے، اس کو ہندوستان میں رہنے نہ دیجیے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی برکتیں کیسے کسی ایسی جگہ پر نازل ہو سکتی ہیں جہاں اتنا بڑا ظلم ہوتا ہو؟ (۱)

---

(۱) دار العلوم احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ کے جلسۂ دستار بندی میں مارچ ۱۹۸۴ء کو کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵/مئی ۱۹۸۴ء)، یہ تقریر علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

طالبان علوم نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں
(حصہ دوم)
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
سید احمد شہید اکیڈمی
دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی
www.abulhasanalinadwi.org